بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of
The University of Jammu & Kashmir
June 1, 1957

RESERVED

... beyond that date

86

86

سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ ہجری

شہید انسانیت

باہتمام

صادق حسین خنداں لکھنوی پرنٹر

سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی

قیمت: [illegible]

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 19086
Date 28-11-60
SRINAGAR

ST/82

ALLAMA IQBAL LIBRARY
19086

ST 01
IM

~~No. 595~~

Husain Commemoration Society,

NADAN MAHAL
~~DINDAYAL~~ ROAD. LUCKNOW.

نادان محل
انجمن یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ [redacted] روڈ لکھنو

Ref. No. 334/43

Dated 21/Oct

جناب والا - سلام علیکم

سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ کی تجویز شدہ کتاب "شہید انسانیت" کا پہلا ایڈیشن بغرض استصواب و دریافت آراء طبع ہوا ہے۔

چونکہ جناب ممتاز اہل قلم میں سے ہیں لہذا یہ کتاب ارسال خدمت ہے۔ براہ مہربانی ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۳ھ کے آخر تک اپنی رائے، انتقادات یا اعتراضات سے مطلع فرمائیے۔ محرم سنہ ۱۳۶۴ھ سے وصول شدہ آراء و انتقادات کی روشنی میں کتاب کی نظر ثانی کا کام شروع ہو جائے گا۔ لہذا اپنی زریں رائے سے اس کے قبل مطلع فرماویں والسلام

علی نقی النقوی

ناظم شعبۂ تصنیف یادگار حسینی نادان محل روڈ لکھنو

297.64
146

~~491~~

فہرست مضامین کتاب "شہید انسانیت"

بسلسلہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ

شمارہ	مضمون	صفحہ
۱	بیان حال	۲
	دیباچہ	
۲	واقعۂ کربلا کا اجمالی خاکہ	۳ — ۱۰
۳	واقعۂ کربلا کے ساتھ تمام عالم انسانیت کا تعلق اور اُس کے اسباب	۱۱ — ۱۴
۴	واقعۂ کربلا کے ساتھ اقوام عالم کی دلچسپی اور اس کے مختلف مظاہرات	۱۵-۲۴
۵	واقعۂ کربلا کی یادگار یعنی عزائے حسین کی قدامت اور مختلف ادوار زمانہ میں اُس کی وسعت	۲۴-۲۵
۶	واقعۂ کربلا پر نظم و نثر تحریر کی کثرت	۲۶-۲۷
۷	واقعۂ کربلا پر ایک مکمل کتاب کی ضرورت	۲۷-۲۸
	آغاز کتاب (حصۂ اول)	
	شہید کربلا کا تعارف اور سیرت زندگی	
۸	(پہلا باب) نسبی خصوصیات، خاندان اور اُس کے شاندار روایات	۲۹-۴۳
۹	(دوسرا باب) ولادت ماحول اور اُس کے اثرات تربیت اور ابتدائی زندگی (سنہ ۴ھ تا سنہ ۱۱ھ)	۴۴-۵۳
۱۰	(تیسرا باب) امام حسین کی زندگی کا دوسرا دور نانا کی وفات کے بعد، باپ کی تربیت اور صحبت، اس زمانہ کے اہم واقعات تجربات، اور نفسانی اثرات (سنہ ۱۱ھ تا سنہ ۴۰ھ)	۵۴-۶۸
۱۱	(چوتھا باب) امام حسین کی زندگی کا تیسرا دور باپ کی وفات کے بعد سے اپنے عزم جہاد تک (سنہ ۴۰ھ تا سنہ ۶۰ھ)	۶۹-۸۲
۱۲	(پانچواں باب) امام حسین کے بلند اخلاق و کمالات اور مختلف اوصاف۔	۸۳-۱۰۴
	حصۂ دوم	
	واقعۂ کربلا کے اسباب و تفصیلات	
	(تمہید)	
۱۳	واقعۂ کربلا اتفاقی اور ہنگامی حادثہ نہ تھا	۱۰۵
۱۴	واقعۂ کربلا کے ابتدائی اسباب کی تلاش	۱۰۶
۱۵	اسلام سے پہلے عرب کی معاشی [illegible]	[illegible]

شمارہ	مضمون	صفحہ
۱۶	پیغمبر اسلام کی بعثت اور اسلام کا اصلاحی پیغام	۱۱۱
۱۷	اسلام نے کونسی تبدیلیاں چاہی تھیں؟ وہ کس طرح عرب کے تمدن سے متصادم تھیں اور اسلام نے اس انقلاب میں کس حد تک کامیابی حاصل کی۔	۱۲۲-۱۱۲
۱۸	ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونیوالے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ اسلام کو اس حیثیت سے کن طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔	۱۲۵-۱۲۳
۱۹	بنی امیہ اور انکی بنی ہاشم سے عداوت	۱۲۸-۱۲۶
۲۰	بنی امیہ کے پیغمبر اسلام سے مقابلے اور ان کے نتائج	۱۳۶-۱۲۹
۲۱	دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوموں کے نفسیات اسلام سے شکست خوردہ جماعت یعنی بنی امیہ اور ان کے ہواخواہوں کی نفسیاتی حیثیت کیا تھی؟	۱۳۹-۱۳۷
۲۲	پیغمبر کی وفات اور بنی امیہ کا اقتدار	۱۴۴-۱۴۰
۲۳	بنی امیہ کی سیاسی روش، اس میں تدریجی حیثیت سے ترقی اور تمدن اسلامی پر اسکا اثر	۱۵۰-۱۴۵
۲۴	پیغمبر اسلام کے بعد اسلامی انقلاب کے محافظ کون لوگ تھے؟ ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علمبرداروں میں کشمکش۔	۱۵۲-۱۵۱
۲۵	کیا خاص وجہ تھی کہ ہر دفعہ آزمائش کے وقت آل رسول کے ساتھی کم نکلے؟ اس کے وجوہ اقتصادی اور سیاسی، نفسیاتی اور نسلی،	۱۵۶-۱۵۳ ۱۵۹-۱۵۸
۲۶	حضرت علیؑ کی وفات اور امام حسنؑ کی صلح اور اُس کے شرائط۔	۱۵۹-۱۵۸
۲۷	امام حسینؑ کا اس مصالحت سے اتفاق اور معاہدہ کی پابندی۔	۱۶۱-۱۶۰
۲۸	بنی امیہ کی سیاسی قوت کا استحکام اور شرائط مصالحت کی خلاف ورزی	۱۷۸-۱۶۲
۲۹	امام حسینؑ کا رویہ اور امیر شام کے نام احتجاجی مکتوب	۱۷۹-۱۷۸
	پہلا باب	
۳۰	یزید کی ولیعہدی اور اسکی تکمیل کے تدابیر	۱۸۹-۱۸۰
۳۱	اس کارروائی پر اصولی بحث	۱۹۱-۱۸۹
۳۲	امام حسینؑ کے ملانے کیلئے معاویہ کی کوششیں اور نتیجہ میں ناکامی	۱۹۴-۱۹۲
	دوسرا باب	
۳۳	معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی	۱۹۶-۱۹۵
۳۴	یزید کے حالات	۲۰۵-۱۹۷
۳۵	امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ اور آپکا انکار	۲۱۲-۲۰۵
۳۶	انکار بیعت پر واقعات کی روشنی میں بحث	۲۲۸-۲۱۲
۳۷	امام حسین کیلئے اپنے مقاصد کے تحفظ کے کتنے راستے تھے اور انمیں بہترین و مفید ترین کون تھا	۲۳۱-۲۲۹
۳۸	امام حسین کا مقصد اور آپکی نظر میں شکست و فتح کا مفہوم	۲۴۰-۲۳۲

نمبر	مضمون	صفحہ
	تیسرا باب	
۳۹	مدینہ سے روانگی اور اسکے اسباب	۲۴۱-۲۴۷
۴۰	مکہ میں پناہ	۲۴۸-۲۵۰
۴۱	کوفہ سے طلب اور اسکی نوعیت پر سیر حاصل بحث	۲۵۱-۲۵۶
۴۲	اب امام کیلئے طریقۂ کار کیا مناسب تھا	۲۵۷-۲۶۱
۴۳	مسلم ابن عقیل کا کوفہ میں ورود و ابتدائی خوشگوار حالات نتیجہ میں مسلم کی شہادت اور اسکے اسباب	۲۶۲-۲۷۳
۴۴	مکہ سے روانگی اور درمیانی منزلوں کے حالات	۲۷۴-۲۹۵
۴۵	پورے سفر کی حکیمانہ اہمیت	۲۹۶-۳۰۴
۴۶	کربلا میں ورود اور زمین کربلا کی جغرافیائی شکل	۳۰۵-۳۰۶
	چوتھا باب	
	دوسری سے دسویں محرم تک	
۴۷	ابن زیاد کو اطلاع اور امام حسین سے جنگ کے لئے فوجوں کی روانگی	۳۰۷-۳۰۹
۴۸	گفتگوئے مصالحت اور اسکی ناکامی	۳۱۰-۳۱۲
۴۹	فوجوں کی کثرت	۳۱۳
۵۰	پانی کی بندش	۳۱۴-۳۱۵
۵۱	امن و صلح کی آخری کوشش اور اسکی ناکامیابی	۳۱۶-۳۱۸
۵۲	امام حسین کے موقف پر ایک سیاسی تبصرہ	۳۱۹-۳۲۱
۵۳	نویں تاریخ کی سہ پہر اور فوج دشمن کا یکایک حملہ ایک شب کی مہلت اور اسکے اسباب	۳۲۲-۳۳۱

نمبر	مضمون	صفحہ
	پانچواں باب	
	دسویں محرم سنہ ۶۱ھ	
۵۴	صبح عاشور	۳۳۲-۳۳۳
۵۵	فوجوں کی ترتیب	۳۳۴-۳۳۵
۵۶	فوج شام کی نوعیت، اہل کوفہ کی ذمہ داری اور اُن کی صفائی	۳۳۶-۳۴۲
۵۷	جماعت حسینی کا عسکری نظام اور ضبط و ترتیب	۳۴۳-۳۴۴
۵۸	اتمام حجت کے مختلف مراحل اور اسکی ضرورت	۳۴۵-۳۵۲
۵۹	حر کی فوج دشمن سے علٰحدگی۔	۳۵۳-۳۶۰
۶۰	آغاز جنگ اور اصحاب حسین کا سکون و اطمینان	۳۶۱-۳۶۳
	اصحاب حسینؑ کے حالات اور جنگ کے واقعات	
۶۱	عبداللہ بن عمیر کلبی	۳۶۴-۳۶۸
۶۲	حر بن یزید ریاحی	۳۶۹-۳۷۱
۶۳	مسلم بن عوسجہ اسدی	۳۷۱-۳۷۵
۶۴	بریر بن خضیر ہمدانی	۳۷۵-۳۷۷
۶۵	منجح بن سہم	۳۷۷
۶۶	عمرو بن خالد	۳۷۸
۶۷	سعد مولیٰ عمرو بن خالد	۳۷۹
۶۸	مجمع بن عبداللہ	"
۶۹	عائذ بن مجمع	۳۸۰
۷۰	جنادہ بن حارث سلمانی	"
۷۱	جندب بن حجیر کندی	۳۸۱
۷۲	حملۂ اولیٰ	۳۸۱-۳۸۴

نمبر	مضمون	صفحہ
۷۳	ادہم بن امیہ عبدی بصری	۳۸۴
۷۴	امیہ بن سعد طائی	۳۸۵
۷۵	جابر بن حجاج تیمی	〃
۷۶	جبلہ بن علی شیبانی	〃
۷۷	جنادہ بن کعب انصاری	۳۸۶
۷۸	جوین بن مالک	〃
۷۹	حارث بن امراء القیس کندی	〃
۸۰	حارث بن نبہان	۳۸۷
۸۱	حباب بن حارث	〃
۸۲	حباب بن عامر تیمی	〃
۸۳	حبشہ بن قیس نہمی	〃
۸۴	حجاج بن زید سعدی	۳۸۸
۸۵	حلاس بن عمرو ازدی	〃
۸۶	حنظلہ بن عمرو شیبانی	〃
۸۷	زاہر بن عمرو کندی	۳۸۹
۸۸	زہیر بن بشر خثعمی	〃
۸۹	زہیر بن سلیم ازدی	〃
۹۰	سالم مولیٰ عامر بن مسلم عبدی	〃
۹۱	سلیم	۳۹۰
۹۲	سوار بن ابی عمیر نہمی	〃
۹۳	سیف بن مالک عبدی	〃
۹۴	شبیب بن عبداللہ	〃
۹۵	شبیب بن عبداللہ نہشلی	۳۹۱
۹۶	ضرغامہ بن مالک تغلبی	〃
۹۷	عامر بن مسلم عبدی	〃
۹۸	عباد بن مہاجر جہنی	〃
۹۹	عبدالرحمٰن بن عبد رب انصاری	۳۹۲
۱۰۰	عبدالرحمٰن بن عبداللہ ارحبی	〃
۱۰۱	عبدالرحمٰن بن مسعود	۳۹۳
۱۰۲	عبداللہ بن بشر خثعمی	〃
۱۰۳	عبداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی	〃
۱۰۴	عبیداللہ بن یزید بن ثبیط	۳۹۴
۱۰۵	عقبہ بن صلت جہنی	〃
۱۰۶	عمار بن ابی سلامہ دالانی	〃
۱۰۷	عمار بن حسان طائی	〃
۱۰۸	عمرو بن ضبیعہ تیمی	۳۹۵
۱۰۹	عمران بن کعب اشجعی	〃
۱۱۰	قارب مولیٰ الحسینؑ	〃
۱۱۱	قاسط بن زہیر تغلبی	〃
۱۱۲	قاسم بن حبیب ازدی	۳۹۶
۱۱۳	کردوس بن زہیر تغلبی	〃
۱۱۴	کنانہ بن عتیق تغلبی	〃
۱۱۵	مجمع بن زیاد جہنی	〃
۱۱۶	مسعود بن حجاج تیمی	۳۹۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۱۷	مسلم بن کثیر صدفی	۳۹۷	[illegible]	حراق غفاری	
۱۱۸	مقسط بن زہیر تغلبی	"	۱۳۹	حنظلہ بن اسعد شبامی	۴۲۳
۱۱۹	منیع بن زیاد	"	۱۴۰	سیف بن حارث بن سریع و مالک	۴۲۴
۱۲۰	نصر بن ابی نیزر	"		بن عبد بن سریع	
۱۲۱	نعمان بن عمرو ازدی	۳۹۸	۱۴۱	جون غلام ابوذر غفاری	۴۲۵
۱۲۲	نعیم بن عجلان انصاری	"	۱۴۲	غلام ترکی	۴۲۶
۱۲۳	خیمہ گاہ حسینی پر ہجوم	۳۹۹-۴۰۰	۱۴۳	انس بن حارث اسدی	"
۱۲۴	بکر بن حی تیمی	۴۰۱	۱۴۴	حجاج بن مسروق جعفی	۴۲۷
۱۲۵	عمرو بن جنادہ بن کعب	"	۱۴۵	زیاد بن عریب ہمدانی	"
۱۲۶	ظہر کا ہنگام اور نماز ظہر کا ہنگامہ	۴۰۲	۱۴۶	سالم بن عمرو کلبی	"
۱۲۷	حبیب ابن مظاہر اسدی	۴۰۳-۴۰۴	۱۴۷	سعد بن حارث	۴۲۸
۱۲۸	حر کی شہادت	۴۰۸	۱۴۸	عمر بن جندب حضرمی	"
۱۲۹	ابو ثمامہ صائدی	۴۰۹	۱۴۹	قعنب بن عمرو نمری	"
۱۳۰	نماز ظہر	۴۱۰	۱۵۰	یزید بن ثبیط عبدی	۴۲۸-۴۲۹
۱۳۱	سعید بن عبد اللہ حنفی	۴۱۱	۱۵۱	یزید بن زیاد بن مہاصر ابو الشعثاء	۴۲۹-۴۳۰
۱۳۲	زہیر بن قین	۴۱۳-۴۱۵	۱۵۲	یزید بن معقل جعفی	۴۳۰
۱۳۳	سلمان بن مضارب	۴۱۵	۱۵۳	رافع بن عبد اللہ ازدی	۴۳۱
۱۳۴	عمرو بن قرظہ	"	۱۵۴	بشر بن عمرو حضرمی	"
۱۳۵	نافع بن ہلال جملی	۴۱۷-۴۱۹	۱۵۵	سوید بن عمرو خثعمی	"
۱۳۶	شوذب بن عبد اللہ	۴۱۹	۱۵۶	اصحاب حسین کی شخصیت پر تبصرہ اور	۴۳۲ / ۴۳۷
۱۳۷	عابس بن ابی شبیب شاکری	۴۲۰-۴۲۲		واقعہ کربلا میں انکی شرکت کی اہمیت	
۱۳۸	عبد اللہ و عبد الرحمن فرزندان عروہ بن	۴۲۲	۱۵۷	علی اکبر	۴۳۷-۴۴۱

نمبر	مضمون	صفحہ
۱۵۸	عبداللہ بن مسلم	۴۴۱
۱۵۹	محمد بن مسلم	۴۴۲
۱۶۰	جعفر بن عقیل	"
۱۶۱	عبدالرحمان بن عقیل	۴۴۳
۱۶۲	محمد بن ابی سعید بن عقیل	
۱۶۳	محمد بن عبداللہ بن جعفر	"
۱۶۴	عون بن عبداللہ بن جعفر	"
۱۶۵	قاسم بن حسن	۴۴۳/۴۴۴
۱۶۶	ابوبکر بن حسن	۴۴۴
۱۶۷	محمد بن علی	۴۴۵
۱۶۸	عبداللہ بن علی	۴۴۵/۴۴۷
۱۶۹	عثمان بن علی	۴۴۸
۱۷۰	جعفر بن علی	"
۱۷۱	ابوالفضل العباس بن علی	۴۴۸/۴۵۳
۱۷۲	شہدا کی ترتیب پر تبصرہ	۴۵۳/۴۵۴
۱۷۳	طفل شیرخوار	۴۵۷
۱۷۴	جہاد آخر	۴۵۸-۴۵
۱۷۵	عبداللہ بن حسن	۴۶۰
۱۷۶	امام کی شہادت	۴۶۱
	چھٹا باب شہادت کے بعد	
۱۷۷	نہب و غارت	۴۶۲
۱۷۸	کوفہ سے روانگی	۴۶۳

نمبر	مضمون	صفحہ
۱۷۹	دفن شہدا	۴۶۴
۱۸۰	اہل حرم کا کوفہ میں ورود اور وہاں کے حالات	۴۶۵/۴۷۴
۱۸۱	شام کی طرف روانگی اور منازل سفر	۴۷۵-۴۷۷
۱۸۲	دمشق میں ورود اور دربار یزید کے حالات	۴۷۷-۴۸۵
۱۸۳	اہل حرم کی رہائی	۴۸۵-۴۸۶
۱۸۴	سر امام حسینؑ	۴۸۶-۴۸۷
۱۸۵	ان واقعات پر تبصرہ اور اہل حرم کو ساتھ لانے کے اسباب و مصالح	۴۸۷-۴۹۴
	اسیران کربلا کے حالات	
۱۸۶	علی بن حسین زین العابدینؑ	۴۹۵-۴۹۶
۱۸۷	زینب بنت علیؑ	۴۹۷-۵۰۵
۱۸۸	ام کلثوم بنت علیؑ	۵۰۵-۵۰۶
۱۸۹	رقیہ بنت علیؑ	۵۰۶
۱۹۰	لیلیٰ ثقفیہ	۵۰۷
۱۹۱	رباب بنت امراء القیس کندی	"
۱۹۲	فاطمہ بنت الحسین	"
۱۹۳	سکینہ بنت الحسین	"
	واقعہ کربلا سے متعلق خواتین	
۱۹۴	ام المومنین ام سلمہ	۵۰۸
۱۹۵	ام البنین	۵۰۹-۵۱۰
	ساتواں باب حسینؑ شخصیت تاریخ مذہب اور اخلاق و انسانیت کے	

نمبر	مضمون	صفحہ
	نقطہ نظر سے	
۱۹۶	کارنامہ حسینی پر مختصر مگر جامع تبصرہ	۵۱۱-۵۱۴
۱۹۷	امام حسین کے مقولات جن سے آپکے فلسفہ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔	۵۱۵-۵۲۶
۱۹۸	مقاصد جنگ	۵۲۷-۵۲۸
۱۹۹	واقعہ کربلا کے خصوصیات	۵۲۹-۵۳۴
۲۰۰	حسینی شخصیت کی بے نظیر نعمت اور یہ کہ اُن کی ذات تاریخ عالم میں ایک نئے انسانی تصور کا اضافہ کرتی ہے۔	۵۳۴-۵۳۶
۲۰۱	حسینی شخصیت کی ہمہ گیری	۵۳۷
۲۰۲	مذاہب عالم میں حسین کی عظمت (از علامہ ہندی)	۵۳۷-۵۴۲
۲۰۳	عالم انسانیت میں حسین کا درجہ (از بھکشو بودھانند)	۵۴۲-۵۴۵
۲۰۴	حسین بحیثیت انسان کامل (پنڈت چندر کا پرشاد جگیاسو)	۵۴۵-۵۵۲
۲۰۵	حسین کی شخصیت (از خواجہ غلام السیدین صاحب)	۵۵۳-۵۶۴
۲۰۶	حسین اور انقلاب (از جوش ملیح آبادی)	۵۶۴-۵۶۷
۲۰۷	حسین (از سید آل رضا صاحب رضا)	۵۶۷
۲۰۸	شان حسین (از علامہ کیفی چریا کوٹی)	۵۶۸-۵۶۹

حصۂ سوم
واقعۂ کربلا کے نتائج

نمبر	مضمون	صفحہ
۲۰۹	(پہلا باب) فتح اور شکست	۵۷۰-۵۸۲
۲۱۰	(دوسرا باب) مجرموں کی پشیمانی	۵۸۳-۵۸۹
۲۱۱	(تیسرا باب) عالم اسلامی کے تاثرات	۵۹۰-۵۹۲
۲۱۲	(چوتھا باب) آثار انقلاب	۵۹۳-۶۰۱
۲۱۳	(پانچواں باب) جماعت توابین	۶۰۲-۶۰۳
۲۱۴	(چھٹا باب) خون ناحق کا انتقام	۶۰۴-۶۰۸
۲۱۵	(ساتواں باب) اموی حکومت کا انجام	۶۰۹-۶۱۰
۲۱۶	(آٹھواں باب) بنی عباس کی سلطنت	۶۱۱-۶۱۲
۲۱۷	گذشتہ ابواب کا خلاصہ اور فتح و شکست کا آخری نتیجہ	۶۱۳-۶۱۵
۲۱۸	(نواں باب) تبدیل ذہنیت	۶۱۶-۶۲۱
	دسواں باب	
	اخلاقی نتائج	
۲۱۹	تمہید	۶۲۲-۶۲۳
۲۲۰	مذہب اور روحانیت کی طاقت کا مظاہرہ	۶۲۳-۶۲۷
۲۲۱	حقانیت اسلام کی تصدیق اور اشاعت	۶۲۷-۶۳۳
۲۲۲	اخلاقی اور تمدنی تعلیمات	۶۳۳-۶۳۶
۲۲۳	حریت	۶۳۶-۶۳۸
۲۲۴	استقلال	۶۳۹-۶۴۱
۲۲۵	جماعتی تنظیم	۶۴۱-۶۴۷
۲۲۶	جوش عمل	۶۴۷
۲۲۷	عزت نفس	۶۴۸-۶۵۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۲۸	صبر	۶۵۶-۶۵۴		**بعض متفرق تعلیمات**	
۲۲۹	شجاعت	۶۶۱-۶۵۶	۲۳۸	پردہ	۶۹۹-۶۹۶
۲۳۰	ایثار	۶۶۳-۶۶۱	۲۳۹	وصیت	۷۰۱-۷۰۰
۲۳۱	مواسات	۶۶۳	۲۴۰	تلقین صبر	۷۰۲-۷۰۱
۲۳۲	حسن معاشرت	۶۶۷-۶۶۴	۲۴۱	شعائر الٰہیہ کا احترام	۷۰۲
۲۳۳	مساوات	۶۶۹-۶۶۸	۲۴۲	اسلاف کی یاد	۷۰۳
۲۳۴	انسانی ہمدردی	۶۷۰	۲۴۳	خودداری	۷۰۴-۷۰۳
۲۳۵	صاف بیانی	۶۷۶-۶۷۱		**خاتمۂ کتاب**	
۲۳۶	امن پسندی اور رواداری	۶۹۰-۶۷۶	۲۴۴	عالم انسانی کو صلاح عمل اور اتباع اسوۂ حسینی کی دعوت	۷۱۲-۷۰۵
۲۳۷	قربانی	۶۹۵-۶۹۱			

تمام شد

وہ افراد اہل قلم جن کے نتائج قلمی اور دماغی کاوشیں اس کتاب کی تالیف میں شریک ہیں

(ہر ایک نام کے مقابل میں وہ مقدار صفحات یا سطور کی درج ہے جو کسی ایک صاحب قلم کے اس کتاب میں یک جا یا متفرق طور پر درج ہیں)

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۱	گبن (مصنف زوال سلطنت روم)	۲	۰
۲	مسٹر جان پونگ	۲	۰
۳	سوامی شنکر اچاریہ	۲	۰
۴	ریویرینڈ فادر پیلاشس ایس جے پی، ایچ ڈی ڈی سابق پرنسپل سینٹ اکیسویرس کالج بمبئی	۲	۰
۵	ہز ہائنس ناصر الملک آف چترال	۲	۰
۶	کارلائل	۳	۰
۷	ہز ہائنس نواب صاحب خنجرہ	۳	۰
۸	قائداعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ (بمبئی)	۳	۰
۹	خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری (موگا کالج)	۳	۰
۱۰	سر بہرام جی جی جی بھائی (بمبئی)	۴	۰
۱۱	بابو راجندر پرشاد ایم اے۔ ایم، ایل۔ ایل، ایل، ڈی سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس (پٹنہ)	۴	۰
۱۲	دستور کیخسرو مہیار کتوربیشوائے اعظم فرقہ پارسی (بمبئی)	۴	۰
۱۳	مولانا اختر علی صاحب تلہری (شاہجہانپور)	۴	۰
۱۴	ہز اگزالٹیڈ ہائنس محمد عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن	۵	۰
۱۵	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی (دہلی)	۵	۰
۱۶	ہز ہائنس مہاراجہ ہلکر آف اندور	۵	۰
۱۷	مہاتما گاندھی (واردھا)	۶	۰
۱۸	مسٹر براؤن (مصنف تاریخ ادبیات ایران)	۶	۰
۱۹	سر رادھا کرشنن وائس چانسلر ہندو یونیورسٹی بنارس	۶	۰

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۲۰	سر فریڈرک جیمس گولڈ	۶	۰
۲۱	مولانا شبلی نعمانی (مصنف سیرۃ النبی)	۶	۰
۲۲	ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی صدر شعبۂ تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی	۶	۰
۲۳	مسٹر بی، جی کھیر سابق وزیر اعظم (بمبئی)	۷	۰
۲۴	مولانا محمد عبد الحامد صاحب بدایونی	۷	۰
۲۵	مولانا سید آغا مہدی صاحب رضوی (لکھنؤ)	۷	۰
۲۶	کیپٹن ایل، ایچ بنٹ جے، پی	۸	۰
۲۷	جسٹس سر شاہ محمد سلیمان	۸	۰
۲۸	مہاتما شانتی پرکاش صدر شری رام تیرتھ پبلکیشن لیگ لکھنؤ	۸	۰
۲۹	ہز ہائنس مہاراجہ جیواجی راؤ سیندھیا آف گوالیار	۹	۰
۳۰	سکریٹری سید واڑہ حسینی یادگار کمیٹی بلگرام (مصنف حسین بیتی)	۱۱	۰
۳۱	سید ارشاد حسین صاحب اذہر بی، اے۔ ایل، ایل، بی۔ رائے بریلی	۱۱	۰
۳۲	پروفیسر رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری (الہ آباد یونیورسٹی)	۱۲	۰
۳۳	ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (شانتی نکیتن)	۱۴	۰
۳۴	ذاکر حسین صاحب فاروقی بی، اے (بمبئی)	۱۴	۰
۳۵	سید عابد حسین صاحب کھجوی ایڈیٹر مسلم ریویو لکھنؤ (سیوان)	۱۴	۰
۳۶	سید نواب علی صاحب سفیر سنڈیلوی	۱۴	۰
۳۷	آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد (پٹنہ)	۱۵	۰
۳۸	منشی پریم چند ورما	۱۵	۰
۳۹	مسٹر کے، ایل رلیا رام (لاہور)	۱۵	۰
۴۰	نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر امیر پائگاہ حیدر آباد دکن	۱۶	۰
۴۱	ڈاکٹر سوکمار بنرجی (لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۷	۰
۴۲	سید مصور حسین صاحب نجم امروہوی	۱۷	۰
۴۳	پنڈت جواہر لال نہرو سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس	۱۸	۰

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۴۴	آغا طاہر صاحب نبیرۂ آزاد دہلوی	19	-
۴۵	مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری پرنسپل جوادیہ کالج بنارس	19	-
۴۶	سید آل رضا صاحب رضا ایڈوکیٹ لکھنؤ	19	-
۴۷	علامہ کیفی چریاکوٹی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)	۲۰	-
۴۸	سید سبط محمد صاحب نقوی	۰	۱
۴۹	مسز سروجنی نائیڈو (حیدر آباد دکن)	۳	۱
۵۰	ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد سابق دستور اعظم حیدر آباد دکن	۶	۱
۵۱	مسٹر سی، ایس رنگا ایر سابق ایم، ایل، اے سنٹرل مدراس	۷	۱
۵۲	مولانا سید مبارک علی صاحب عالم (آگرہ)	۸	۱
۵۳	پنڈت برج ناتھ صاحب شرغا ایڈوکیٹ (لکھنؤ)	۱۳	۱
۵۴	مولانا سید ابن حسن صاحب رضوی جارچوی ایم، اے۔ ایم، او، ایل لکھنؤ	۱۵	۱
۵۵	مولانا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس	۱۶	۱
۵۶	سید خورشید حسین صاحب نقوی (کانپور)	۶	۲
۵۷	سید احتشام حسین صاحب رضوی ماہلی ایم، اے (لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۰	۲
۵۸	علامہ سید محسن امین عاملی (مصنف اعیان الشیعہ) (دمشق)	۱۷	۲
۵۹	بھدنت بودھانند مہاستھویر (لکھنؤ)	۱۸	۲
۶۰	سید غضنفر علی صاحب زیدی (مصنف دور استبداد)	۲۰	۲
۶۱	سید ریاض علی صاحب ریاض بنارسی (مصنف شہید اعظم)	۲۲	۲
۶۲	شاعر انقلاب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	۱	۳
۶۳	مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی (مراد آباد)	۲	۳
۶۴	مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدر آباد دکن)	۸	۳
۶۵	سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم، اے (صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی)	۱۷	۳
۶۶	مرزا محمد عسکری صاحب بی، اے (لکھنؤ)	۱۸	۳
۶۷	علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی (مصنف نہضۃ الحسین) بغداد	۱۸	۳

شمارہ	نام	تعداد سطور	تعداد صفحات
۶۸	مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی (سرپرست رسالہ البرہان لدھیانہ)	۱۲	۴
۶۹	نواب الحاج سید محمد عباس صاحب طالب صفوی اخباری (شمس آباد)	۱۲	۴
۷۰	سید کلب مصطفےٰ صاحب بی، اے۔ ایل، ایل، بی (لکھنؤ)	۱۴	۴
۷۱	مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری دکتور جامعہ ازہر مصر (ناظمیہ کالج لکھنؤ)	۰	۶
۷۲	مولانا محمد نعمت امام صاحب پھلواروی	۱۶	۶
۷۳	پنڈت چندرکا پرشاد جگیاسو (لکھنؤ)	۹	۷
۷۴	محمد صادق حسین صاحب بی، اے (علیگ) ہردوئی	۲	۸
۷۵	علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء (نجف اشرف)	۱۶	۸
۷۶	مولانا سبط الحسن صاحب ہنسوی (لکھنؤ)	۱۲	۱۱
۷۷	خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر	۸	۱۳
۷۸	سید اشفاق حسین صاحب ایم، اے بارایٹ لا (سیتاپور)	۲۲	۱۳
۷۹	ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی	۱۱	۱۷
۸۰	علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب (لکھنؤ)	۴	۱۹
۸۱	خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب (مصنف ناموس اسلام) پٹیالہ	۷	۱۹
۸۲	سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایم، اے ایڈوکیٹ (پٹنہ)	۱۸	۲۰
۸۳	مرتب و مولف کتاب ناظم ادارہ یادگار حسینی علی نقی النقوی (لکھنؤ)	۰	۴۷۸

سوائے ناظم ادارہ کے ہر ایک شخص کا مقولہ یا مضمون جہاں سے شروع ہوا ہے نشان ع بنا کر فٹ نوٹ میں یا عبارت کے قبل اصل کتاب ہی میں اُس شخص کا نام درج ہے اور جتنی عبارت دوطرفہ واوین (" ") کے درمیان ہے وہ اسی شخص کی ہے جو اجزا اس طرح کے نشان اور واوین کے باہر ہیں انھیں ناظم ادارہ کے قلم کا سمجھنا چاہیئے۔ والسلام

علی نقی النقوی

ناظم مرکزی و ناظم شعبہ تصنیف یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

کتاب تجویز شدہ متعلق یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

تہذیب انسانیت

(مرتبہ)

ادارۂ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ
یادگار حسینی لکھنؤ

مخصوص اڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور
منتخب اہل قلم کے لئے

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

بیانِ حال

یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ ہجری کے سلسلہ میں واقعہ کربلا کے اسباب، حالات، اور نتائج کے متعلق جس کتاب کا اعلان ہوا ہی اُس کی ترتیب و تدوین کیلئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی مگر عملی صورت سے یہ صورت غیر ممکن ثابت ہوئی کہ تمام ارکان مجتمع ہوکر اس کی ترتیب میں حصہ لیں اس لیے تمام مضامین اور عناوین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادارہ کی جانب سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہی۔ اور اب اس کو طبع کراکر تمام ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور منتخب اہل قلم کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ ان حضرات سے گزارش ہی کہ اس کتاب کے تمام اجزا کا نظر غائر سے مطالعہ فرمائیں۔ اور جس مقام پر اضافہ کی ضرورت ہو یا کمی لازم ہو یا ترتیب کا بدلنا مناسب معلوم ہو۔ وہاں اپنا نوٹ تحریر فرمادیں اور اس کتاب کے اُن کے پاس پہونچنے کے بعد ایک ماہ کے اندر اپنی زریں رائے سے ادارہ کو مستفید فرمائیں تاکہ اُن کے آرا اور قیمتی مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کی آخری تدوین و ترتیب کا کام انجام پائے اور پھر اس کتاب کی وسیع اشاعت کی جائے۔ والسلام

ناظم شعبۂ تصنیف یادگار حسینی سنہ ۱۳۶۱ھ

۲ رجب سنہ ۱۳۶۱ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ نستعین

دیباچہ

دنیا میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے "عرب" کا نام نہ سنا ہو۔ "عرب" ایک بڑا صحرائی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر دریائے احمر لہریں مار رہا ہے۔ "عرب" میں قریش کا قبیلہ نسبی شرافت کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھا۔ جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصیٰ بن کلاب نے بڑی عزت اور بلندی حاصل کی۔ قصیٰ کے فرزندوں میں عبد مناف کو کعبہ کی تولیت اور قریش کی ریاست حاصل ہوئی۔ وہی کعبہ جس کے پاس آج تمام دنیا کے مسلمان "حج" کے لیے جاتے ہیں۔ یہ اسلام سے مدتوں پہلے بھی عرب کا سب سے بڑا عبادت خانہ اور مذہبیت اور تقدس کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کی تولیت اور مجاوری ایک بہت بڑا منصب تھا جو اس خاندان سے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ سخاوت، کرم، خدمتِ خلق اور انسانیت کے تمام اچھے اخلاق و اوصاف میں یہ لوگ نمایاں درجہ رکھتے تھے۔

عبد مناف کے فرزندوں میں ہاشم بڑے صاحبِ صولت اور با اثر تھے اگرچہ اُن کے بھائیوں میں عبد الشمس کا بھی شمار تھا مگر اپنے باپ کے اوصاف و مراتب کی پوری شان ہاشم ہی میں نظر آتی تھی اس لیے وہ تمام امتیازات جو عبد مناف کو حاصل تھے وہ اُن کے بعد ہاشم کے لیے تسلیم کیے گئے۔

اُمیّہ جو اپنے کو عبد الشمس کا بیٹا کہتا تھا اُس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا اور کوشش کی کہ عزت اور سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اتار لے مگر نتیجہ میں ناکامی اور رسوائی ہوئی

مخالفت کی آگ کے شعلے حسرت اور بے چارگی کے ساتھ وقتی طور پر بیٹھ گئے مگر دل میں حسد اور عداوت کی چنگاریاں سُلگنے کے لیے رہ گئیں۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے اختلافات کی ابتدا یہیں سے ہے

ہاشم کے بعد اُن کے بیٹے عبدالمطلب خانۂ کعبہ کے مجاور ہوئے اور اس خدمت سے عظمت حاصل کرنے کے علاوہ اپنے بلند انسانی اوصاف کی بدولت عام ہر دلعزیزی حاصل کی۔

عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے جن میں سے ایک عبداللہ اور ایک ابو طالب تھے۔

عبداللہ کے فرزند حضرت محمدؐ وہ عظیم المرتبت انسان ہوئے جس نے کلمۂ توحید اور دین اسلام کا پیغام پہونچایا اور اپنی پیغمبری کا اعلان کر کے بت پرستی کی مخالفت کی۔

ابو طالب کے فرزند علیؑ تھے جنھوں نے اس آواز پر لبیک کہی اور دست و بازو بن کر اسلام کی اشاعت میں حضرت محمدؐ کا ساتھ دیا۔

اس موقع پر بنی امیہ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر کہیں لوگوں نے حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول اور اُن کے دین کو مذہب حق تسلیم کر لیا تو بنی ہاشم کے مذہبی اقتدار کے سامنے ہمارا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو جائے گا۔ اگرچہ حضرت محمدؐ کی تعلیم براہ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی اور فرائض انسانی کی بجا آوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے تھے اور اس طرح اُن کے اقتدار کو سخت صدمہ پہونچتا تھا چنانچہ امیہ کے پوتے ابوسفیان نے محمدی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عرب کے راسخ العقیدہ بُت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمدؐ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے۔ پہلے تو آپ مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے مگر جب اُن لوگوں نے ایکا کر کے آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوراً آپ اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں جا بسے جہاں کے لوگوں نے آپ کی تعلیم کو قبول کیا تھا اور آپ کی امداد کا اقرار کیا تھا اسی واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی ہجرت کے واقعہ سے مسلمانوں میں سنہ ہجری کا حساب کیا جاتا ہے جس کو اب کی اپریل سنہ ۱۹۴۲ء میں تیرہ سو اکسٹھ (۱۳۶۱) برس ہوئے ہیں۔

دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کر کے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر و احد اور احزاب

بہت مشہور لڑائیاں ہیں ان میں مخالف جماعت کا سرگروہ وہی ابوسفیان تھا جو حرب بن امیہ کا بیٹا تھا مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمدؐ کے پیرووں کی تعداد اور اُن کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اُنھوں نے بھی قبول اسلام کی نقاب ڈال لی اور وہ موقع کے منتظر رہنے لگے کہ کب اسلام کی طاقت ذرا کمزور ہو اور کب اُنھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمدؐ کی زندگی میں اُن کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت کی وفات ہوگئی۔ اس بڑے حادثہ نے مسلمانوں کے نظام میں بہت ابتری پیدا کی۔ بہت سے لوگ مختلف اطراف میں جو اس موقع کے منتظر تھے اُنھوں نے سر اونچا کیا اور اسلام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا کچھ آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینا بند کردی مسلمان ان شورشوں کے دبانے میں لگ گئے اور بہت مشکلوں سے اس میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں روم اور فارس کے بڑے ممالک سے مسلمانوں کو جنگ درپیش ہوگئی۔ یہی پرآشوب اور انقلابی دور وہ تھا جس کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاکر بنی امیہ کو دمشق میں اپنی حکومت قائم کرا لینے کا موقع مل گیا۔ یہ حکومت شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں اس نے خود مختار حکومت کی حیثیت حاصل کرلی

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمدؐ کے رائج کئے ہوئے طریقوں کو اور اسلام کی پھیلائی ہوئی مساوات کو مٹانا شروع کردیا اور آخر میں تو یہ حالت ہوئی کہ احکام اسلام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی اور تختِ حکومت کا وارث دار ابوسفیان کا پوتا یزید بن معاویہ قرار پایا جو بڑا ہی شرابخوار اور بدکردار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔

حضرت محمدؐ کے جانشین اور اُن کی اولاد اس کو برداشت نہیں کرسکتے تھے چنانچہ حضرت علیؑ کا آخری زمانہ اسی گروہ سے مقابلہ میں صرف ہوا تھا۔ حضرت علیؑ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسنؑ نے کچھ شرائط کے ساتھ ان لوگوں سے صلح کی تھی مگر اُن شرائط کی پابندی نہیں کی گئی اور خفیہ طور پر زہر دیکر اُن کی زندگی کا خاتمہ کردیا گیا۔ اب پیغمبر کے خاندان میں پوری ذمہ داری حسینؑ

پر تھی جو حضرت محمدؐ کے دوسرے نواسے اور علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔
ے "یزید نے حکومت کے نشہ میں اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے اسلام کے اصولوں کی مخالفت کھلے خزانوں شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کے "من بھائے اصول" اسلام کے اصول سمجھے جانے لگے اور لوگوں کے دلوں میں خدا کے خوف کے بدلے یزید کا ڈر سما گیا، دنیا یزید کی طرف جھک پڑی۔ اتنی بڑی حکومت کے بعد یزید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دنیا میں مجھے کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ پھر کیا تھا یزید کی نگاہ بغیر کسی خیال کے حسینؑ کی طرف اُٹھ گئی اور یہ مشورے ہونے لگے کہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ یزید کی بیعت کرلیں۔ یزید جانتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اسلام کے وہ اصول جو رسول اسلام نے دین اور دنیا کی کامیابی کے لیے مقرر کئے تھے ان کا حقیقی محافظ رسول کے نواسے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ممکن ہے کہ سچائی کی آواز پر دنیا سمٹ آئے اور اپنا بنایا ہوا گھروندا زمین پر آ رہے۔ اس لیے یزید کو ضرورت ہوئی کہ حسینؑ کو اپنا فرماں بردار بنا لیا جائے تاکہ دنیا یہ سمجھ سکے کہ جب رسول کے نواسے نے یزید کو قابل بیعت سمجھ لیا ہے تو یزید سچائی پر ہے" اس طرح وہ فتح جو حضرت محمدؐ یا اُن کے دین (اسلام) کو بنی امیہ کے خلاف حاصل ہوئی تھی آئینی طور پر شکست میں تبدیل ہو جاتی اور یزید کے بزرگوں کی شکست کا بدلا ہو جاتا۔

حسینؑ ایسے بے نفس انسان تھے کہ اگر صرف شخصی اقتدار کا معاملہ ہوتا تو وہ اس پر تیار ہو جاتے کہ یزید کی سلطنت کو منظور کرلیں مگر وہ یزید کے افعال و اوصاف کو دیکھ رہے تھے جو صاف صاف آئین اسلام سے اعلان جنگ کے مرادف تھے حسینؑ نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یزید حسینؑ کے عزم و ارادہ کی پوری طاقت سے واقف نہ تھا اس لئے اس نے تشدد کے احکام جاری کئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح حسینؑ کا سر جھکوا لیا جائے گا مگر جتنا جتنا یزیدی حکومت کا تشدد بڑھتا گیا اُتنا اُتنا حسینؑ کے صبر و استقلال میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ہر مصیبت کے برداشت

ے حسین بیتی مرتبۂ سید ... حسینی یادگار کمیٹی بلگرام

کرنے پر تیار نظر آئے۔

پہلا ہی حکم جو یزید نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا لکھا یہ تھا کہ "حسینؑ سے بیعت لو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو"۔ حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لئے اور وہ اسے پہلے سے سمجھے ہوئے تھے۔

"بیعت" ان کے لیے غیر ممکن چیز تھی۔ سر کا قلم ہونا بے شک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

حسینؑ نے اس کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام گھر کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور اپنے خاص عزیزوں، بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو اپنے ہمراہ لیا اور مکہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ اپنی مخالف جماعت کو بتلانا چاہتے تھے کہ آپ کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کے خواہاں ہیں۔

مکہ عرب کے بین الاقوامی قانون کے مطابق اور پھر اسلام کے آئین کے موافق ایک امن کا مقام تھا جہاں کسی کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیئے مگر حسینؑ کو یہاں اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا مجبوراً ایسے وقت پر جب تمام عالم اسلامی مکہ کی طرف کھنچا چلا آرہا تھا حسینؑ نے مکہ کو ترک کر دیا۔ یہاں سے نکل کر اب آپ کہاں جاتے؟ ناچار کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو بڑے اصرار کے ساتھ بلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی مسلمؑ کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیج بھی چکے تھے۔ اب آپ خود اسی طرف روانہ ہوئے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی، وہاں سنگدل حاکم عبید اللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مسلم بن عقیل قتل کر دیئے گئے۔ اب آپ کو کوفہ میں کوئی امید باقی نہیں رہی تھی مگر مکہ اور مدینہ جانے کا بھی موقع نہ تھا اُدھر کوفہ سے آپ کے گرفتار کرنے کو فوج بھیجدی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی زمین پر اُتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا تمام راستے بند کر دیئے گئے اور امام حسینؑ کو ان فوجوں میں گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حسینؑ کے ساتھ صرف اُن کے سترہ اٹھارہ عزیز اور وہ خاص دوست تھے جو کوفہ سے

یا بعض دوسرے مقامات سے آپ کے پہونچنے کی خبر سُنکر کسی طرح آپ تک پہونچ گئے تھے اُن کی تعداد دو سو سے بھی کم تھی۔

آپ اپنے وظیفۂ منصبی اور فرض انسانی کی بنا پر امن و امان کے محافظ تھے اس لیے آپ نے یزیدی فوج کے افسر اعلیٰ عمر بن سعد کے سامنے ایسی صورتیں پیش کیں کہ معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپ کا طریقۂ کار اتنا سُلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد اس بات کا قائل ہو گیا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں عمر سعد نے کوفہ کے حاکم ابن زیاد کو اس مضمون کا خط بھی بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اُس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری کا نتیجہ خیال کیا اس لیے اس نے کہا کہ حسینؑ کو یزید کی بیعت کر لینا چاہیئے تب اُن کی جان بچ سکتی ہے یہ وہ بات تھی جب پہلے ہی حسینؑ طے کر چکے تھے کہ ناممکن ہے۔ اُنھیں بیعت کرنا ہوتی تو پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے۔ اب خطرہ کو سامنے دیکھکر وہ اس بیعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسینؑ نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔

آپ کے سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ آپ کے گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ آپ کے عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے آپ کے سامنے تھے اور آپ کے ساتھ پردہ دار عورتیں تھیں اور چھوٹے بچے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بٹھا دیا گیا تھا اور ایک قطرہ پانی کا حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔ چھوٹے بچے پیاس کی شدت سے بیتاب اور مضطرب نظر آ رہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر بادشاہ کو اپنا دینی پیشوا تسلیم کر لیں۔

آپ کا ارادہ پہلے ہی سے مضبوط تھا مگر عملی طور پر جتنے مشکلات بڑھتے جاتے تھے آپ کی ہمت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آپ نے آخری بار پھر قطعی طور پر جواب دیدیا کہ میں بیعت نہیں کرونگا نویں محرم کی شام تھی جب اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ بھی کر دیا مگر آپ نے ایک شب کی مہلت لے لی آپ چاہتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کو آخری بار سوچنے کا موقع دیدیں کہ وہ اگر آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ آپ نے اُن ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتلا دیا کہ کل ہماری

زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہا۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑینگے ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔ ان میں چند ضعیف بڈھے۔ کچھ نوعمر لڑکے اور چند معصوم بچے بھی شامل تھے مگر اس منتخب جماعت میں ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنے کارناموں سے حسینی قربانی کی عظمت اور اثر میں اضافہ نہ کیا ہو۔ جب مہلت کی شب گزر گئی اور امام حسینؑ اپنے ارادہ پر قائم رہے تو یزیدی لشکر جس کی تعداد کم سے کم بیس ہزار بتائی جاتی ہے میدان کربلا میں صف آرا ہو گیا کہ ایک صبر و استقلال کے پہاڑ کو ظلم و جبر کی آندھیوں سے متزلزل کر دے۔ طبل جنگ بجنے لگے۔ امام حسینؑ کا سر لینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے لشکر کا سامنا ہے۔ بھوک پیاس کی شدت سے کسی کے دم میں دم نہیں اپنی اور عزیز ترین ہستیوں کی موت۔ گھر کی تباہی۔ ناموس کی اسیری کے منظر آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مگر امام حسینؑ کی فرض شناسی، اصول پروری، ایثار اور جرأت کا کیا کہنا کہ آپ کی جبینِ استقلال پر اب بھی شکن نہیں۔"

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر تک حسینؑ کے جاں باز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور اُن کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے۔ جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو حسینؑ اور اُن کے عزیزوں کی نوبت تھی۔ اب بہت آسان تھا کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنا سر پیش کر دیں مگر آپ کو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا اب عزیز آپ کے آپ سے جدا ہونے لگے۔ ان میں سے کس کو آپ پہلے موت کے مُنھ میں جانے کی اجازت دیتے۔ ہاں سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھا مرنے کے لیے بھیجدیا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور اُن کا چاند فوج دشمن کی گھٹا میں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہیں آیا وہ اس قربانی کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ انکی اسکیم کا ایک بڑا جزو

ﮦ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم ۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی

پائیہ تکمیل کو پہونچ گیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے اور موت کی نیند سو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانباز بھائی عباسؑ آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ فوج کے علمدار تھے۔ ان کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر آپ کی ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ آپ کے پاس اب کوئی سرمایہ سچائی کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک وہ معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا وہ شیر خوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور اپنے ہاتھوں پر بلند کیا۔ یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر حلیہ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنالیا حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا اب کیا تھا؟ حسینؑ کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ آپ نے اس شکستگی اور بے کسی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنی کسی انسان میں طاقت ہو سکتی ہے اُس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا وہ مقابلہ جو تاریخ عالم میں یادگار ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چور ہو گیا، گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کیا گیا اور نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ پردہ نشین عورتوں کے سروں سے چادریں تک اُتار لی گئیں۔ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ مردوں میں ایک فرزند حسینؑ کے زین العابدین زندہ بچے تھے جو بیماری کے عالم میں تھے اُنھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بیبیاں رسیّوں میں باندھ کر قیدی بنائی گئیں اور اُنھیں دربدر پھرایا گیا۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے مشہور ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محل و نوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم، کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہی اور اس لحاظ سے واقعہ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، بنی ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا ہی مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہی

اُن خصوصیات اور اُن نتائج کے لحاظ سے جو نوع انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو اور اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوع انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرت بشری میں داخل ہے اگر کوئی قصہ آپ کے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اُس واقعہ سے متعلق اشخاص کے ناموں سے یا اُن کی شخصیتوں سے آپ واقف نہوں تب بھی اوّل الذکر سے آپ کو نفرت اور دوسرے کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اس میں کسی مذہب اور خیال کا امتیاز نہیں ہے حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے اُن کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاؑ و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے ہیں، بہت سے بیگناہ افراد مقتول ہوئے ہیں بہت سے لوگوں کا مال و اسباب تاراج ہوا ہے، بہت سے لوگ قید ہوئے ہیں مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جو فرداً فرداً بہت سے اشخاص پر تقسیم تھے وہ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور ان کے اجتماع سے آپ کی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال بن گئی۔

عـ۵ " دنیا میں موجودہ جنگ سے زائد کوئی خونریز جنگ نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مظالم، بیرحمیاں اور ناانصافیاں جس حد تک واقعہ کربلا میں ہوئیں اُن کا عشر عشیر بھی کبھی کسی معرکہ میں نہیں ہوا یہ ہوتا رہا ہے کہ آدمی زائد مارے گئے ہیں۔ یہ دیکھا ہے کہ خون زائد بہا ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ دل و روح کے پاک و عزیز ترین جذبات کے ساتھ ایسی بیرحمی ہو جیسی کہ کربلا میں واقع ہوئی ہے۔ ہٹ دھرمی، بے انصافی، جور و ظلم اور ہر طرح کی سختی جو اس میدان میں مظلوموں کے ساتھ برتی گئی اس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملتی " پھر جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند ہے۔ اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہے اُسی قدر وہ محبت جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہئے وہ بھی ہر دوسرے شخص سے زیادہ ہے اور جو نفرت ہر انسان کو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہے وہ بھی تمام دنیا کے ستمگاروں سے زیادہ ہے۔

عـ۵ علامۂ ہندی

دوسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مظلومیت صرف ایک بے بسی کی طرح کی مظلومیت نہ تھی جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کر دیں اور اُسکے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اُسے قتل کر ڈالیں۔ مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی۔ مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاق کے نقطۂ نظر سے قابل مدح ہو۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپنے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصُول کی حفاظت کے لیے اُن تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہوسکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افراد انسانی کی عزت و احترام کا مرکز ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اُتنی ہی قربانی اہم اور قابل عزت ہوگی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک بےمثال کارنامہ ہے۔ مساوات، سادگی اور حق پرستی کی بنیادیں متزلزل ہورہی تھیں اور طاقت و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا اُس وقت حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچّوں تک کو تلواروں سے ٹکڑے کرا کے جبر و استبداد کو کاری ضرب لگائی اور ثبات و استقلال، ضبط و صبر، ایثار و قربانی، حق پروری اور راست کرداری کا بلند نمونہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں ہیں حسینؑ تمام دنیائے انسانیت کے ہیں اُنھوں نے وہ کام کیا جس نے مٹتے ہوئے انسانیت کے نقوش کو اُبھار دیا جس نے دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا جس نے انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہونچا دیا۔ اُنھوں نے اپنی جان دے کر دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُنھوں نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں زندگی کی حقیقت مضمر ہے، اس لیے تمام اقوام عالم جو قربانی کی عزت کرتے ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرا امر یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محل اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی منزل وہ ہے جہاں تمام

مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر اُن کی عمارت کا قیام ہوا ہے اخلاق انسانی کو نقطۂ ارتقا تک پہونچانا ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں تبدیلی ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ بعض مذاہب کے اصُول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناسمجھی سے کچھ زیادتی یا کمی ہو گئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیب اخلاق اور تکمیل بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اسی نوع کا تھا۔ یقیناً حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور آپ کا اقدام عمل اگر کسی دوسرے مذہب کے افراد کے خلاف ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے کتنی ہی حقانیت آپ کے مشن کی ہوتی اور آپ کو کتنی ہی مظلومیت کے ساتھ قتل کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے خلاف آپ کا اقدام ہوا تھا اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑتے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اس لیے واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی مذہب کے لوگوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اور چونکہ بُرائی اور اچھائی حدود مذہب وملت سے بالاتر ہے۔ ہر مذہب والوں کے نزدیک بُرائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو قدر و منزلت کا حامل سمجھیں گے۔"

عـ۵ "جہاں کہیں گروہ انسانی کے افعال کا محرک فیاضانہ خیال اور شریفانہ جوش ہوگا جہاں کہیں وہ عظیم المرتبت اور پسندیدہ افعال کی تحسین کریںگے جہاں کہیں وہ ایسی تحریکات کی معاونت کریںگے جن کا مقصود انسانوں کو ظلم و جبر، بے انصافی اور خود پرستی کی زنجیروں سے آزاد کرانا ہوگا وہاں حسینؑ کو لوگ قائد اعظم تسلیم کریںگے کیونکہ کسی دوسرے نے ایسی وضاحت کے ساتھ اور اتنے نتیجہ خیز طور پر اس امر کو عمل کر کے نہیں دکھایا کہ انسان حقیقی عظمت اور دائمی حیات اُس وقت حاصل کر لیتا ہے جبکہ وہ کسی اچھے اصُول سے اپنی زندگی کو متحد کر لیتا ہے اور انسانی خدمت میں

عـ۵ خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر

اپنی ذات کو محو کر دیتا ہے ـــــ مسلمانوں کے لیے ناپسند تکبر ہو گا اگر وہ حسینؑ کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیں کیونکہ وہ ان اخلاقی اور روحانی قوتوں کے مظہر ہیں جن کا تعلق اپنے اثر اور وسعت کے لحاظ سے تمام اقوام و مذاہب عالم سے ہے۔ دنیا کی مختلف اقوام میں مخالفت و مغائرت کے بہت کثیر اسباب موجود ہیں جن کا کم کرنا بلکہ دور کرنا صحیح سیاست کا اقتضا ہونا چاہیے۔ اس پسندیدہ کوشش میں ان تمام کامیابیوں کو جو انسانوں کو کسی بڑے معیار تک پہونچنے میں حاصل کی ہوں مستحق تبریک و تمجید سمجھنا چاہیے جس کے ذریعہ سے تمام گروہ انسان ایک خاندان کے آدمی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ یک زبان ہو کر فطرت انسانی کے بلند جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور اس معراج کمال کی طرف صریح اشارہ کرتے ہیں جہاں تک انسان رسائی کی قدرت رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ سب مل کر بلا لحاظ اس امر کے کہ ہم کس قوم و قبیلہ و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں حسینؑ کی قدر و قیمت سمجھیں اور اُن کی عزت کریں۔ کیونکہ اُنھوں نے انسان کو خدا کا مظہر اعلیٰ ثابت کرنے میں فاتحانہ کامیابی حاصل کی۔"

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے اثنا میں مختلف اخلاق و صفات کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لیے ایک دائمی درس عمل رکھتی ہیں اس لیے تمام افراد بشر اُن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُن سے سبق حاصل کر سکتے ہیں ـــ

کارلائل نے لکھا ہے :۔ "بہادرانہ کارنامے محض ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ تمام انسانی برادری کی میراث اور ملکیت ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں سلسلۂ شجاعت و استقامت باقی رہتا ہے۔"

ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگت کا برتاؤ کیا اور اقوام عالم نے یکساں طور پر اسکی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ اُن کی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اُس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرم کے زمانہ میں شرق اور غرب کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محرم کے پہلے دس دن الگ الگ زمین کے حصوں پر گزارے تو وہ دیکھے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے

معیار زندگی اور طرز معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

لہ "عراق عرب، ایران، مصر اور یمن میں عزائے امام کی جو اہمیت ہے اس سے سب ہی واقف ہیں شام میں بھی عزائے حسینؑ جاری ہے۔ ٹرکی میں جس شان کے ساتھ مجلس کا انعقاد ہوتا رہا اور امام مظلوم کا ماتم جاری رہا اس کی شہادت جناب شبلی نعمانی کے سفرنامہ بلاد اسلامیہ سے ملتی ہے۔ حجاز میں صحرا نشین عرب عشرۂ محرم کے زمانہ میں اپنے گریہ و ماتم سے ایک انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ افغانستان میں عزاداری کافی انہماک سے کی جاتی ہے خود کابل میں متعدد امامباڑے ہیں جن میں باقاعدہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ برما، تبت اور بربر کے باشندے عزاداری و ماتم کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں چینی مسلمان بھی محرم میں عاشورا قائم کرتے ہیں اور اس دن عزائے حسینؑ کا ماتم برپا کرتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو قوم بھی امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ گوالیار اندور۔ بڑودہ۔ دھولپور۔ جے پور۔ جودھپور۔ الور۔ دتیا اور بنارس میں حکمرانوں کی طرف سے عزاداری بڑے تزک و احتشام سے کی جاتی ہے۔

یورپ میں خود لندن میں گزشتہ کئی برس سے برابر خبریں آتی ہیں کہ مجلس حسینؑ برپا ہوتی ہے۔ اور تمام سفرائے ممالک و امرائے دولت عزائے امام میں شرکت کرتے ہیں اور ایک سال تو سر عبدالقادر نے اس مجلس میں امام حسینؑ کے تذکرہ سے سامعین کو اشکبار کیا۔"

سلہ "پارسی بھی ایام عزا میں مجالس کرتے ہیں، نذریں مانتے ہیں۔ عزا خانوں میں شمعیں روشن کرتے ہیں اور خوشبو کے لیے بخور سلگاتے ہیں۔ (مجلۂ العرب بمبئی یوم پنجشنبہ ۹ محرم ۱۳۲۰ھ عدد ۱۰)

سکھوں کو عزاداری سے بہت خلوص ہے وہ "گرو حسین کا دیوان" کے نام سے مجالس عزا برپا کرتے ہیں، علاوہ اور تعزیوں کے مہاراجہ شیر سنگھ کا تاریخی بڑا تعزیہ آج تک لاہور میں رکھا جاتا ہے اور اس کا گشت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ لاہور مصنفہ خان بہادر محمد لطیف سی آئی ای)"

لہ سید عابد حسین کھجوی ایڈیٹر مسلم ریویو لکھنؤ

سلہ ہندو قوم اور عزاداری - مولانا سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی

تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر خانہ بدوش صحرائی اور پہاڑ کی رہنے والی غیر متمدن قوموں تک وہ جو حضرت امام حسینؑ کے بزرگوں کا نام نہیں جانتے حسینؑ کے نام سے واقف ہیں اور اُن کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں۔ ۵ "اودھ میں دیہات کی عورتیں ہندو مسلمان جن کو نہ مذہب سے واقفیت ہے، نہ واقعات عالم سے باخبر ہیں۔ ان کی دنیا ان کے گاؤں ہیں، کھیت ہیں اور ان کے جانور ہیں لیکن شب عاشور کو نہایت دردناک لہجہ میں ٹھیٹھ دیہاتی زبان میں وہ ایسے جملے ادا کرتی ہیں جن کو " دہے "، کہتے ہیں جن کا مفہوم انتہائی دردناک ہوتا ہے مثلاً " اے فاطمہ بی بی کے بیٹے تمھارے ساتھ کیسی دغا کی گئی "، تم کو مہمان بلایا اور پانی تک پینے کو نہ دیا۔ ظالموں نے بہن کے سامنے بھائی کو حلال کر دیا اور سر کاٹ لیا۔ اے فاطمہ بی بی کے بیٹے۔ آپ تو اپنے بچے کو پانی پلانے لے گئے تھے، دشمنوں نے اُسے تیر مار دیا۔ کیا جس بچہ کی ماں کا دُودھ خشک ہو جائے اُس کی پیاس تیر سے بجھتی ہے؟" اس قسم کے بکثرت دردناک بیانات ہیں جن کے متعلق یہ پتہ لگانا انتہائی دشوار ہے کہ اُن کا رواج کب سے اور کیونکر ہوا۔ اسی طرح پنجابی اور ملتانی زبان میں بھی واقعات کربلا نہایت مؤثر اور دردناک الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔" یوں ہی پشتو۔ تلگو۔ کشمیری اور دوسری زبانوں میں۔

یورپ کی متمدن دنیا کے مصنفین اور ایشیا کے اہل قلم اور بڑے آدمیوں نے متفقہ طور پر اپنی عقیدت کا خراج حسینؑ کی بارگاہ میں پیش کیا ہے اُن تصانیف میں جو تاریخ اسلام یا تاریخ عالم یا کسی ایسے موضوع پر لکھی ہیں جس کا کسی حیثیت سے واقعۂ کربلا کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوتا ہے، یا اُن تقریروں میں جہاں حسینی کارنامہ کا تذکرہ آیا ہو یا اُن پیغاموں میں جو محرم کے موقع پر نشر کئے گئے ہیں بلکہ ڈاکٹر سر سید سلطان احمد کے لفظوں میں "اس حادثہ پر مؤرخین کا قلم خون کے آنسو رہا ہے"۔

مشہور مؤرخ گبن اپنی تاریخ " زوال سلطنت روم "، میں لکھتا ہے:۔

"بعید ترین زمانوں اور بعید ترین اقلیموں میں بھی حسینؑ کی موت کے اندوہناک مناظر ٹھنڈی سے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی میں بھی ہمدردی کے شعلے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

---

۵ سفیر صاحب سندیلوی

مسٹر براؤن اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" میں لکھتے ہیں کہ:۔
حسینؑ کا قتل، مدینہ کی تاراجی اور مکہ کا محاصرہ ان تینوں تاریخی چیرہ دستیوں میں پہلی چیرہ دستی ایسی تھی جس نے تمام اسلامی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا اور ایک شخص بھی جس کے سینے میں جذبات تھے، اس دردناک کہانی کو سن کر بے چین ہوئے بغیر نہ رہ سکا"
مسٹر جان یونگ چار سو شعر میں حسینؑ مظلوم کا دردناک مرثیہ لکھتے ہیں اور کربلا کا خونیں منظر دکھلا کر آخر میں حسینؑ کی تعریف کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ حسینؑ دیندار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھے۔ حسینؑ سلطنت و حکومت کے لیے نہیں لڑے بلکہ خدا پرستی کے جوش میں" (رسالہ نظام المشائخ دہلی محرم ۱۳۳۵ھ)
مہاتما گاندھی شہادت حسینؑ کی عظیم الشان نوعیت کا اعتراف ۸ اپریل ۱۹۳۴ء میں یوں کرتے ہیں کہ "میں نے کربلا کی المناک داستان اس وقت پڑھی جبکہ میں نوجوان ہی تھا۔ اس نے مجھکو دم بخود اور مسحور کر دیا"
ہز ایکسیلنسی سر کشن پرشاد فرماتے ہیں۔ "نہ فقط دنیائے اسلام بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعۂ روح فرسائے ارض نینوا کے مثل ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہو سکتا ہے۔ واقعۂ کربلا ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے انسان کو تہذیب اخلاق کا پورا پورا میدان ہاتھ آتا ہے۔ مظلوم حسینؑ نے جس استقلال اور مضبوط ارادہ کے ساتھ دنیا میں صداقت اور حق کا علم گاڑا وہ صرف اسی کی ذات سے ہو سکتا تھا جس کو خدا نے ایسا بہادر دل دیا تھا"
سوامی شنکر اچاریہ فرماتے ہیں "میں نے حسینؑ سے بڑھ کر کوئی شہید نہ دیکھا اور حسینؑ کی شہادت کے اثر سے زیادہ کسی شہید کی قربانی کا اثر نہ ہوا"
پریم چند کی رائے ہے "معرکۂ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے"
پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں "کسی کارنمایاں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ اس کا دوسروں پر کتنا اثر مترتب ہوتا ہے، کس قدر وہ انھیں ابھار رہا ہے۔

کس قدر ان کو طاقتور بنا رہا ہے اور کتنی شرافت و تہذیب ان میں پیدا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ لاتعداد نسلیں کربلا کی اس قربانی اور عظیم سانحے سے زبردست طریقہ پر اثر پذیر ہوتی آئی ہیں۔ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قربانی کس قدر لازوال قیمت رکھتی ہے۔"

دوسرے پیغام میں جو آپ نے اسی ۱۳۶۱ھ میں حسین ڈے کمیٹی بمبئی کو بھیجا ہے لکھا ہے "اس شہادت میں ایک عالمگیر پیغام ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ایک ظالم حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اُنھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہماری مادی قوت دشمنوں کی قوت کے مقابلہ میں کم ہے۔ ایمان کی قوت ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت تھی جو ہر مادی قوت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ ہر فرقہ اور قوم کے لیے یہ قربانی شمعِ راہِ ہدایت ہے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ جیواجی راؤ سندھیا آف گوالیار محرم ۱۳۶۱ھ کے پیغام میں فرماتے ہیں "رسول اسلام کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؑ نے ظالم کے مقابلہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، وہ جور و تعدی کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہیں تھے۔ ان میں عقیدہ اور ضمیر کی پختگی تھی۔ اعلیٰ ترین مقاصد اور بلند ترین نصب العین اُن کے سامنے تھے اس لیے اُنھوں نے ایک بڑی اور طاقتور فوج کا دنداں شکن مقابلہ کیا۔ وہ اور ان کے ساتھی اس جنگ میں مارے گئے۔ دشمن کے ظلم و تعدی کا مقابلہ آپ نے خدا کے انصاف پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے اٹل ارادہ، اپنی بلند ہمت اور اس مستحکم عقیدہ سے کیا کہ چاہے اس وقت جو کچھ بھی ہو مگر آخر میں حق اور صداقت ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ تاریخ اسلام کا یہ یادگار واقعہ عقائد کے اختلاف اور نسل، رنگ اور مذہب کے تنگ نظریات سے بالاتر ہے اور اس قابل ہے کہ نسلِ انسانی اس کو اپنے دلوں میں جاگزیں کر لے اور قربانیوں کی پرواہ کئے بغیر ادائے فرض کی اہمیت کو سمجھ لے۔"

ہز ہائی نس نواب صاحب جنجیرہ اس موقع پر اپنے پیغام میں لکھتے ہیں "انسانی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جبکہ اتنے مصائب کے مقابلہ میں حقانیت اور مذہب کی خاطر ایسی پرخلوص قربانی پیش کی گئی ہو۔ بہت سے بلند پایہ مصنفین نے اس بے مثال قربانی کی عظمت اور اس کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے مگر پھر بھی ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

۱۳۶۱ھ کے موقع پر بمبئی کے عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ میں سر بہرام جی جیجی بھائی نے

بحیثیت صدر یوم الحسین کمیٹی تقریر فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ "یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ ایک خالص اسلامی جلسہ کی صدارت ایک ہندو کرے اور اس کا استقبال ایک پارسی کے سپرد کیا جائے مگر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ جلسہ اس مجسمۂ ایثار و قربانی کی یادگار منانے کے لیے منعقد کیا گیا ہے جس نے اپنی بے نظیر قربانی اور ایثار سے دنیائے انسانیت پر زبردست احسان کیا ہے۔"

بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر رادھا کرشنن نے اس جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "امام حسین نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں حق و صداقت کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے ہتھیاروں اور فوجوں کے بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ انھوں نے دنیا کے سامنے ایک بے مثال نظیر پیش کی ہے آج ہم اس بہادر جان فدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے والے عظیم الشان انسان کی یادگار مناتے ہوئے اپنے دلوں میں فخر و مباہات کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسین نے ہمیں بتا دیا ہے کہ حق و صداقت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔"

بمبئی کے سابق وزیر اعظم مسٹر بی جی کھیر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ امام حسین نے ہمیں جو سبق سکھایا ہے وہ ہماری زندگی کے لیے چراغ کا کام دیتا ہے۔ یہ آسان بات ہے کہ حق اور سچائی کے لیے اپنی جان دے دی جائے مگر یہ کام مشکل ہے کہ ہزاروں دشمنوں کے مقابلے میں چند گنے چنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو لے کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل ہوتا ہوا اور گھروں کو لٹتا اور برباد ہوتا ہوا دیکھیں۔ امام حسین نے تیرہ سو سال قبل جو سبق سکھایا تھا وہ سبق آج تک ہم سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امام حسین صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی ہیں اور ہندو و مسلمان ان کے نقش قدم پر چل کر ظلم و ستم کے خلاف سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔"

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حضرت امام حسین نے آج سے تیرہ سو سال قبل دنیا کے سامنے جو پیغام اور اصول پیش کیا تھا وہ اتنا بے نظیر اور مکمل تھا کہ آج ہم اس کی یادگار منا رہے ہیں۔ میرے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں اور نہ دنیا کی کوئی ایسی فصیح و بلیغ زبان ہے کہ جس کے ذریعہ میں ان جذبات عقیدت کو بیان کر سکوں جو اس شہید اعظم

کے لیے میرے دل میں ہیں۔ حضرت امام حسینؑ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ رب العالمین کے سارے بندوں کے لیے ہیں۔ میں مسلمانوں کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ان میں ایک ایسا بلند انسان گزرا ہے جسے دنیا کی ہر قوم یکساں طریقہ سے مانتی ہے اور اُن کی عزت کرتی ہے۔"

آپ نے حسین ڈے کمیٹی بمبئی کے نام اپنے پیغام میں بھی کہا ہے "کربلا کا دردناک سانحہ آج بھی ویسا ہی تازہ، ویسا ہی درد انگیز اور ویسا ہی اثر خیز ہے جیسا کہ اس روز تھا جب اسلام کا یہ بہترین رہبر شہید کیا گیا تھا۔ تیرہ ۱۳۰۰ سو سال کے بعد بھی امام حسین کی مثال حق و حریت کی تلاش رکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے روشنی کا منارہ بنی ہوئی ہے۔ ان کی ذات تمام اختلافات سے بالاتر ہے۔ وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد ہے اور برائیوں کے مقابلہ میں صداقت کی فتح کا لافانی نشان ہے۔"

حیدرآباد دکن کے اجلاس یادگار حسینی کے موقع پر جو پیغام بھیجا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"اکثر جب لوگ مرتے ہیں تو ان کی یاد بھی موسم خزاں میں پتوں کی طرح غائب ہو جاتی اور ختم ہو جاتی ہے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام قسمت انسانی کی ان نادر اور منتخبہ ہستیوں میں سے ہیں جن کے نام افق تاریخ پر ایک روشن ستارہ کی طرح جگمگا رہے ہیں شاید ہی کسی ہستی کو اسلام کے اس ہر دلعزیز رہنما کی طرح ایسی غیر فانی شوکت اور حسن نصیب ہوا ہو، شاید ہی کوئی قصہ اتنا المناک اور دلدوز ہو جتنا کہ قصہ کربلا ہے۔ جو آج تیرہ صدیوں کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو خون کے آنسو رُلانے کی قابلیت رکھتا ہے — تیرہ صدیوں کے بعد بھی اس مقدس شہادت کی عظمت و شوکت ظلم اور باطل کے خلاف کشمکش کی اعلیٰ ترین نشانی ہے اور انسانی آزادی اور حق پرستی کی راہ میں سب سے بڑھی ہوئی انسانی قربانی ہے۔"

ریورینڈ فادر سیلاشس ایس۔ جے پی، ایچ ڈی، ڈی عالم متبحر و سابق پرنسپل سینٹ اکیویرس کالج بمبئی نے لکھا ہے "امام حسین کی قربانی یقیناً تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے جس نے صداقت کو کذب پر فتح حاصل کرنے میں مدد پہونچائی ہے۔"

بابو راجندر پرشاد ایم اے ایم ایل۔ ایل ڈی سابق صدر نیشنل کانگریس لکھتے ہیں "کربلا کا واقعہ شہادت انسانی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور جو دنیا کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگی پر اثر ڈالتا رہے گا۔ ہندوستان میں اس واقعہ کی یادگار

The J & K University Library
Acc. No. 19086

بڑی سنجیدگی سے منائی جاتی ہے جس میں نہ صرف مسلمان حصہ لیتے ہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی مساویانہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔"

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (الہ آباد یونیورسٹی) لکھتے ہیں:-

"حسین کا نام اس وسیع دنیا کے کروڑوں انسانوں کے لیے آب حیات ہے۔ اس نام نے میری آنکھیں ہمیشہ اشک آلود کر دی ہیں حسین کی بلند اور پاکیزہ سیرت محسوس کیے جانے کی چیز ہے۔ ایسے الفاظ کا پانا آسان نہیں جو اُن کے کردار کی عظمت کے مکمل مظہر ہوں یوں تو ان کی سیرت روحانیت اور آنسوؤں کی سب سے زیادہ تابناک روشنی میں کربلا (کرب و بلا) کے اندر چمک دکھاتی ہے۔ لیکن جو لوگ حسین کی زندگی سے کربلا میں شہادت واقع ہونے کے پہلے سے واقف ہیں اُن کے لیے اس زندگی کی بے داغ اور استوار پاکیزگی، اس کی بشریت، اس کا خلوص اور وقار، سچ کی عجیب اور سخت امتحان کے مقابلہ کی طاقت۔ یہ باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر فرد سے بخشی خراج عقیدت حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایسے ہیرو روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین — چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو — ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین
جوش

وہ دنیا کے بڑے سے بڑے خدا رسیدہ رشیوں اور شہیدوں کے ہم پلہ ہیں، اُن کا نام اور اُن کا کام اُن کی زندگی اور موت کے واقعات اُن نسلوں کی روحیں بیدار کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں

دستور کیخسرو مہیار کنور پیشوائے اعظم فرقۂ پارسی بمبئی فرماتے ہیں:-

"اگر شہدائے اعظم کی قربانیاں نہ ہوتیں تو دنیا اخلاق، مذہب اور صداقت سے ناآشنا رہتی دنیا ان شہداء کی ممنون ہے جنھوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی۔ امام حسین ان شہداء میں ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے جان دی۔ ہم کو ان کی یاد اپنے عمل سے منانا چاہیئے اور ان کی قربانیوں سے سبق لینا چاہیئے۔"

کیپٹن ال ایچ بنٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ نے ایک کتاب ۱۹۳۰ء میں لکھی تھی اس میں شاہان اودھ کے حالات، ہندوستان کے خاص خاص مذہبی تہواروں کا ذکر اور بعض دوسری حکایتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مضمون "محرم اور تعزیہ داری" یہ ہے۔ اُس میں تعزیہ داری کی

کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اسی طرح دنیائے اسلام اُس واقعہ کی یاد مناتی ہے جو نہایت ہی دردناک تھا اور تاریخ میں بے نظیر۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جام شہادت پی کر آپ نے اسلام کو صفحۂ ہستی سے محو ہونے سے بچا لیا۔ (اس کے بعد آپ نے مؤثر طور پر واقعۂ کربلا کا مختصر حال تحریر کیا ہے)

مسٹر کے ایل رلیا رام ہندوستانی عیسائیوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ آپ نے ملتان میں حسینی جلسہ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔ "اس شخص کی زندگی پر میں کیا کہوں جو روئے زمین پر حق و صداقت کا علم بلند کرنے والا پہلا فرد ہے امام حسین کی شہادت کا واقعہ کسی ایک قوم سے متعلق نہیں ہے۔۔ امام اس وقت اپنی بلند سیرت کا اظہار فرما کر آنے والی قوموں کے سامنے ثبات و استقلال، صبر و سکون، اور حق پسندی کا ایک کامل نمونہ رکھ گئے ہیں تاکہ اُن کی قربانی کو سامنے رکھ کر ظالموں اور جفاکاروں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ کربلا کے میدان میں امام حسین کی سیرت کے وہ وہ جوہر کھلے ہیں جن پر غور کر کے انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔۔۔ اس چودھویں صدی میں جبکہ دنیا انسانیت اور صداقت سے سیکڑوں کوس دُور ہٹ گئی ہے آپ کی بلند سیرت قوموں کیلیے مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ امام نے چونکہ حق و صداقت کے ایک عام اصُول کے لیے جان دی اس لیے ہر قوم و مذہب کے لوگ آپ کی مظلومیت اور فداکاری پر آنسو بہاتے ہیں۔ دنیا سے سیکڑوں سلطنتیں مٹ گئیں۔ ہزاروں بڑے بڑے انسان پیوند زمین ہو گئے کہ آج کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا لیکن امام نے اپنی قربانی سے تاریخ پر ایسا نقش چھوڑا ہے جو اپنی پائداری سے جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا ہے دنیا بدل جائے گی، عالم ظاہر کے آب و رنگ میں تغیر آ جائے گا لیکن ظالم اور مظلوم باقی رہیں گے اور جہاں بھی حق و صداقت جبر اور ظلم سے برسرپیکار ہو گی وہاں حسینؑ اور یزید کو یاد کیا جائے گا ہر دور میں یزید پیدا ہوتے رہیں گے لیکن حسین جیسا صداقت پسند بلند سیرت کا انسان اب پیدا نہ ہو گا۔ امام حسینؑ کے اصُول کی ہمہ گیری ایک ایسا واقعہ ہے جس پر تمام قوموں کے اتحاد کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے"

اندور میں حسین ڈے کانفرنس ہوئی۔ ہز ہائی نس مہاراجہ ہلکر آف اندور نے پیغام بھیجا جسمیں فرماتے ہیں:۔ "آج اس جلسہ کو تمام اقوام و مذاہب کے لوگ مشترکہ طریقہ سے کر رہے ہیں جس میں امام حسین کے اس کارنامہ سے سبق حاصل کرینگے جو آپ نے آزادی کے لیے وحشیانہ طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا کر وہ عظیم الشان قربانی دکھائی جس سے حق اور انصاف کو

دنیا میں قائم کر دیا۔ اگر تمام ملک میں اس قسم کے جلسے ہونے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ تمام قوموں اور مذہبوں میں اتحاد و اتفاق ہو جائے۔"

فریڈریک جے گولڈ نے لکھا ہے کہ "اگر میں نوجوانان ایشیا - افریقہ - آسٹریلیا - امریکہ اور یورپ کو عراق کے میدان میں جمع کر سکوں اور اگر میں حسین اور عباس کے روضوں کے روبرو کربلا میں کھڑا ہو سکوں اور اگر میری زبان اور لب و لہجہ سب لوگ سمجھ سکیں تو میں حسین کی زندگی اور موت کے اندرونی اور روحانی پیغام کے متعلق گفتگو کروں گا حسین انسانیت کا اعلیٰ بہترین نمونہ تھے جبکہ وہ ریگستانوں میں، دریاؤں میں، نفرت اور بیرحمی کی تاریک گھاٹیوں میں امن اور ہمدردی کی دعوت دے رہے تھے۔ اُن کی عملی زندگی میرے نزدیک ایسی ضرب المثل ہے جو عالمگیر معنی رکھتی ہے۔"

پھر جب تمام اقوام عالم اس حادثہ کی عظمت سے اس درجہ متاثر ہوئے۔ تو مسلمان جو قریب سے اس واقعہ کے دیکھنے والے تھے اور جن کے ساتھ براہ راست اُس کا تعلق تھا وہ کیسے متاثر نہ ہوتے چنانچہ ہوئے اور اتنا کہ جتنا کسی چیز سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس کا اظہار جسٹس سر محمد سلیمان "دگولڈن ڈیڈس آف حسین" میں ان الفاظ میں فرماتے ہیں "آج دنیا میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جو امام مظلوم کی شہادت کے اندوہناک واقعات کو سُنکر یا پڑھکر اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکے حضرت امام کی شخصیت کو ہر عہد کے مسلمانوں سے محبت اور عقیدت کا خراج ملتا رہا اور اُن کا نام اسلامی تاریخ کے شہدا کی فہرست میں سب سے اونچا رہا اور رہے گا۔"

ہز اگزالٹڈ ہائی نس محمد عثمان علیخاں نظام حیدر آباد دکن ۱۳۶۱ سنہ ہجری کے پیغام میں ارشاد فرماتے ہیں "تیرہ سو برس ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے وفاداروں اور جانثاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ رضائے الٰہی پر راہ حق میں قربان ہو گئے۔ اگر وہ ظلم و جور کا اس طرح مقابلہ نہ کرتے تو دین محمدی کو اس سے بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ملت اسلامی کو ایک گمراہ رہنما کی تقلید پر مجبور رہنا پڑتا۔ امام مظلوم نے ہمارے سامنے فرض شناسی اور راہ حق میں ایثار و قربانی کی ایک عظیم الشان مثال قائم کر دی ہے۔"

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کہتے ہیں "امام حسین علیہ السلام سے

بہتر اور روشن تر مثال دنیا میں نہیں پیش کی جا سکتی اس لیے کہ وہ مجسمہ تھے محبت اور بہادری کا اور پیکر تھے قربانی اور ایثار کا۔ ہر مسلمان کو بالخصوص ان کی زندگی سے سبق لینا چاہیے اور اُن کی پیروی کرنا چاہیے۔"

مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ جماعت نے واقعۂ کربلا کی یاد قائم رکھنے میں نمایاں حصہ لیا اور اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات کا ایک اہم عنصر قرار دے لیا۔ اس کا اندازہ آپ کو آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد ایسے روشن دماغ شیعہ کے ان الفاظ سے ہو جائے گا جو اُنھوں نے شیعہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۴۔۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمائے تھے:۔ "اس واقعۂ شہادت کی وہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے شیعوں کی حیات اجتماعی کی ایک ایسی کارفرما روح ہے جو انکی زندگی کے ہر شعبہ پر حکمران ہے۔ اگر آپ اس میں مداخلت کرینگے تو گویا ان کے اُس خزینۂ حیات پر ڈاکہ ڈالیں گے جس کو وہ اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جو اُن کے لیے موت اور زندگی کا سوال ہے۔"

یہ اہم یادگار کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ۱؎ "یہ وہ عزاداری ہے جو چودہ صدیوں سے برابر جاری ہے۔ یہ وہ ماتم ہے جو آج ۱۳۶۱ھ تک چلے کا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہ عزاداری ہے جو دبائے دب نہ سکی۔ جو مٹائے مٹ نہ سکی۔ بادشاہتیں اُس کے مٹانے کی درپے ہوئیں مگر خود مٹ گئیں۔ سلطنتیں اُسکی بیخکنی میں اپنی طاقتیں صرف کرتی رہیں مگر ساری طاقتیں سلب ہو رہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اسکو پامال کرنے اُٹھے مگر خود پامال ہو رہے ـــــ ہزاروں عزاداروں کو سولیاں دی گئیں۔ ہزاروں ماتمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا مگر یہ ماتم بند نہ ہوا اور یہ عزاداری بند نہوی۔"

یہ موقع نہیں ہے کہ عزاداری کے ہر دور کی صورت اور اُسکی رفتار پر تاریخی حیثیت سے کوئی بسیط تبصرہ کیا جائے اس کے لیے کتاب کے آخر میں ایک مستقل ضمیمہ درج کیا جائے گا مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ حسینی شہادت کی یہ طولانی عمر رکھنے والی یاد ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں ناپید ہے۔

۱؎ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن)

ے "انسان فطرتاً راحت پسند ہی اور غم کو پسند نہیں کرتا اور حوادث زمانہ سے جو غم پیش آتے ہیں اُن کو جلد سے جلد بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں غم کی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ جملہ اقوام عالم کی یادگاریں سب خوشی کی یادگاریں ہیں پھر کیا یہ اپنی نوعیت میں عجیب بات نہیں ہے کہ دشت کربلا میں فرزند رسول کی مظلومانہ شہادت کی یادگار صدہا سال سے مستقل طور پر قائم ہے۔"

یہ بھی دیکھیے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش بنا دیتا ہی اور اثر کو ختم کر دیتا ہی۔ ماضی کی یاد کا اس شدّت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی نقشہ اس نقش کو مٹا نہ سکے یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم میں کوئی مثال اُس کے بعد اُس سے بڑھ کر تو کیا اُسکے قریب بھی نظر نہیں آئی۔

آپ کو معلوم ہی کہ واقعۂ کربلا کے بعد کتنے انقلابات ہوے۔ تمدّن نے کتنی کروٹیں لیں۔ دنیا میں اخلاق کے معیار میں کس درجہ تغیرات ہوے۔ بہت سی چیزیں جو کسی وقت میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں بعد کو انسانوں کی نظروں سے گر گئیں۔ بہت سی وہ باتیں جو نہایت شرمناک اور ذلّت آمیز سمجھی جاتی تھیں دوسرے وقت میں وہ باعث عزّت عظمت بن گئیں ــ ہر دسویں برس، پانچویں برس بلکہ ہر سال انسان کے مزاج میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، انسان کا اخلاقی معیار بدلتا رہتا ہی۔ جبکہ ہماری آنکھوں کے سامنے انسانی تمدّن میں یہ انقلابات ہوتے رہتے ہیں تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے اتنی طولانی مدّت کے متعلق جس میں بہت سی صدیاں آئیں اور چلی گئیں۔ بادشاہتیں قائم ہویں اور مٹ گئیں اور انسانوں میں ہزاروں قسم کے حالات میں تبدیلیاں ہویں لیکن وہ کون سی چیز تھی کہ جس طرح وہ اپنے وقت میں عزّت کی نگاہ سے دیکھی گئی اُسی طرح عزّت کی نگاہ سے آج تیرہ سو برس بعد بھی دیکھی جاتی ہی۔ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسے مشترک انسانی اصُول کی حفاظت کے لیے قربانی کی گئی تھی کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اُس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے۔ اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی قائم ہے۔

ے سفیر صاحب سندیلوی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حوادث میں جتنی کسی واقعہ کو ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اُسی قدر اُس پر اہل فکر و قلم طبیعت آزمائی زیادہ کرینگے - اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ پر نظم و نثر لٹریچر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا اسلامی تاریخ کی تدوین سے پہلے خصوصیت سے اس واقعہ پر تصانیف شروع ہو گئے اور ابھی کربلا کی زمین پر خون شہیداں کی تری خشک نہ ہوی ہوگی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کی نظم کے اشعار تراوش کرنے لگے۔

سب سے پہلے ؎ "واقعات کربلا کے تاریخی عناصر کا تحفظ بہت کچھ اسیران کربلا نے کیا۔ جو کچھ مواد اُن سے ملتا ہے وہ اگرچہ مقدار میں کم ہے لیکن اُس سے حسینؑ کے فلسفۂ شہادت اور بنی اُمیہ کے مقصد زندگی کے سمجھنے میں حوصلہ کے مطابق مدد ملتی ہے۔ اسیران کربلا کی وہ تقریریں جو کوفہ اور شام کے بازاروں اور درباروں میں ہزاروں کے مجمع عام میں ہوی ہیں اور مدینہ واپس آکر مخدرات عصمت اور امام زین العابدین نے جس طرح ان واقعات کی اشاعت کی ہے اُس کے نتیجہ میں اس واقعہ نے سارے عرب سے شناسائی حاصل کر لی۔ خود اموی نامہ نگاروں اور فوجیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں واقعات کو (مسخ کر کے سہی) بیان کیا۔ وہ بغیر شعور کے اکثر اس کے ایسے جزئیات بیان کر دیتے تھے جن کی مؤرخ کی نگاہ میں بڑی قیمت ہے۔ شعراء کے لیے اس واقعہ نے دردانگیز مواد مہیا کیا اور خطیب اس سے اپنے کلام میں زور پیدا کرنے لگے، علاوہ اُن اشعار کے جو اہلبیت حسینؑ کی طرف منسوب ہیں عام شعراء میں چند شعر مرثیہ کے جو پہلے پہل کہے گئے وہ دیوان حماسہ کے صفحات پر ابتک موجود ہیں مگر مستقل طور سے اس سلسلہ کی ابتدا کمیت اسدی شاعر نے کی ہے۔ پھر سید اسمٰعیل حمیری نے اس میں ترقی کی اور دعبل خزاعی نے اس پر جلا کی اور یہ سلسلہ اس کے بعد جاری ہو گیا۔

نثر میں اُن مختلف خطبوں کو چھوڑتے ہوئے جو اہلبیت کی زبان سے یا مختلف مقررین کے ذہن سے ہنگامی طور پر نکلے ہیں خصوصاً اُن اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلا لینے کے لیے سلیمان بن صرد خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوے ہیں جن کا مقصد

؎ مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری

ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعۂ کربلا کی اہمیت سے متاثر بنایا جائے - ان میں سے بہت کم خطبے موجود ہیں اور میرے خیال میں اگر وہ سب جمع ہوتے تو ایک بہت بڑا ذخیرہ واقعۂ کربلا کے متعلق ہمارے ہاتھ میں ہوتا مستقل طور سے اس سلسلہ میں تصنیف کی ابتدا پہلی صدی کے اواخر سے ہو گئی اور ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کے مقتل کا نام اس عہد کی یادگار ہے جس سے اس کے بعد کی تمام کتابوں میں واقعات لیے گئے ہیں — اس کے بعد برابر مستند مؤرخین واقعۂ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

آخر کتاب میں دوسرا ضمیمہ مختلف زبانوں میں واقعۂ کربلا کے بارے میں کتابوں کی فہرست کے متعلق آئے گا جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ دنیا کے کسی موضوع پر اتنا نہیں لکھا گیا اور نہیں کہا گیا ہے جتنا کہ واقعۂ کربلا کے بارے میں لکھا اور کہا گیا ہے۔ مگر جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں سب مذہبی نقطۂ نظر کے ماتحت اُن ہی لوگوں کے لیے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے معتقد ہیں۔ اُن میں قرآن کی آیتیں ہیں۔ پیغمبر کی حدیثیں ہیں اور اس طرح کی روایتیں ہیں جو مُسلمانوں کے طبقہ میں مقبول ہو سکتی ہیں۔ کوئی غیر مسلم ہندو، عیسائی یا کسی دوسرے مذہب کا انسان اگر واقعۂ کربلا کو اُس کے اسباب، نتائج اور ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کا پتہ دیا جا سکے۔ پھر سے "جن لوگوں نے تاریخ نویسی کے فریضہ کو اپنے ہاتھ میں لیا وہ مؤرخ نہیں تھے اور نہ تاریخ نویسی کے قوانین سے واقف تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعۂ کربلا کبھی فلسفۂ تاریخ کے ماتحت صحیح استنتاج سے آشنا نہیں ہوا"

زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جبکہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب و ملت کے افراد متفق ہو کر حسین بن علی کی سیزدہ صد سالہ یادگار کی جانب پورے طور پر متوجہ ہیں تو یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ میں۔ انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں۔ انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی بارگاہ میں۔ انسانی وقار، عزت

سے مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب۔

اور افتخار کی بارگاہ میں۔ انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے

حسین بن علی کے کارنامۂ جاوید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اُس ایثار و قربانی کی تصویر کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لاسکے تو یہی اس خدمت کا پورا حاصل ہوگا۔

آغاز کتاب

(حصۂ اوّل)

شہید کربلا کا تعارف اور سیرت زندگی

(پہلا باب)

نسبی خصوصیات، خاندان اور اُس کے شاندار روایات

"اصلی محرک نظام اخلاق کے آباؤ اجداد ہیں" (مسیو لیبان)

بے شک ایسا ہی ہے "توارث صفات" کے لحاظ سے بھی اور خاندانی جذبات اور احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپنے سے کان میں پڑے ہوئے تذکروں اور ماضی کے افسانوں سے قوائے ادراک و شعور کی اُسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یونہی بچپنے کے سُنے ہوئے تذکرے بجلی کی ایسی رو کے ساتھ انسان کے دماغ کی گہرائیوں میں اُترتے اور نفس کے نیم شعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

ع۵ "توارث" کا عام اصُول تو یہ ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد اُس کی منتقلہ اور غیر منتقلہ تمام چیزیں اُس کی اولاد یا دوسرے قرابتداروں کی طرف جاتی ہیں مگر یہ محض مادی نقطۂ نظر سے ہے - روحانی اور اخلاقی خوبیوں کا توارث جو نسلاً بعد نسل چلا کرتا ہے - اُس

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ پٹنہ

مادی ورثہ سے بہت بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو غصب کیا جا سکتا ہے اور نہ چرایا جا سکتا ہے
یہ ایک پیدائشی حق ہے جس کا رستہ نہ تو ملتوی کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے۔ عام
بات ہے کہ بیٹا باپ کی اکثر خصوصیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ماضی کا تجربہ بھی بتاتا ہے اور مستقبل میں
بھی اس بات کی صداقت ظاہر ہو کر رہے گی"۔

اس بنا پر حسین کے نفس کو سمجھنے کے لیے تاریخ کے بہت سے ورق اُلٹ کر اور صدیوں
کی مسافت طے کر کے ہم کو بڑی دُور سے اُن کے آباؤ اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیم خلیل سے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں یعنی
یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی طور پر مورثِ اعلیٰ
کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفےٰ نے اپنے کو ملت ابراہیم
کا رہبر بتلایا اور حضرت ابراہیم ہی نے اُس جماعت کا جو راہ حق میں اُن کے پیچھے آئے سب سے پہلے
نام "مسلم" رکھا اور ابراہیم کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ
خداوندا ہم کو "مسلم" قرار دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "اُمت مسلمہ" قرار دے۔ اس
طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبر اسلام کی بعثت گویا دعائے ابراہیم کا نتیجہ تھی اس لیے
حضرت ابراہیم کے روایات زندگی ابنائے اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے
تھے اور فرزندان اسلام کے عناصر اخلاق کی تشکیل میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے اسحاق اور اسمٰعیل۔ اسحٰق سلسلہ بنی اسرائیل کے
مورثِ اعلیٰ ہیں اور اسمٰعیل ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ کے دادا ہیں۔ اسباب ایسے
مجتمع ہوئے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند اسمٰعیل کو شیر خوارگی کے عالم میں اُن کی ماں ہاجرہ
کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا یہ وہی جگہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے۔ اس خانۂ کعبہ کی تعمیر
ان ہی باپ بیٹے ابراہیم اور اسمٰعیل نے کی خانۂ کعبہ تیار ہو گیا اور تمام اطراف ملک کے
لوگوں کا نقطۂ اجتماع بن گیا۔ یہاں سے آل ابراہیم کی مرکزیت کا سنگ بنیاد قائم ہوا کیونکہ یہ
خانۂ کعبہ کے بانی اور اُسکے محافظ تھے اور کعبہ تمام قبائل عرب کا مرکز تھا۔

قدرت نے ان باپ بیٹے کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامور ہو گیا کہ بیٹے کو اپنے ہاتھ

سے ذبح کرے اور اُس نے بڑی ثابت قدمی اور پُرجگری کے ساتھ حکم ربانی کی تکمیل کے لیے اس فرض کو انجام دینے کا سامان کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت پر حکم برطرف ہو گیا اور بجائے انسان کے جانور کی قربانی کا عملدرآمد ہوا اور اس ذریعہ سے اُس جاری شدہ رسم کی اصلاح ہو گئی جو دیوتاؤں کے لیے انسان کی جان کی قربانی کی صورت میں بہت سی قوموں میں رائج تھی۔ اسلام نے قدیم زمانہ کے اس واقعہ کو بڑی اہمیت دی اور عید قرباں کی شکل میں اُس کی مستقل یادگار قائم کر دی۔ شاید یہ احساس زندہ رکھنے کے لیے کہ اس سلسلۂ شرافت کی ابتدا ہی نفس کی قربانی سے ہوئی ہے۔

[۱] "اسمٰعیل کے بارہ[۱۲] فرزند تھے۔ ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور پیغمبر اسلام ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔"

[۲] "حضرت کا نسب نامہ آپ کی ذات سے لے کر عدنان تک معتبر کتب تواریخ و سیر میں موجود ہے۔ اس طرح :۔

عدنان[۱] ۔ معد[۲] ۔ نزار[۳] ۔ مضر[۴] ۔ الیاس[۵] ۔ مدرکہ[۶] ۔ خزیمہ[۷] ۔ کنانہ[۸] ۔ نضر[۹] ۔ مالک[۱۰] فہر[۱۱] ۔ غالب[۱۲] ۔ لوی[۱۳] ۔ کعب[۱۴] ۔ مرہ[۱۵] ۔ کلاب[۱۶] ۔ قصی[۱۷] ۔ عبد مناف[۱۸] ۔ ہاشم[۱۹] ۔ عبد المطلب[۲۰] عبد اللہ[۲۱] جو حضرت محمد مصطفیٰ کے والد بزرگوار تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے عدنان تک اکیس[۲۱] پشتیں ہیں اور اگر ہر نسل کا اوسط تیس[۳۰] سال قرار دیا جائے تو سنین میں کل پشتوں کی مدت تقریباً ۶۳۰ برس ہوئے یعنی حضرت عیسیٰ سے تقریباً سو ڈیڑھ سو سال پیشتر۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام پشتیں کتب تواریخ میں نہ صرف مذکور ہیں بلکہ ان پر تمام مورخین اور ارباب سیر کا اتفاق ہے اور قدیم زمانہ میں یہ بہت بڑی فضیلت سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص جو کسی ملک کا باشندہ ہو اُس کے آباؤ اجداد سب اسی ملک میں پیدا ہوں۔ مصری اور یونانی اقوام اس فضیلت کے بہت قائل تھے اور وہ لوگ جن میں یہ صفت پائی جاتی تھی کہ ابا عن جد کسی خطۂ زمین کے رہنے والے ہوں اہل یونان و مصر اُن کو اپنا دیوتا یا نیم دیوتا مانتے تھے۔ قریش کا لقب

---

[۱] مولانا عینی شاہ صاحب نظامی (حیدرآباد دکن)، [۲] مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی

ان اکیس^۲۱ آدمیوں میں سے کس کو ملا اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور بعض کے نزدیک نضر بن کنانہ کو اور بعض کے نزدیک قصی بن کلاب نے یہ عزت و افتخار حاصل کیا چنانچہ عقد الفرید میں اس کی تصریح ہے کہ چونکہ قصی نے خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا تھا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ "تقریش" کے معنی جمع کرنے کے ہیں اور اسی سے وہ مجمع کہلاتے ہیں :-

قصیّ ابوکم من یسمّیٰ مجمّعا بہ جمع اللہ القبائل من فہر"

علہ "بابل والوں کے حملے کی وجہ سے کعبہ کی مجاوری جو نسل اسمٰعیل ہی کے لیے مخصوص تھی ان کے ہاتھ سے نکل کر جرہمی خاندان کی طرف منتقل ہوگئی تھی جرہمی اپنے کو ملک کہا کرتے تھے اور اس کا یہ سبب تھا کہ وہ دنیوی اور مذہبی اقتدار کے مالک تھے۔ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں بنی خزاعہ نے یمن سے نکل کر مکہ اور جنوبی حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں بنی اسمٰعیل بھی اپنی قوت اکٹھا کر رہے تھے۔ خاندان خزاعہ تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک رہا قصی نے خزاعیوں کو مکہ سے نکال باہر کیا اور خود اس پر قابض ہوے اور رفتہ رفتہ تمام حجاز کو اپنے زیر حکومت داخل کر لیا۔ مکہ اس زمانہ میں چھوٹا سا قریہ تھا جس میں محض خیمے اور جھونپڑے تھے۔ قصی نے از سر نو کعبہ کی تعمیر کی اور اپنے لیے ایک عالی شان محل بنوایا جس میں خود اُن کا کمرہ دار الندوہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے قریش جو تمام ملک میں منتشر تھے آکے گرد و نواح میں بس گئے۔ قصی نے لوگوں کے لیے قوانین بھی بنائے اور خراج کی چونگیاں اور حاجیوں کے خورد و نوش کا بھی انتظام کرایا۔ قصی کا انتقال ۴۸۰ء میں ہوا۔"

قبیلہ قریش کو خاص امتیازات حاصل ہوے سلہ" ان کے روحانی اقتدار کے سامنے عرب کے تمام معزز و ممتاز قبائل نے اپنی گردنیں خم کر دی تھیں۔ یہ لوگ اپنے روشن کیرکٹر کی بناء پر خانۂ کعبہ کے محافظ بھی تھے اور موسم حج کے منتظم بھی۔ نزاعات قومی کے منصف بھی تھے اور مفاسد تمدّن کے مصلح بھی۔ ان کا فیصلہ ہر قضیہ میں ناطق اور ان کی رائے ہر معاملہ میں صائب تھی۔ اس قبیلہ کو دنیاوی وجاہت کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ حاصل تھی کہ

علہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ سلہ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی۔ مرادآباد

کفر وشرک کی گھنگور گھٹاؤں میں یہ ایسی چمکتی پیشانیاں تھیں جو ملت ابراہیمی کے قیام سے آجتک بت پرستی کے غبار سے آلودہ نہیں ہوئیں "

عا "قصی کے بعد ان کے بیٹے عبد الدار مسند نشین ہوئے جن کا تقرر قصی نے بطور جانشین کے اپنی زندگی ہی میں کر دیا تھا۔ عبد الدار کے انتقال کے بعد جانشینی کے بارے میں اُن کے پوتوں اور اُن کے بھائی عبد مناف کے بیٹوں میں اختلاف ہوا مگر جلد ہی آپس میں یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ عبد الدار کے پوتوں کے ہاتھ میں کعبہ کی کنجی، دار الندوہ اور فوجی نشان رہے اور عبد مناف کے بیٹے عبد الشمس کو سقائی اور خراج کی وصولیابی کی خدمت تفویض ہوئی۔ عبد الشمس نے اپنے حقوق اپنے بھائی ہاشم کی طرف منتقل کر دیئے "

عا۲ "ہاشم نہایت با اثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں سقایہ اور رفادہ ان کو سپرد کی گئیں جو اُنھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ اُنھوں نے قیصر روم سے خط وکتابت کر کے کچھ خاص حقوق عرب تجار کے واسطے حاصل کئے تھے۔ "ہاشم" ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں روٹیاں شوربے میں چور کر کے لوگوں کو کھلائیں (عربی میں ہَشَم چور را کرنے کو کہتے ہیں) "

عا۳ "ہاشم کا انتقال ۵۱۰ء میں ہوا۔ انھوں نے یثرب کی ایک خاتون سلمٰی کے بطن سے ایک فرزند شیبہ نامی چھوڑا۔ ہاشم کی وفات کے بعد اُن کے بھائی مطلب جانشین ہوئے۔ مطلب کا انتقال ۵۲۰ء میں ہوا اور اُن کی جگہ اُن کے بھتیجے شیبہ تخت نشین ہوئے جو عبد المطلب کے نام سے مشہور ہوئے "

ہاشم کے فرزند عبد المطلب بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے "سید البطحا" ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو اُن کی اولاد میں رہ گیا جس سے آجتک آل رسول "سادات" کہلاتے ہیں۔ ان کا اعتماد، توکل اور خدا پر بھروسا اُس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے آ کے کعبہ پر حملہ کیا۔ یہ اصحاب فیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبد المطلب بارگاہ الٰہی

عا سید امتیاز حسین صاحب ترمذی عا۲ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے

عا۳ سید امتیاز حسین صاحب

میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحاب فیل کو برباد کر دیا۔ اب عبدالمطلب جو محافظ حرم تھے عملی طور پر حافظ حرم ثابت ہو گئے۔ عبدالمطلب کے دس بارہ بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابو طالب تھے۔

ا؎ "انہی عبداللہ کی قربانی کا واقعہ مثل حضرت اسمٰعیل کی قربانی کے واقعہ کے کتب تواریخ میں مذکور ہے جس طرح حضرت اسمٰعیل کا فدیہ ایک دنبہ تھا اسی طرح مشہور ہے کہ عبدالمطلب نے سو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بچائی" اس واقعہ کی بنا پر عبداللہ بھی "ذبیح" کہلائے۔

قدرت کا کرنا کہ آخر میں ان کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابو طالب کو حاصل ہوئے ابو طالب "شیخ البطحا" اور "سردار قریش" مشہور ہوئے اور حامل ہوئے تمام مواریث انبیاء کے اور اُن امانتوں کے جو ابراہیم و اسمٰعیل کی متروکہ تھیں اور سب سے بڑی امانت ایک ان کی حفاظت میں آئی۔ وہ عبداللہ کے یتیم محمدؐ کی ذات تھی اور وہ قدرت کے مقاصد جو اس ذات کے ساتھ وابستہ تھے ان سب کی حفاظت ابو طالب سے متعلق تھی۔

ابو طالب کی آغوش میں جب حضرت محمد مصطفےٰ کی پرورش ہو رہی تھی تو ابھی آپ کی عُمر نوجوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کر لیا اور آپ کو "صادق" اور "امین" کا لقب دیا یہاں تک کہ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھا۔ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ کی عمر بیس برس کی تھی جب قریش میں "حلف الفضول" کا عہد نامہ ہوا تاریخ صاف اقرار کر رہی ہے کہ اتنے شریفانہ اصول پر معاہدہ اس کے پہلے کبھی نہ ہوا تھا اس معاہدہ کی تحریک کا سہرا بنی ہاشم ہی کے سر تھا زبیر بن عبدالمطلب سب سے پہلے اس کے داعی تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ع۲؎ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی

ا؎ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے ع۲؎ سید امتیاز حسین صاحب ایڈووکیٹ

پھر شروع ہوگئی رشتے ناتے کی وجہ سے آپس میں خونریزیاں تو نہیں ہوئیں لیکن اجنبی لوگوں کی زندگی محفوظ نہیں تھی۔ معاملات کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی کہ حنظلہ جو قبیلہ بنی القیس کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ دن دہاڑے مکہ کی سڑکوں پر لوٹ لیا گیا۔ بنی ہاشم کا حساس دل انسانی تکلیفوں اور اس قسم کے جبورانہ اقدامات کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُنھوں نے پردیسیوں اور اجنبیوں کی خدمت و نگہداشت کا بیڑا اُٹھا لیا۔"

بنی ہاشم، زہرہ اور تیم سب عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دینگے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ اُس کا حق ادا نہ ہو جائے اور ہم اسباب زندگی میں ایک دوسرے کی معانت اور ہمدردی کرینگے اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ یہ نام جرہمین کی ایک قدیم انجمن کے نام کی یادگار میں رکھا گیا جس میں فضل۔ فضال، مفضل اور فضیل شامل تھے اور اس لئے اس کا نام فضول پڑ گیا تھا۔ حضرت محمد اس معاہدہ میں شریک تھے اور آپ نے اس انجمن میں شرکت ۵۹۵ء یعنی اپنی شادی کے کچھ دن بعد کی تھی اور ہمیشہ اس پر آپ نازاں رہے بلکہ دعوت اسلامی کے ظہور کے بعد جبکہ سابق کے تمام عرب کے معاہدات اور مخاصمات کالعدم قرار دیدیے گئے تھے آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اُس کی صدا پر لبیک کہوں گا (طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن ج ۱ ص ۸۲)

اگر آپ نے عرب کی تاریخ پڑھی ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ عرب قوم کی اسپرٹ کے بالکل خلاف تھا وہاں تو یہ تھا کہ ہم کو اپنے ہم قوم کی مدد کرنا چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس قبائلی تعصب کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شخص کی جنگ قبائلی جنگ بن جاتی تھی جو چالیس چالیس برس رہتی تھی۔ اس غلط ذہنیت کے خلاف اگر بغاوت کرنے والے تھے تو بنی ہاشم تھے جو دنیا کو حق اور انصاف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت یا برادری کوئی چیز نہیں ہے۔

ع۵ در حلف الفضول کی تنظیم کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں عثمان بن حویرث نے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

بازنطینی دولت و ثروت کی لالچ اور پشت پناہی کی وجہ سے حجاز کو رومی سلطنت کا محکوم بنانا چاہا عثمان کی یہ یورش نہایت جسارت اور مردانگی کے ساتھ تھی اور وہ یقیناً کامیاب ہو گیا ہوتا اگر عربوں میں اس وقت بھی پیشتر کی طرح نفاق اور بے آئینی باقی رہتی لیکن حلف الفضول کی وجہ سے عربوں میں کافی سمجھ آگئی تھی اس لیے وہ اقدام ناکامیاب ہوا اور حجاز ایک غیر قوم کی غلامی سے محفوظ رہا۔"

محمد مصطفےٰ کی عمر تیس برس کی تھی اُس وقت ابوطالب کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا "علی" ابھی علی چار پانچ برس کے ہونگے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالب اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بار کو کم کرنے کیلئے محمد مصطفےٰ نے علی کی پرورش اپنے متعلق کرلی۔ اب علی محمدؐ کے آغوش تربیت میں تھے۔

یہاں پر ایک دفعہ یہ نظر ڈال لو کہ اس خاندان کی زمین شرف کس آسمان تک پہنچ چکی ہے اور اُس کے قدیم روایات کس درجہ شاندار ہیں۔

(۱) کعبہ جو تمام عرب کے اجتماع کا مرکز ہے وہ بنایا ہوا ہے ان کے دادا حضرت ابراہیم کا

(۲) ان کے مورث اعلیٰ جناب اسمٰعیل اللہ کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے "ذبیح خدا" کہلائے یہ قربانی کا جذبہ اس خاندان کا ورثہ ہے۔ عبدالمطلب اور ان کے فرزند عبداللہ نے اسی سبق کو دہرا کر ثابت کر دیا۔

(۳) تمام قبائل مضر کی شیرازہ بندی کا فخر ان کو حاصل ہے۔

(۴) خانۂ کعبہ کے محافظ اور موسم حج کے منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں تمام عرب کی مرکزیت حاصل ہے۔

(۵) اندرونی اور بیرونی معاملات میں عرب قوم کی لیڈرشپ اور نمائندگی ان کا حصہ ہے

(۶) وہ غریبوں کے ملجاؤ ماویٰ اور قحط سالی وغیرہ کے ایسے سخت اوقات میں مسکینوں کی خبر گیری کرنے والے ہیں۔

(۷) وہ اسم اور مسمّٰی دونوں حیثیتوں سے سردار (سیّد) مانے جاتے ہیں۔

(۸) وہ ایک ہی وقت میں جنگ کے میدان کے شہسوار اور روحانی عالم کے ہمراز ہیں ابرہہ کی جنگ میں عبدالمطلب کا طریقۂ پیکار اس کا گواہ ہے۔

(۹) انھوں نے مظلوم کی حمایت اور حق کی طرفداری کا بیڑا اُٹھایا اور اس بارے میں تمام قریش کی رہنمائی کی تھی۔

یہ تھے وہ نمایاں خصوصیات جو گزشتہ تاریخی واقعات سے نمایاں طور پر اس خاندان کے لیے ثابت ہیں۔

ف "رحمت ایزدی اس خاندان کے اتنے ہی اقتدار پر بس کرنے والی نہ تھی بلکہ وہ اس مقدس خاک پر ایک ایسا آفتاب چمکانا چاہتی تھی جس کی بڑھتی ہوئی شعاعیں حیات انسانی کے ناپیدا کنار میدان سے گزرتی ہوئی قیامت کے دامن سے جا لپٹیں"

چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈانوا ڈول تھی۔ جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین مکہ سے ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے لئے بھی بنی ہاشم کا گھرانا منتخب ہوا۔ وہی عبداللہ کا یتیم محمد مصطفےٰ جس کی سچائی اور امانتداری کو تسلیم کیا جا چکا تھا اس پیغام کا حامل قرار پایا۔ اس پیغام کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی تھی اور اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کو مٹانے کا اعلان کیا گیا تھا مگر یہ بت سونے چاندی پتھر ہی کے ہونا ضروری نہیں ہیں بلکہ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان بھی صنم ہے جبکہ وہ الوہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور دنیا کو اپنے سامنے سرنگون ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت جبکہ پیغمبر نے اس پیغام اسلام کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ان کے چچازاد بھائی حضرت علی کی عمر ۱۰ برس کی تھی۔ یہ عمر بچپن ہی کی ہوتی ہے اور اس سن میں انسان تربیت سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ علی کی تربیت پیغمبر ہی کر رہے تھے اس لیے مجھے کہنے دیجیے کہ اب رسول کی آغوش میں دو چیزیں پرورش پا رہی تھیں ایک اسلام اور دوسرے علی۔ علی اور اسلام میں وہی وابستگی تھی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

ف مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

سے[۵] "تین برس تک آنحضرت نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ کو ادا کیا مگر علائے کلمۃ اللہ میں اخفا رو رواداری مناسب نہ تھی لہذا صاف حکم آیا "فاصدع بما تؤمر" اور "انذر عشیرتک الاقربین" - ان آیات کے نزول کے بعد فرض ہو گیا کہ تبلیغ کھلم کھلا کی جائے اور "عشیرتک الاقربین" ہی سے شروع کی جائے۔ چنانچہ حضور نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا یامعشر القریش اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں کیونکہ ہم تم کو سچا جانتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا۔ بقول مولانا شبلی "یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جو حضور نے فرمایا" اس پر سارا مجمع جس میں آپ کے اعمام بھی تھے سخت برہم ہو کر چلے گئے مگر آپ اس ناکامی سے بددل نہ ہوئے اور چند روز کے بعد ہی آپ نے حضرت علی سے ارشاد فرمایا کہ دعوت کا سامان کرو۔ بقول مؤرخ ابوالفدا حضرت نے حضرت علی سے کہا کہ "ایک صاع (تقریباً ڈو یا پونے دو سیر مروجہ) کھانا پکواؤ اور اسکے اوپر بکری کی ران رکھو۔ اور ایک پیالہ میں دودھ بھرو" اس طرح بیں تمام آپ کے اعزا، مدعو کئے گئے۔ آنحضرت نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دیگا۔ تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعتہً علی نے اُٹھ کر کہا گو مجھ کو آشوب چشم ہے گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نو عمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دونگا اب مسلمانوں کی جماعت چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے نہایت دلیری سے حرم کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا جو کفار کے نزدیک حرم کی سب سے بڑی توہین تھی اسلیے دفعتہً ایک ہنگامہ ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت کے ربیب حارث بن ابی ہالہ نے حضرت کو بچانا چاہا لیکن اُن پر اتنی تلواریں پڑیں کہ شہید ہو گئے اسلام کی راہ میں یہی پہلے شہید ہیں۔

اس کے بعد سے بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع ہوگئی اور رؤسائے قریش نے ابو طالب سے آکر اس کی شکایت کی۔ پہلے تو ابو طالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر جب نزاع بڑھی

سے[۵] میرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔

تو ایک جماعت اکابر قریش بطور وفد ابوطالب کے پاس پھر آئی۔ اس وفد میں عتبہ بن ربیعہ شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوطالب سے نہایت صاف الفاظ میں اور سختی سے کہا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہماری قوم کو گمراہ کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اس لئے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے ابوطالب اس دھمکی سے وقتی طور پر خائف ہو گئے۔ سوائے آنحضرت کو سمجھانے کے کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ حضرت سے عرض کیا "اے پیارے بھتیجے میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں" آپ نے دیکھا کہ اب ان میں بھی تحمل نہیں ہے۔ پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔ اس جواب کو سنکر ابوطالب کا دل ہل گیا اور آنحضرت سے کہا کہ جاؤ اب تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا حضرت کا یہ استقلال اور اہل قریش کی ان مناسبت سے تکلیف دہی برابر جاری رہی۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ شخص جاہ و ثروت اور نام و نمود کی خواہش سے ایسا ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی جانب سے عقبہ بن ربیعہ کو حضرت کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اے محمد آخر تم چاہتے کیا ہو؟ مکہ کی ریاست؟ یا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ یا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ پورا مکہ تمھارے زیر فرمان ہو جائے لیکن تم ہمارے مذہب میں دخل نہ دو لیکن حضرت نے ان سب فضول سوالوں کے جواب میں قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ دیں جن کا اثر عقبہ پر اتنا ہوا کہ اس نے قریش سے جا کر کہدیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں، کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے ہے کہ تم اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب ہوں گے تو اس میں بھی تمھاری عزت ہے ورنہ عرب اُن کو خود فنا کر دیگا قریش نے یہ رائے منظور نہ کی اور سخت تنفر و تشدد جس کو آجکل کی اصطلاح میں بائیکاٹ اور نان کوآپریشن کہتے ہیں جاری رکھا،،

مگر ابو طالب نے حضرت محمد مصطفےٰ کی حفاظت میں جان کو جان نہ سمجھا بلکہ اپنی اولاد کو بھی رسول پر جاں نثاری کی عادت ڈالی۔ اُس وقت جب یہ لوگ شعب ابی طالب میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن شب کو اچانک حملہ کر کے حضرت محمد مصطفےٰ کو قتل نہ کر دے ابو طالب آپ کو ایک بستر پر رہنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو باری باری آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو اُن کے بستر پر منتقل کر دیتے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد کے بدلے چاہے ان کا فرزند قتل ہو جائے کوئی پرواہ نہیں مگر رسول کی جان بچ جائے۔ یہ ذوق قربانی کیا فراموش ہونے کے قابل ہے؟ یہ کس کی خاطر تھا؟ چاہے کہیے محمد کی خاطر اور چاہے کہیے اسلام کی خاطر۔

تین ۳ برس کے مکمل محاصرہ کے بعد اس قید سے نجات ملی مگر ۵ "عرب عدم تشدد کے قائل نہ تھے۔ وہ اس کو جہل اور بزدلی سمجھتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں پر سخت سے سخت مظالم شروع کئے اور حضرت ان مصائب و آلام کو نہایت جوانمردی اور استقلال سے برداشت کرتے تھے۔ یہ مصائب اور پریشانیوں کا زمانہ ہنوز ختم نہیں ہوا تھا کہ سنہ ۱۰ نبوی میں یعنی بعثت سے دسویں برس حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال تھوڑے ہی دن کے آگے پیچھے سے ہوا۔ ان دونوں آدمیوں کی رحلت سے حضرت محمد مصطفےٰ کو سخت رنج و ملال ہوا۔ اسی سے آپ اس سنہ کو "عام الحزن" (رنج کا سال) فرماتے تھے"۔ اب آپ کے لیے وہ سپر جو ہر سخت موقع پر آپ کے سامنے آجاتی تھی یعنی ابو طالب کی قدیمی وجاہت بھی باقی نہ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مکہ کی ایذا رسانی آپ کو حد سے زیادہ بڑھ گئی یہاں تک کہ سب آپ کی جان لینے کے درپے ہوئے اور ایکا ہو گیا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ مجبور ہو کر آپ کو اپنے پیدائشی وطن مکہ کو خیرباد کہنا پڑا اور مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسی کا نام "ہجرت" ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے چچازاد بھائی علی بن ابی طالب کو ہدایت کی کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر علی بن ابیطالب اپنی جان کو حفاظت رسول میں سپر بنائے ہوئے اُن کے بستر پر آرام کرتے رہے۔

مدینہ میں پہونچنے کے بعد بھی پیغمبر اسلام کو مخالف گروہ نے اطمینان کی زندگی بسر کرنے نہیں دی

---

۵ میرزا محمد عسکری صاحب (بی اے)

اور متعدد مرتبہ بڑی بڑی فوجوں کے ساتھ آپ پر چڑھائی کی بدر و احد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ ان میں مخالف طاقتوں نے ایکا کر کے حضرت محمد مصطفٰےؐ کے مشن کو شکست دینا چاہی مگر سچائی کی طاقت کو شکست نہ دے سکے۔ ان لڑائیوں میں محمد مصطفٰےؐ کی حمایت میں علی مرتضٰی کی تلوار اسلام کے نام کے ساتھ اپنی یاد قائم رکھے گی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کا اتحاد اور زیادہ مضبوط بنانا تھا حضرت محمد مصطفٰےؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہرا جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے اور اُن کی اتنی عزت کرتے تھے جتنی کسی باپ نے اپنی بیٹی کی عزت نہیں کی ہو یعنی جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا اُن بلند اوصاف کا جو اس مقدس خاتون کو حاصل تھے۔

علہ عرب میں قدیم زمانہ سے بڑا جذبہ پاکیزگی خاندان کا پایا جاتا تھا۔ اُن کا خیال تھا اور بہت حد تک صحیح تھا کہ انسان میں اچھائی اور بُرائی خون اور نطفہ میں ہوتی ہے اور نسلاً بعد نسل چلا کرتی ہے۔ اس وجہ سے وہ شجروں پر بہت زور دیا کرتے تھے اور وہ نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھے جاتے تھے، مرنے والے سردار کی شجاعت، تہوّر اور عقل اُسکے ساتھ قبر میں دفن نہیں ہو جاتی تھی بلکہ وہ ایک لافانی وراثت میں تبدیل ہو جاتی تھی جس سے اُس کی نسلیں متصف نظر آتی تھیں۔ ایسے لوگوں کی لڑکیاں فطرۃً بہادروں کی مائیں ہوتی تھیں۔ بہر حال عربوں میں سب سے بڑی ممکن عزت یہ ہوتی تھی کہ اُس کی رگوں میں خالص عربی خون دوڑ رہا ہو۔ عرب کی کسی معمولی خاتون کی شادی عجم کے بادشاہ کے ساتھ بھی ذلت ہی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اور اس بات پر ضد کرنے سے ایک دفعہ حیرہ کے آخری بادشاہ کو اپنے تخت اور اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسلام نے اگرچہ اس بارے میں نگاہ میں وسعت پیدا کی اور صرف خاندانی امتیاز کو قابل وقعت نہیں قرار دیا مگر اس کا قائم مقام اُس نے صفات اور اعمال کو قرار دیا اور خاندانی بلندی کے ساتھ صفات کی رفعت کا خیال ایک مستقل نصب العین بن گیا۔ رسول محض عرب ہی نہیں تھے بلکہ عرب کے روشن ترین اور معزز ترین قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نسل و نسل اخلاق کی پاکیزگی اور فیاضانہ سیرت اس خاندان کی طرۂ امتیاز تھی۔

علہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی (ایڈوکیٹ)

اس خاندانی اختصاص اور تربیت کے پہلوؤں پر غور کیجیے۔ تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی عزیز اور صاحب صفات بیٹی کے لیے موزوں تریں کفو کے کس قدر متجسس ہوں گے۔ خصوصاً وہ لڑکی جس کے ذریعہ سے اُن کی نسل دنیا میں چلنے والی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کر دی گئیں۔ رسول کی نظر غور کرتے وقت ہر مرتبہ ایک ہی آدمی پر پڑتی تھی اور وہ علی کی ذات تھی۔ آپ کہا کرتے تھے کہ میں اور علی ایک ہی نور سے ہوں اس لیے فاطمہ کے لیے اگر کوئی موزوں کفو ہو سکتا تھا تو وہ محض علی ہی اور کوئی نہیں۔

اس نسبت میں کسی تلاش، کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہ تھی اور نہ کسی بات کا خطرہ تھا ابو طالب کے احسانات اور مراعاتیں رسول کے پیش نظر تھیں۔ وہ اپنے چچا کی عنایتوں کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ علی کی بھی خدمتیں اور اسلام کی ترقی میں کارگزاریاں بالکل ظاہر تھیں اسلیے پیغمبر نے طے کر لیا اور رسمی پیغام کے بعد اپنی بیٹی علی کے عقد میں دیدی۔"

اب آپ جانتے ہیں فاطمہ کون ہیں؟ پیغمبر اسلام کی دختر اور علی کون ہیں؟ محافظ اسلام مجاہد اسلام بلکہ فدیۂ اسلام۔ ان ہی دونوں علی اور فاطمہ کے فرزند تھے حسین۔

اب کیا حسین بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟!

علہ "حسین جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے قربانی و فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی۔"

حسین نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سُنتے تو رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیم خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔

ہمارے پردادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جد بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلق خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے اس لئے اگر خلق خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے تنگ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں۔

علہ مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب

حسین کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر پتھر کھائے اور مصیبتیں اٹھائیں میرے نانا رسول اللہ نے اور پیغمبر اسلام کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابو طالب اور جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر لیٹے تھے میرے باپ علی بن ابی طالب۔ پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لیے جہاد کیا انہی میرے بابا علی بن ابی طالب نے۔ کیا ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسین یہ نہ سوچتے ہوں گے کہ اگر کبھی اسلام پر وقت پڑے اور سچائی خطرے میں آجائے تو مجھے بھی یہی کرنا چاہیے۔

بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سُنتے ہیں تو اُن میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارناموں کے کرنے کا مل جائے۔ حسین بچپنے سے ولولہ رکھتے تھے منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں کی ہمدردی کا کوئی موقع پیش آئے اور مجھے بھی اپنے خاندانی روایات کو زندہ کرنے کا موقع مل جائے۔ یقیناً ۵ ”امام حسینؑ کو وہی کرنا چاہیے تھا اور کیا جو اُن کے آبا و اجداد کر گئے تھے“

---

۵ علامہ ہندی مدظلہ

دوسرا باب

ولادت، ماحول اور اس کے اثرات، تربیت اور ابتدائی زندگی

سنہ ۴ھ	سنہ ۱۱ھ

حضرت محمد مصطفےٰ کو مکہ کی سرزمین چھوڑ کر مدینہ آئے ہوئے چوتھا برس تھا کہ حسین دنیا میں آئے۔ ؎۱ "بروایات فریقین ۳ شعبان سنہ ۴ ہجری بروز پنجشنبہ آپ کی ولادت ہوئی نوید ولادت پر حضور (پیغمبر اکرم) تشریف فرما ہوئے۔ بیٹے کو گود میں اٹھایا۔ پیار کیا۔ داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منھ میں دی۔ ساتویں دن دو بکروں کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا گیا۔ بالوں کو چاندی کے ہم وزن فرمایا۔ چاندی خیرات کردی اور ایک گوسفند کی ران قابلہ (اسماء بنت عمیس رض) کو مرحمت فرمائی (حاکم)"۔

آپ کی پیدائش سے آپ کے نانا رسول اللہ، باپ علی مرتضیٰ اور ماں فاطمہ زہرا سب کو بڑی خوشی ہوئی اور خاندان میں یہ ایک قابل شکریہ اضافہ سمجھا گیا۔

پیغمبر اسلام کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی، اب ان دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی ایک حسن دوسرے حسین اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار پایا۔ ایک طرف نانا کہ جو بانی اسلام تھے اور دوسری طرف باپ کہ جو مجاہد و محافظ اسلام تھے ان کے خدمات اور کارگزاریاں آنکھوں کے سامنے تھیں۔

؎۲ "تاجدار رسالت نے اپنے مبعوث ہوتے ہی سب سے پہلی کوشش یہ کی تھی کہ عرب کی جہالت شعار قوم کے دل سے کفر و شرک کی سیاہی دھو کر اس میں توحید کا نور بھرا جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اُن کے اخلاقی رستوں سے وہ کانٹے صاف کئے جو ایک ایک قدم

؎۱ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی ؎۲ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی۔

پر انسانیت و روحانیت کے پیروں کو لہو لہان کر رہے تھے۔ انھیں حقوق الناس کا فلسفہ سمجھا کر جائز و ناجائز میں تمیز کرائی۔ بنی نوع انسان کی مساوات پر توجہ دلاتے ہوئے معاملات میں عدل و انصاف کی ہدایت کی۔ مال غیر میں تصرف کو ناجائز قرار دیکر حقوق کی نگہداشت کے آئین تعلیم کیے۔ جنگجوئی و سفاکی سے روک کر درشت طبیعتوں میں نرمی پیدا کی۔ غرضکہ یہ اور اس قسم کی ہزار ہا باتیں تعلیم کر کے اُن کو اخلاق و عادات حسنہ کے سانچے میں ڈھال دیا۔ رحمۃ للعالمین نے صرف تعلیم ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ جو کچھ اوروں سے کرانا چاہا پہلے اُسے خود کر کے دکھلایا۔ اس طرح دنیا میں انسانیت کی جتنی خوبیاں ہیں سب آپ نے عرب میں اپنی تعلیم کے ذریعہ سے شائع کیں۔ دنیا میں ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور انسانی مشترک حقوق میں بھی تفریق قرار دیدی مگر پیغمبر نے قولی اور عملی تعلیم کے ذریعہ سے پست جماعتوں کے معیار کو اونچا کیا۔ آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن سیاہ رنگ کے حبشی بلال کو مقرر کیا جن کی آپ اتنی عزت کرتے تھے جتنی بڑے بڑے ذی عزت خاندانوں کے لوگوں کی بھی نہ کرتے ہوں گے آپ کی محبوب اور بزرگ مرتبہ بیٹی فاطمہ زہرا جن کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، اپنے گھر کا کاروبار اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں ایک مدت تک آپ کے پاس کوئی عورت گھر کے کام کاج کے لیے نہ تھی خود ہی چکی پیستی تھیں اور خود ہی جھاڑو دیتی تھیں بہت عرصہ کے بعد رسُول نے اپنی اس پیاری بیٹی کو ایک کنیز عطا کی جس کا نام فضہ تھا تو یہ ہدایت کردی کہ پورا کام برابر فضہ سے نہ لینا بلکہ ایک دن گھر کا کاروبار تم کرنا اور ایک دن فضہ سے کام لینا۔ یہ وہ مساوات کی تعلیم ہے جو تاریخ میں فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے۔ مال دنیا تو تھا نہیں۔ جو کچھ ہوتا غریب اور محتاجوں کے کام آتا۔ خود فاقوں پر فاقے کرتے مگر سائل خالی ہاتھ واپس نہ کیا جاتا۔ اکثر اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دیدیا جاتا۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو فاطمہ زہرا کی چادر یہودیوں کے یہاں گروی ہوتی اور کسی طرح غریبوں کا کام بنایا جاتا۔ مسجد میں پانچوں وقت نماز جماعت۔ پیغمبر کے بصیرت آفریں مواعظ اور خطبے مسلمانوں کا ذوق و شوق اور جوش و خروش۔ مکان میں رات دن عبادت و ذکر الٰہی کی آوازیں، فاطمہ زہرا کا یہ عالم کہ محراب عبادت میں کھڑی ہو جاتی ہیں

تو وہ روحانی مسرت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے کہ چہرہ کا رنگ چمکنے لگتا ہے۔ علی ابن ابیطالب کی یہ کیفیت کہ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں تو حیرت انگیز استغراق اور محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ عورتیں مسائل دینیہ دریافت کرنے فاطمہ کے پاس آتی ہیں۔ علی دین اور دنیا کے مہمات میں رسول کے ترجمان ہیں۔ تکبیر کی صدائیں۔ وحی کی آیتیں۔ غزوات کے تذکرے۔ اسلام کو ترقی دینے کے مشورے۔ ہر وقت یہی ذکر۔ یہی فکر۔ یہی قصے۔ یہی کہانیاں۔

۵۱ ”یہ تھا وہ نورانی اور روحانی ماحول جس میں حسین نے پرورش پائی تھی۔ بچپن سے ماں باپ اور نانا کا برتاؤ جو کچھ دیکھتے چلے آرہے تھے وہی لوح خیال پر نقش ہوتا چلا جاتا تھا اور اسی نورانی مسالے سے حسینی کیرکٹر کی عمارت بلند ہوتی چلی جاتی تھی۔ وہ اکثر دیکھتے تھے کہ ماں باپ فاقہ سے نڈھال پڑے ہیں اور نانا بھی اس حال میں ہیں مگر بیت المال کے خزانہ میں سے ایک پائی بے استحقاق اپنے صرف میں لانا گوارا نہیں کرتے۔ یہیں سے انھیں حق العباد کی نگہداشت کا سبق ملا ہوگا۔ جب دیکھتے ہونگے کہ وہ مقدس نانا جو اسلامی دنیا کا تاجدار ہے فقرائے صفہ سے برسر خاک زانو سے زانو ملائے بیٹھا ہے تو کیا مواسات و مساوات کی امنگ دل میں نہ پیدا ہوتی ہوگی۔ رات رات بھر محراب عبادت میں کھڑے ہونے سے جب رسول کے پائے اقدس کو متورم پاتے ہوں گے تو کیا عبادت کا شوق دل کو نہ گدگداتا ہوگا۔ جب فقرا و مساکین کی حالت پر ماں باپ اور نانا کو روتا پاتے ہوں گے تو غربا پروری کی تعلیم نہ ہوتی ہوگی؟ جب یہ دیکھتے ہوں گے کہ بزرگوں کو حق بات سے ہٹانے میں دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور انسانوں کی بڑی سے بڑی طاقت کامیاب نہیں ہوتی تو کیا حق کی عزت اور باطل سے نفرت دل میں نہ پیدا ہوتی ہوگی؟ الغرض یہ تھی وہ اخلاقی و روحانی تعلیم جس کی فضا میں امام حسین نے پرورش پائی تھی۔ معمولی عقل کا آدمی بھی اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ان حالات میں رہتے ہوئے حسین کے کیرکٹر میں کیسی غیر معمولی روشنی پیدا ہوگئی ہوگی۔“

۵۲ ”جس بچہ کی تربیت اور اٹھان اُن ہاتھوں میں ہو جن کا نظریہ بگڑی ہوئی عمرانی زندگی سے تصادم کا ہو اور مضر عمرانی خصائل کو سدھارنا اپنا فرض انسانی

---

۵۱ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی ۵۲ علامہ ہندی مدظلہٗ

قرار دے رکھا ہو اور اس اصلاح میں ہر مصیبت و تکلیف کے خیر مقدم کے واسطے تیار رہوں اور عملاً ان تکالیف و مصائب کے نمونے تاریخ میں چھوڑ جائیں ۔ اُس بچے کو تم سمجھ سکتے ہو کہ کس ذہنیت کا حامل ہوگا ۔ امام حسین کی پرورش و تربیت انہی ہاتھوں میں ہوئی تھی اسلیے وہ یقیناً عام عربی ماحول سے علیحدہ تھے۔" ؎ ”پیغمبر نے حسین کی تربیت صرف اس طرح نہیں کی تھی جس طرح ایک نانا ایک نواسے کی تربیت کرتا ہے بلکہ پیغمبر کی تربیت میں سب سے پہلے اور سب کے اخیر میں جو نکتہ ملحوظ تھا وہ یہ تھا کہ وہ پیغمبر ہیں اور وہ اپنے نواسے کو اپنے عقائد اور اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے تیار کر رہے ہیں۔"

پیغمبر کا مقصد قرآن کے اعلان کے مطابق کیا تھا؟ تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت۔ آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے ۔حکمت و اخلاق کے اصول کے مطابق حکمت عملی اور تربیت و تہذیب کے ترتیب وار تین درجے ہیں پہلے "تہذیب نفس" یعنی خود اپنی ذات کی تکمیل ۔دوسرے "تدبیر منزل" یعنی اپنے گھر والوں کی تعلیم و تربیت ۔تیسرا درجہ ہے "سیاست مدن" یعنی اہل ملک اور اہل قوم اور تمام دنیا کی رہنمائی ۔ ان میں سے ہر ایک درجہ عقلی طور سے دوسرے پر مبتنی ہے اگر پیغمبر اپنے گھر والوں ہی کی تعلیم و تربیت کے فرض کو نظر انداز کر دے تو اُس کے تعلیمات کا عموم خلق پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا خود حضرت محمد مصطفٰے نے اس کا عمومی اعلان کیا ہے کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی محدود حلقہ میں حکمران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے متعلقہ افراد کے متعلق جواب دہ ہے۔" پھر کیسے ممکن ہے کہ خود رسول اپنی اس ذمہ داری کا احساس نہ کریں اور اپنے متعلقہ افراد کی تعلیم و تربیت کو نظر انداز کر دیں ۔

حضرت محمد مصطفٰے کے بیٹے سب کمسنی کے عہد میں دنیا سے اٹھا لیے گئے تھے۔ آپ کی کائنات زندگی اولاد کی حیثیت سے لڑکی اور نواسوں میں منحصر تھی ۔ اس لیے آپ کی پوری کوشش تدبیر منزل کی حیثیت سے انہی اشخاص پر متمرکز ہو گئی تھی ۔ آپ ان کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا رہے تھے اور ان آئینوں میں اس طرح جلا دے رہے تھے کہ آپ کی سیرت کا پورا

؎ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری

نقشہ ان میں اتر جائے۔

اس تربیت کے انداز خاص تھے۔ رسول اپنے ان اہلبیت کی ذرا ذرا سی بات کی نگرانی کرتے تھے یہاں تک کہ بہت سی وہ باتیں جو عام اشخاص کے لیے معافی کے قابل سمجھی جاتی ہیں انھیں حضرت محمد مصطفٰےؐ اپنے اہلبیت کے لیے معاف نہ کرتے تھے اور ذرا سی بات پر بھی تنبیہ کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں اس وقت پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) حضرت محمد مصطفٰےؐ اپنی محبوب بیٹی فاطمہ زہرا کے گھر پر آتے ہیں۔ دروازہ پر ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ فوراً واپس جاتے ہیں۔ فاطمہ زہرا کو علم ہوتا ہے کہ میرے بابا تشریف لائے تھے مگر اندر نہیں آئے۔ دروازہ ہی سے واپس گئے۔ فوراً سمجھ جاتی ہیں۔ اُس پردہ کو اتارتی ہیں اور پھر وہی معمولی پُرانا بوسیدہ پردہ دروازہ پر ڈال دیتی ہیں اب رسول دوسرے وقت تشریف لاتے ہیں اور بیٹی سے ملاقات فرماتے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ قیمتی پردہ دروازہ پر آویزاں کرنا اسلامی شریعت کے خلاف بات نہیں ہے مگر پیغمبرؐ اپنے اہلبیت کے معیار زندگی کو ایک مثالیہ درجہ پر قرار دینا چاہتے تھے۔ آپ اُن کے لیے اتنے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

(۲) ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سیدۂ عالم نے اپنے لیے ایک گردن بند اور دو گوشوارے سونے کے بنوائے پیغمبر تشریف لائے ان زیوروں پر نظر پڑی تو کبیدہ خاطر ہو کر بیٹی کے پاس سے چلے گئے۔ سیدہ مزاج نبوت سے واقف تھیں۔ فوراً سمجھ گئیں۔ گردن بند کو رسول کی خدمت میں بھجوایا اور کہا کہ اسے راہ خدا میں دیدیجیے۔ رسول اللہ بہت خوش ہوے اور تین مرتبہ فرمایا فعلت فداھا ابوھا جو میں چاہتا تھا وہی کیا۔ میری جان اس پر فدا ہو جائے" اس کے بعد فرمایا کہ دنیا کا حاصل کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ مجھے نہیں منظور کہ میرے اہلبیت لذائذ دنیا سے فائدہ اٹھائیں۔ (صواعق محرقہ صد ۱۰۹)

(۳) ایک عرصہ تک فاطمہ زہرا کے پاس گھر کے کاروبار کے لیے کوئی خادمہ نہ تھی۔ ایک مرتبہ مال غنیمت میں کچھ کنیزیں آئیں حضرت علی نے فاطمہ کو مشورہ دیا کہ تم جا کر اپنے باپ کے پاس اس مال غنیمت میں سے ایک کنیز طلب کرو۔ فاطمہ رسول کی خدمت میں حاضر ہوئیں

اپنا حال پیش کیا کہ جھاڑو دیتے دیتے چکی پیستے پیستے کس طرح لباس میلا ہو گیا ہے اور ہاتھ زخمی ہو گئے ہیں۔ خواہش کی کہ ایک کنیز اس مال غنیمت میں سے مجھے مرحمت فرمائیے۔ یہ خواہش سیدہ کی کوئی غیر مشروع بات نہ تھی نہ رسول کو اس کے پورا کرنے میں کوئی امر مانع تھا مگر پیغمبر کو تو اپنی بیٹی کی اخلاقی تربیت مقصود تھی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے بیٹی کنیز لو گی یا تمھیں ایک تسبیح ایسی تعلیم کر دوں جس کا خدا کی بارگاہ میں بڑا مرتبہ ہے؟ سیدہ کی ذہنیت اور مذاق طبیعت کا امتحان تھا۔ مادی آرام اور اخروی فائدہ کا موازنہ تھا۔ سیدہ نے فوراً دوسرے پہلو کو اختیار کیا عرض کیا مجھے تسبیح تعلیم کر دیجیے میرے لیے بہتر ہے رسول نے سیدہ کو وہ ورد تعلیم کیا جو تسبیح فاطمہ زہرا کے نام سے مشہور رہے۔

ان واقعات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبر اپنے اہلبیت کی سیرت زندگی کی کس اعلیٰ معیار پر تشکیل فرما رہے تھے۔

بیٹی کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے میں رسول اللہ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ سیدہ طبقہ خواتین کے لیے ایک اعلیٰ مثال بن گئیں اور اسی اعتبار سے رسول نے ان کی نسبت ارشاد کیا کہ سیدۃ نساء اہل الجنۃ یعنی بہشت کی عورتوں کی سردار۔ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ بہشت اسلامی تعلیم کے مطابق صرف اچھے اعمال کا نتیجہ ہے فاطمہ کو اہل بہشت کی سردار کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ فاطمہ اُن اعمال و افعال میں جو بہشت کے حصول کا ذریعہ ہیں تمام خلق کی عورتوں کی پیشوا، رہنما اور سردار ہیں۔

اب اس بیٹی کے ذریعہ سے قدرت نے رسول کی آغوش میں دو بیٹے عطا کیے ایک حسن اور دوسرے حسین تو کیا ممکن ہے کہ رسول ان کی تعلیم و تربیت میں اُس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معلم اخلاق کے، بحیثیت بزرگ خانداں کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا؟ ہرگز نہیں۔

آپ نے بچپنے ہی سے ان بچوں کی تعلیم و تربیت ہر طرح سے اپنے ذمہ لی اور رات اور دن، تنہائی میں اور لوگوں کے مجمع میں یہاں تک کہ عبادت کے عالم میں اور خطبہ کی حالت میں بھی ان کو اپنے پاس رکھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کو ٹوکا روکا اور ان کی تربیت اُس

تو کہدو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو باؤ اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر خدا کی طرف رجوع کریں اور اُس کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر" نصاریٰ اس پر راضی ہوگئے۔ دوسرے دن نبی چلے اس صورت سے کہ حسین گود میں ہیں حسن نانا کی اُنگلی پکڑے ہوئے چل رہے ہیں۔ پشت پر جناب فاطمہ ہیں اور آخر میں علی ہیں۔ نجران والے یہ منظر دیکھکر مرعوب ہوگئے اور کچھ شرائط کے ساتھ صلح پر آمادہ ہوگئے یعنی یہ کہ نصاریٰ معینہ خراج ہر سال دیتے رہیں گے اور اُس کے عوض میں رسول اُن کو اُنہی کے مذہب پر قائم رہنے دیں۔ رسول نے اسے منظور کرلیا"۔

کھُلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبر اس مہم کے لیے تنہا جاسکتے تھے اور جو کچھ بھی اس مہم کا مقصد تھا وہ تنہا آپ کی ذات سے حاصل ہوسکتا تھا۔ آپ کی دعا کی قبولیت خدا کی بارگاہ میں آمین کی محتاج نہیں تھی پھر رسول اللہ اپنے ساتھ ان اہلبیت کو لے گئے کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک تعلیم و تربیت کا انداز تھا۔ وہ ابھی سے ان اپنے خاندان والوں کے کاندھوں پر ذمہ داری کا بار ڈال رہے تھے۔ وہ ان کو اپنے کار رسالت کی تکمیل میں عملی طور پر شریک کر رہے تھے اور گویا اُن کو بتلا رہے تھے کہ دیکھو اگر حفاظت اسلام کی ضرورت ہو تو مجھے تم ہی سے اُمید ہوسکتی ہے میرے اس مشن کی تکمیل سب سے پہلے تمہارا ہی فرض ہے۔ وہ گویا ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کے کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں میں نہ موجود ہوں تو تم اسی طرح حفاظت اسلام کے لیے نکل کھڑے ہونا جس طرح میں نکلا ہوں۔ پیغمبر نے اپنے اس عمل سے صاف واضح کردیا کہ اسلام کے مفاد کی خدمت کے لیے آپ اپنے مرد، عورت۔ جوان، بچہ کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتے اور وقت آنے پر ہر ایک کو اس کام میں لگا دینے پر تیار ہیں۔ بے شک اس سے خاندان کی ہر فرد کو ایک احساس پیدا ہوا اور وہ احساس قائم رہا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ان میں سے جتنا کوئی بچہ کمسن تھا اُسی کا لانا اس روحانی مقابلہ میں عام فطری معمول کے خلاف تھا اور اس لیے ضرورت پر مبنی تھا۔ شاید یہ قدرت کا انتظام اس مستقبل کی تمہید تھا کہ جو ان میں سب سے کمسن ہے اُسی کو عملی طور پر اس سبق کے دُہرانے کا موقع ملے گا جسے پیغمبر نے آج پیش کیا ہے۔ وہ سب سے کمسن بچہ جو اس یادگار موقع پر

معیار پر شروع کی جس معیار پر وہ اپنے اہلبیت کو پہونچانا چاہتے تھے۔ اس کا نمونہ علامہ ابن حجر مکی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ کسی جگہ سے تصدق کے خرمے رسول کی خدمت میں آئے۔ اس وقت حسن آپ کی گود میں بیٹھے تھے بچہ نے ایک خرما اُٹھا کر اپنے مُنھ میں رکھ لیا۔ رسول اللہ نے انگلی سے خرما حسن کے منھ سے نکال کر پھینکا اور فرمایا "تھو کو تھو کو! صدقہ ہم پر حرام ہے۔"

شرع کا قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کمسنی کے عالم میں فرائض کی پابندیاں بچہ پر عائد نہیں ہیں مگر رسول اپنے بچوں کی عملی تربیت کے ذمہ دار تھے اُنھوں نے اس بارے میں فروگذاشت جائز نہیں سمجھی۔

حسین بھی اسی آغوش میں پل رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے نانا کے طرزِ عمل کو، فرائض کے بارے میں آپ کے اہتمام کو اور اسلام کے متعلق آپ کے انہاک کو غور سے دیکھا اور خوب اندازہ کر لیا کہ رسول اللہ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنی اسلام اور اُس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبر تیار ہوں گے کہ ہم کو اُس پر نثار کر دیں۔ ایک موقع آگیا ایسا جہاں پیغمبر نے عملی طور پر اس کو دکھلا دیا

ع۵ "واقعہ یوں ہے کہ ۱۰ھ میں رسول نے نجران کے نصاریٰ کو مدعو کیا تاکہ وہ اسلام قبول کریں اُنھوں نے اپنے چودہ آدمیوں کو رسول کا امتحان لینے کیلئے بھیجا۔ پہلا سوال رسول سے جناب عیسیٰ کے متعلق پوچھا گیا۔ قرآنی وحی نے اس کا جواب یوں دیا "یقیناً خدا کے نزدیک عیسیٰ کی مثال حضرت آدم کی سی ہے اُس نے اُن کو مٹی سے بنایا اور کہا ہو جا۔ اور وہ ہو گئے، یہ سچ ہے تمھارے خدا کی طرف سے لہٰذا شک و شبہ میں نہ پڑو۔" آخر میں جب بات بہت بڑھی اور نصاریٰ کا وفد دلائل کے ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوا تو پیغمبر کی جانب سے روحانی مقابلہ کی دعوت دی گئی۔ وہ روحانی مقابلہ جس کا نام ہے "مباہلہ"۔ قرآن میں اُس کی ہدایت پیغمبر کو مخاطب کر کے اس طرح ہوئی ہے:-

فمن حاجّك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا و ابناءكم و نساءنا و نساءكم و انفسنا و انفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين (یعنی) "اگر یہ لوگ تم سے اُلجھتے رہیں بعد ایسے یقینی دلائل کے جو پیش ہو چکے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

لایا گیا تھا کون تھا؟ وہ حسین تھے جن کی عمر اس وقت چار یا پانچ سال سے زیادہ نہ تھی جن کو رسول اپنی گود میں لے کر میدانِ مباہلہ میں آئے تھے۔ بے شک حسین نے سمجھا اور یاد رکھا کہ نانا نے آج کون سی مثال قائم کی ہے۔ وہ منتظر ہو گئے اور برابر منتظر رہے کہ کب وہ وقت آتا ہے جب اسلام کی حفاظت کیلیے مجھے اپنے جوانوں، بچوں اور عورتوں کو سب کو لے کر میدانِ جہاد میں آجانا پڑیگا

حضرت محمد مصطفےٰ سے بڑھ کر کوئی شخص جوہر شناس نہیں تھا انھوں نے اپنے اہلبیت میں سے ہر ایک کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا اور سمجھ لیا کہ آپ کے تعلیمات کی حفاظت ان کے ذریعہ سے ہوگی اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی اُمت کو ہدایت کی کہ میرے اہلبیت کی پیروی کرتے رہنا کبھی فرمایا کہ "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہلبیت" کبھی فرمایا کہ "میرے اہل بیت کی مثالی کشتی نوح کی سی ہے جو اس کشتی پر سوار ہوا اُس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا" اس ذیل میں آپنے اپنے دونوں نواسوں حسن اور حسین کی خط پیشانی میں اُن کے مستقبل کی تحریریں بھی پڑھ لیں۔ آپنے یہ محسوس کر لیا کہ ان بچوں میں اس چھوٹے سے سن میں میری تعلیمات کا انعکاس کس شدت وقوت کے ساتھ ہے اس لیے آپ ان سے انتہائی محبت رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی محبت کی تاکید کرتے تھے اور خدا کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں (دیکھیے صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ۱۱۲ و ۱۱۵ روایات احمد بن حنبل، بخاری، ترمذی، ابن حبان، ابن ماجہ، حاکم وغیرہ)

اس کے علاوہ آپنے ان کے بارے میں مختلف حدیثیں ارشاد فرمائیں جن میں سے کچھ دونوں بھائیوں کے بارے میں مشترک طور پر ہیں اور کچھ حسین کے ساتھ مخصوص ہیں۔

؎ "قدیم علماء میں بہت سے محدثین نے ان کلمات کو جمع کیا ہے جو صاحب وحی نے حسین کے بارے میں مختلف اوقات میں استعمال کیے تھے۔ احمد بن حنبل وغیرہ کی کتابیں ہم کو ضرور اس موضوع میں مدد دینگی۔ ہمارے معاصرین میں بھی ایک مغربی محدث استاذ سید احمد الصدیق الحسنی نے ایک رسالہ فضائل حسین میں لکھا ہے"

؎ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری

دونوں بھائیوں میں مشترک حدیثوں میں سے ایک یہ ہے کہ فرمایا پیغمبرؐ نے "حسنؑ و حسینؑ جوانانِ اہلِ بہشت کے سردار ہیں"۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہوگا کہ ان کے طرزِ عمل کی پیروی ہی رضائے الٰہی کی باعث ہو سکتی ہے، وہ رضائے الٰہی جو بہشت کی اصلی دولت ہے۔ اور خاص حسینؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ یعنی میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔

۵ "اگر آپ علم نفسیات جاننے والے سے پوچھیں گے کہ بچپن میں ذہنیت کس طرح سے بنتی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سات برس کی عمر ایسے نقش لے لیتی ہے۔ ایسی باتوں کو سمجھ لیتی ہے اور ایسی باتوں کو صاف دیکھ لیتی ہے جو عام طور سے جوان نہیں دیکھتے۔ سات برس کے بنے ہوئے نقش مرتے وقت تک قائم رہتے ہیں۔ رسول اللہ نے پورے اعتماد سے یہ کہا ہوگا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں حسینؑ ان الفاظ کو نہیں بھولے۔ موقع کے منتظر تھے کہ کون سا وقت آئے گا کہ میں رسول اللہ کی اس بات پر عمل کر سکوں کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ رسول اللہ کتنا بھروسا رکھتے تھے حسینؑ پر۔ سات برس کے بچے کے لیے یہ کیسی معمولی جذبات اور معمولی دماغ کا نتیجہ نہیں تھا۔ رسول اللہ اس بچہ میں وہ عادتیں دیکھ رہے تھے جو آگے بڑھ کر اُس کو دنیا کی نجات دہندہ بنانے والی تھیں۔ اس علم کے ساتھ رسول نے کہا تھا کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"، جس کے کانوں میں یہ آواز پہونچا دی گئی تھی وہ کیسے بھول سکتا تھا"۔

حسینؑ سات برس کے قریب اس لطف و محبت، خوشی اور دلجوئی کی بے پایاں فضا اور اس روحانی ماحول و تربیت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ربیع الاول ۱۱ھ کے شروع میں حضرت محمد مصطفےٰ کی وفات ہوئی اور حسینؑ اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہوگئے۔

---

۵ سید احتشام حسین صاحب مانلی ایم۔اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔

تیسرا باب

امام حسین کی زندگی کا دوسرا دور۔ نانا کی وفات کے بعد، باپ کی تربیت اور صحبت اس زمانہ کے اہم واقعات، تجربات اور نفسانی اثرات

سنہ ۱۱ھ	سنہ ۴۰ھ

حضرت رسول کی وفات تمام خاندان کے لیے ایک بڑا روح فرسا حادثہ تھی۔ وہ انسان کامل وہ تھا جس کے اخلاق و اوصاف نے دوست اور دشمن کے دل کو مسخر کر لیا تھا اس لیے اُسکے دنیا سے اُٹھ جانے کا احساس ہر فرد بشر کو موجود تھا اور اسلامی گروہ کی ہر فرد جتنا تعلق پیغمبر سے رکھتی تھی اُس اعتبار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہی تھی تاریخیں تو یہاں تک بتلاتی ہیں کہ بعض آدمی آپ کے حادثۂ وفات سے دیوانے ہو گئے، بعض شہر سے نکل گئے اور بعض بیمار ہو گئے۔ ایسی بیماری جس نے اُنھیں قبر تک پہونچا دیا۔

پھر جب غیروں کا یہ عالم تھا تو رسول کے اہلبیت کے غم و الم کا اندازہ کہاں کیا جاسکتا ہے خصوصاً حسین جنکے ساتھ پیغمبر کی شفقت کا انداز ہی ایک نرالا تھا۔ وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا۔ سینہ پر لٹاتا تھا اور کاندھے پر چڑھاتا تھا۔ جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسین کی گوارا نہ کرتا تھا آج حسین آنکھیں پھرا پھرا کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبر کی ان غیر معمولی محبتوں کو دیکھکر، نیز آپ کے ان متواتر اعلانات کی وجہ سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اُسے حسین سے محبت کرنا چاہیے، عام مسلمان

جو بھی رسول کے ساتھ عقیدت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور اُن کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبر کے ان فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیازمندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبر کی تیوریوں پر بل دکھائی دینے لگتے تھے۔ ایک کھلا ہوا ثبوت اس کا اُس واقعہ سے ملتا ہے جب رسول اپنے اس بچہ کو کاندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور ایک صحابی نے یہ کہدیا کہ " اے حسین کتنا اچھا مرکب ہے تمھارا" رسول نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا " یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے؟ " یہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخورر کھنے والے مُسلمان یا آپ کے چشم وابرو پر چلنے والے نیازمند حسین کی خاطرداری اور ان کے ساتھ اظہار محبت میں ذرا بھی فروگذاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسین ایک چراغ تھے جس کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکر لگاتے تھے عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی اور محبت کا ایک آسمان تھا جو اُن کے سر پر سایہ فگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہتی۔ وہ انقلابات کا مجموعہ ہے۔ آج وہ مرکز جس کی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوئے تھی قبر میں پہونچ چکا تھا۔ وہ ایک کیا گیا کہ حسین کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہو گیا جس کے حسین خوگر ہو گئے تھے۔ صبح ہوئی اور رسول نے دروازہ پہ آکر آواز دی " انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا " اے اہل بیت محمدؐ نماز کا وقت آگیا۔ سب فوراً اٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسین نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہونچے مُسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبر نے نماز پڑھائی۔ ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبر کے خطبے۔ شریعت اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفرا کا ورود۔ مختلف جماعتوں کی جنگی سرگرمیوں کا تذکرہ۔ اور اُس کے ساتھ مدافعتی انتظامات دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزائیں۔ زکوٰۃ وخمس اور اموال غنیمت کا آنا اور مقررہ اصول وقواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اُس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے

حسین اپنے نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور آنکھ کھول کر اسی عالم سے روشناس ہوئے تھے اور سات برس تک اسی کے عادی رہے تھے۔ اب پیغمبر کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ انقلاب اور عظیم الشان انقلاب۔ پھر سیاسی اقتدار کے خاندان سے ہٹ جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکار رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے سے تبدیل ہو گئی اور وہ ماحول جس میں حسین زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ اب کیا تھا؟ نمازوں کا وقت آتا تھا مگر دروازہ پر نانا کی صدا نہ آتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ بلال کی اذان کی آواز تک جس کے سننے کے عادی ہو چکے تھے اب کانوں میں نہ آتی تھی کیونکہ پیغمبر کے بعد بلال نے عہد کر لیا کہ اب میں کسی کے لیے اذان نہ کہوں گا۔ وہ مدینہ چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ حسین دوڑ کر ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوائے اوقات نماز کے ہر وقت اُن کا رونے کا مشغلہ ہے۔ کچھ دن تک تو گھر پر رویا کرتی تھیں۔ پھر اس خیال سے کہ اہل محلہ کو میرے رونے کی آواز سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ جنۃ البقیع میں چلی جاتی تھیں اور اُس قبرستان میں باپ کے غم میں گریہ کرتی رہتی تھیں۔ حسین باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے کہ انھوں نے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک گوشے میں بیٹھے قرآن کے متفرق اجزا کو جمع کرتے رہتے ہیں اور کوئی پوچھتا ہے تو فرماتے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن کو اُس کی اصلی ترتیب اور شان نزول کے مطابق جمع نہ کر لوں۔ کیا اس صورت حال کو دیکھ کر حسین کا دل نہ گھٹتا ہوگا؟ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیا اندھیر ہے جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہر حال اپنے باپ کے طرز عمل سے اس وقت اُنھوں نے یہ سبق حاصل کر لیا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناساز گار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حسین نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجیے جو آپ کا واقعی حق ہے۔ اُٹھیے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں۔ اور نمائشی بھی۔

ایک طرف رسول کے چچا عباس بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ میں تمھاری بیعت کر لوں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑیگا اور وہ کہیں گے کہ پیغمبر کے چچا نے اُن کے ابن عم کی بیعت کر لی پھر کسی کو عذر نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابو سفیان بن حرب ہے اور وہ آکر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے دوسرے خاندان نے غلبہ حاصل کر لیا خدا کی قسم میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار و پیادہ سے بھر دوں گا۔ مگر وہ جذبات سے بلند، وہ خود غرضی کے لوث سے پاک، وہ اسلام کا سچا محافظ اور فرض شناس انسان ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آتا۔ وہ ابو سفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیتا ہے کہ وہ خدا کی قسم تو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کا دشمن رہا ہے۔ حسین کو اس سے بھی یہ سبق ملا اور بہت قوت کے ساتھ ملا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں، ہمارے ذاتی مفاد کو نقصان پہونچے مگر ہم کو ہمیشہ اسلام کے مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اسی کے ساتھ ایک یہ بات بھی دماغ کے کسی زاویہ میں جاگزیں ہو گئی کہ ابو سفیان اور اس کے خاندان کے لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان رسانی کا اندیشہ موجود ہے۔ یہ بھی چاہے اس وقت اور چاہے اس کے بعد کبھی جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہو آپ نے غور کیا ہوگا کہ اسلام کو اُس کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں اُتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہونچ سکتا ہے۔ مثال میں یہی واقعہ ہے کہ اگر اس وقت ابو سفیان کا منتر کارگر ہو گیا ہوتا اور علی بن ابیطالب اُس کی امداد پر بھروسہ کر کے کھڑے ہو جاتے تو اسلام آج ہی اُس ہولناک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا جس کی آندھیوں سے اُس کا چراغ جھلملا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا۔ حسین نے یہ بھی آج ہی کے واقعہ سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہمیں اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے اور کوئی ایسا موقع نہ آنے دینا چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

افسوس ہے کہ رسول کے بعد چند ہی مہینوں کے بعد موت کے ہاتھوں نے حسین سے اُن کی ماں کو بھی چھین لیا۔ فاطمہ زہرا کی وفات سے علی بن ابیطالب اور بھی زیادہ دل شکستہ ہو گئے اور حسن و حسین کی ناز برداریوں کا مرکز بالکل ختم ہو گیا۔ مہر و محبّت کی دنیا ان کے لیے ویران

نظر آرہی تھی اس لیے کہ وہ ماں بھی جوان کے آرام کے لیے اپنی تکلیف بھول جاتی تھی اب جدا ہو چکی تھی۔ اب ان کے لیے مدرسۂ تعلیم اور گہوارۂ تربیت صرف ایک تھا اور وہ بزرگ مرتبہ باپ کی ذات۔ سات برس کی عمر کے بعد سے بلوغ کے زمانہ تک اور بلوغ کے زمانہ سے کامل جوانی کی انتہا تک وہ وسیع اور طولانی مدت ہے جس میں حسین اپنے باپ علی ایسے حکیم الٰہی اور عالم ربانی اور معلم اخلاق انسانی اور مجموعۂ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ یاب ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس وقت سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں اور نوجوانی کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہو کر اُس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے حسین کے لیے ان تمام منازل کی تکمیل علی بن ابیطالب کی نگرانی میں ہوئی۔ اُس حالت میں کہ جب اُن کے لیے سیاسی مشاغل بھی نہ تھے کہ جو اُن کی توجہ کو تقسیم کرسکتے گویا اُن کے آفتاب تربیت کی کرنیں خط نصف النہار سے اپنے فرزندوں پر بالکل سیدھی پڑ رہی تھیں اور اُس سے جتنی بھی روشنی ان کے شفاف اور آئینہ آسا ضمیر میں پیدا ہوئی ہو کم ہے۔

حسین نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علی بن ابیطالب باوجودیکہ زمانہ کی سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں، کسی مہم کے متعلق مشورہ میں، کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اُن کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور اُن سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا عذر امداد دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام جذباتی انسانوں کے رویہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے امیدوار ہوں محروم کر دیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے اور اگر اُس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مدد طلب کی جائے تو وہ اپنی سابقہ رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دیں گے۔ حسین نے اپنے باپ کے طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کر دیے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد اور مسلمانوں کو حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو فوراً ہمیں اس موقع پر اپنے فرض کو انجام دینا چاہیے اور

اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا زمانہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مسلمانوں کے فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اسلامی مملکت فارس اور روم کی شہنشاہیتوں کو شکست دے چکی تھی۔ بہت سے مورخین کا یہ بیان ہے کہ اس دور میں یزدجرد بادشاہ عجم کی بیٹیاں اسیر ہو کر دارالخلافت میں لائی گئیں۔ یہ منظر حسین ایسے گوش و ہوش رکھنے والے انسان کے لیے بڑا عبرتناک تھا سلطنت دنیا کی بے ثباتی اور عالم کے انقلاب کا یہ ایسا موقع تھا جو ہر ذی حس انسان کو متاثر بنا سکتا تھا حسین اس سے صرف متاثر نہیں ہوئے بلکہ اُن میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اُس وقت جبکہ غنیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کنیزی میں لے لیں۔ علی ایسے سردار عرب اور سردار قریش کا عالی دماغ شاہزادہ یہ چاہتا تھا کہ انھیں لونڈی نہ بنایا جائے بلکہ عجم کے ملک کی شاہزادی کو عرب کی شاہزادی بننے کی عزت دیدی جائے اور اُسے خاندان رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ شاہزادی جس کا نام شہربانو یا شاہ زناں مشہور ہے حسین کے عقد میں آئی اور اس طرح حسین نے اپنے نانا کی اُس تعلیم کو زندہ رکھا جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔ تیسری خلافت کے موقع پہ یہ وقت ایسا آیا کہ علی ابن ابیطالب اس اسلامی جاہ و جلال والی حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو اُن میں منحصر کر دیا تھا مگر حسین نے دیکھا اور پورے طور پر اس سے سبق حاصل کیا کہ اُن کے بلند ہمت اور مستغنی باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دیدیا صرف اتنی سی بات پر کہ وہ کتاب اور سُنت کے علاوہ کسی دوسری چیز پہ بیعت لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ ایک بڑے اصول اور نظریہ کا سنگ بنیاد تھا اور وہ یہ کہ وہ حکام اسلام کی سیرت کو اُس حد تک قابل قبول مانتے تھے جس حد تک وہ کتاب اور سنت کے مطابق ہو۔ کتاب اور سنت کے آگے کسی خلیفہ کی سُنت پر عمل کی شرط کو وہ منظور نہیں کرتے تھے۔ اس طرح یہ خلافت کا ہما جو اُن کے سر ہمایوں پہ چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے اُن سے علحدہ ہو گیا حسین نے اس سے سبق حاصل کیا اور بڑا نتیجہ نکالا جس پر اُن کے آئندہ تمام اقدامات کی بنیاد قائم ہوئی اور وہ یہ کہ شریعت اور حکام اسلام کی سیرتیں دو الگ الگ چیزیں ہیں

حکومت وقت کا آئین اور اُس کا عمل عین شریعت نہیں ہے بلکہ شریعت کو مقتدا ہونا چاہیئے اور حکومت کے عمل کو اُس کا ماتحت ہونا چاہیے۔ جب ایسا نہ ہو تو ایک مُسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے۔ اس طرح اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف ہو اور آئین شریعت میں تبدیلی کا باعث ہو تو مُسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اپنی امکانی طاقت سے اُس کے تحفظ میں کوشش کرے۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں حسین اپنے والد بزرگوار حضرت علی کی معیت میں مکہ معظمہ کے حج کی طرف متوجہ ہوئے مگر آپ سقیا اور عرج کے درمیان میں تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبداللہ بن جعفر آپ کو اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علی کو بھی خبر دی گئی۔ آپ اسماء بنت عمیس کو لے کر تشریف لائے۔ تقریباً بیس ۲۰ دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیس ۴۰ دن تک تیمارداری ہوتی رہی تب آپ صحیح و سالم ہو کر مدینہ واپس آئے۔ (جامع البیان طبری ج ۲ ص ۱۴۰)

حضرت عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گزرا۔ مُسلمانوں کو شکایتیں پیدا ہوئیں اور وہ شکایتیں شورش کی حد تک پہونچیں۔ حسین نے دیکھا کہ اُن کے باپ علی بن ابیطالب نے ان شورشوں کو بڑھانے کے بجائے جو خود غرض آدمی کا شیوہ ہونا چاہیے پوری کوشش کے ساتھ ان کے فرو کرنے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کرائی اور مخالف جماعت کو سمجھا بجھا کر منتشر کیا مگر مروان کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر باغیوں نے خلیفۂ وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت بھی حضرت علی بن ابیطالب نے یہ ہمدردی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے تو آپنے حسن اور حسین اپنے ان ہی دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصر حکومت کے اندر پہونچوا دیا۔ اس سے حسین کو بہت سے سبق حاصل ہوئے۔ ایک ۱ یہ کہ ہم امن و امان کے محافظ ہیں۔ ہم کو کبھی شورش انگیزیوں میں حصہ لینا نہیں چاہیے بلکہ ہم کو جہاں تک ممکن ہو ایسی صورتیں پیدا کرنا چاہئیں کہ امن عامہ کو صدمہ نہ پہونچے۔ دوسرے ۲ یہ کہ مفاد عامہ کے تحفظ میں اپنی ذاتی رنجشوں اور شخصی فائدوں کا کوئی لحاظ نہیں کرنا چاہیے تیسرے ۳ یہ کہ مصیبت کے وقت

ہر ایک کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیے اور جہاں تک اپنے سے ممکن ہو اُس کی امداد کرنا چاہیے۔ بالخصوص پانی کی تکلیف میں کسی کا مبتلا ہونا ہرگز برداشت نہ کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ نظم حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور شورش کا پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ باغیوں کی جماعت نے دارالحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین کر دیا اور اُن کی شمع حیات کو خاموش کر دیا۔ عبرت کی بات ہے کہ اتنی بڑی اسلامی سلطنت کا مُسلّم الثبوت فرماں روا خود اپنے دارالسلطنت میں مٹھی بھر پردیسی باغیوں کی جماعت میں محصور رہا اور آخر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اُس دارالسلطنت کے لوگوں میں جو پیغمبر کا دارالہجرت تھا اور مُسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہل حلّ و عقد خلیفہ گری کے کام کا اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی جوش مقاومت پیدا نہ ہوا اس سے زیادہ عبرت کی یہ بات ہے کہ اُس عظیم المرتبت خلیفۃ المسلمین کی لاش دو دن تک بے گور و کفن رہی اور بلوائیوں کے ڈر سے کسی کو دفن کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر میں بڑی بیکسی کے ساتھ مُسلمانوں کے قبرستان سے الگ خاموشی سے دفن کیے گئے۔

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان اور وہ بھی حسین کا ایسا بلند دماغ رکھنے والا کس قدر اہم نتائج اخذ کر سکتا تھا؟ سلطنت دنیا کی بے ثباتی۔ جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد۔ مدینہ کے لوگوں کی بے حسی۔ اسلامی مرکزیت کا کمزور ہو جانا اور مُسلمانوں میں نفسانیت اور خود غرضی کا دور دورہ نیز مروان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں مُسلمانوں کے سینہ پر اس گھاؤ کا لگنا اور اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسین نے دیکھا اور ان میں سے ہر ایک بات کو یاد رکھا اس طرح کہ اپنی آیندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کے لیے آپ کو مُستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب میں بہت سے مُسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علی بن ابیطالب کے چہرہ پر جم گئیں۔ اُنھوں نے آپ کے پاس آ کر خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی خواہش کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی اور اب اس وقت حسین کوئی بچہ نہ تھے کہ حالات کو سرسری نگاہ سے دیکھتے بلکہ وہ ۳۲ برس کے کامل انسان تھے

اور یقیناً معاملات پر رائے قائم کرنے میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تقریباً برابر کے حصہ دار تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کے والد بزرگوار کوشش کے ساتھ اس موقع کو ٹال دینا چاہتے ہیں باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ اُن کو خلق خدا کی ہدایت اور اُن کے نظم ونسق کی درستی کے ذمہ دار بننے کی ایک تڑپ رہی ہے اور وہ اس بارے میں اپنی اہلیت وصلاحیت اور استحقاق کا اعلان کرتے رہے ہیں لیکن آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو وہ مسترد کر رہے ہیں اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہیں حسین نے ممکن ہے باپ سے دریافت کیا ہو یا نہ دریافت کیا ہو اور خود سے سمجھ گئے ہوں کہ اس کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت عمال حکومت کے رویہ کی بدولت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویۂ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی اسلامی حکومت بہت حد تک دنیاوی اقتدار سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت وقیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اُس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبر اسلام نے دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر علی بن ابیطالب قائم تھے۔ اس لیے وہ خوب جانتے تھے کہ اگر میں اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ ساز کر کے ہوا کے رُخ پر چلنا پڑیگا اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ ستیز کروں گا بیشک اگر میں ذمہ داری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت میں خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا دور ناکامیاب سمجھا جائے گا۔ آپ نے پورا انکار کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصرار انتہائی حدود تک پہونچا ہوا تھا اور وہ اتمام حجت کی صورت اختیار کر گیا تھا یعنی علی بن ابیطالب پر یہ ذمہ داری عائد کی جا رہی تھی کہ دنیا آپ سے ہدایت واصلاح کی طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں ایک داعی حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلق خدا پر بے اعتمادی کی آڑ پکڑ کر اُن کی خواہشوں کو ٹھکرا دے اور اُن کی ہدایت کی ذمہ داری کو پورا کر کے اُن پر حجت کو تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علی بن ابیطالب کو اس ذمہ داری کو قبول فرمانا پڑا۔ بے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو جب تم ذمہ داری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اُسی پر تمھیں چلاؤنگا اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پرواہ نہ کروں گا۔ لوگوں نے اس کا اقرار کر کے علی بن ابیطالب

کی بیعت کی اور آپ خلیفۃ المسلمین قرار پا گئے۔ اس سے حسین کو ایک طرف یہ درس ملا کہ دنیا کی فضا اب ہمارے حکومت و اقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس طرح ملک گیری اور حصول اقتدار کا جذبہ اگر ہوتا بھی تو دل سے دور ہو گیا۔ دوسری طرف یہ تعلیم حاصل ہوئی کہ اگر خدا کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ ہم سے رہنمائی کے طالب ہوں تو چاہے ہمیں ان کی سچائی پر کتنا ہی شبہہ یا بے اعتمادی ہو اور چاہے ہمیں اس کے نتیجہ کے ناسازگار ہونے کا پورا پورا اندازہ ہو مگر ہمارا فرض یہ ہے کہ اتمام حجت کی خاطر ہم اُن کے عہد و پیمان کو باور کریں اور ان کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔ انتظار کیجیے اُس وقت کا جب حسین حرف بحرف اپنے باپ سے حاصل کی ہوئی اس تعلیم پر عمل کریں گے۔

خلافت کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد ہی ہوا جس کو حضرت علی ابن ابیطالب سمجھے ہوئے تھے۔ وہی ہوا کہ دنیا آپ کے احکام کی پابندی اور آپ کے تعلیمات کی پیروی کے قابل ثابت نہیں ہوئی۔ آپ کی مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ آپ کے خلاف قتل خلیفہ کا غلط الزام تراشا گیا اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔ سب سے پہلے طلحہ اور زبیر نے ام المومنین عائشہ کو آمادہ کر کے جمل کے معرکہ میں صف آرائی کی۔ وہ لوگ جو پچیس ۲۵ برس تک حضرت علی کو میدان جنگ سے بالکل الگ تھلگ خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے انھیں یقین ہو گا کہ حضرت علی کسی نہ کسی طرح معاملہ کو رفع دفع کر دینگے اور جنگ کی نوبت نہ آئے گی مگر دنیا نے دیکھا اور حسین نے خصوصیت کے ساتھ دیکھا کہ وہی علی بن ابیطالب جو اپنی تلوار کو نیام میں رکھ چکے تھے اتنے طویل زمانہ تک کہ جس میں آپ کی جوانی گزر کے بڑھاپا آ گیا تھا۔ آج ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہونے کے بعد آئین و اصول کی حفاظت کے لیے ذرا بھی فریق مخالف کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں اور ضرور انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ فریق اپنی کجرفتاری کو چھوڑ کر صحیح راستے پر آ جائے مگر جب وہ اپنے غلط راستے سے نہیں ہٹتا تو وہی تلوار جو بدر۔ احد۔ خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی جمل کے میدان میں چمکنے لگتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہاتھ ہے اور وہی ہاتھ کی صفائی ہے۔ وہی دل ہے اور وہی دل کی طاقت ہے۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق مخالف کی شکست پر ختم ہوتا ہے

علی بن ابیطالب اپنے مخالف فریق کی سردار حضرت ام المومنین عائشہ سے وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کرتے ہیں جیسا کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا گیا ہوگا۔

حسین یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور اپنے دل پر نقش کرتے ہیں۔ بابا نے ۲۵ برس خاموشی سے کیوں گزارے، ایک دم جنگ کے میدان میں کیوں کود پڑے؟ اب تو آپ کا سن بھی لڑائیوں کی امنگوں کا متقاضی نہیں ہے۔ اُنسٹھ برس کی عمر ہے۔ بے شک حسین نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ حقیقۃً ہمارا حرکت سکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے۔ اصول اور فرض کے حُدود میں جذبات کا تقاضا اور سِن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اُٹھانے پر آمادہ کر رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا چاہیے اور اگر فرض ہمارا اقدام عمل کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متأثر بھی کیے ہو مگر ہمیں عزم وارادہ کے قدموں پر کھڑا ہو جانا چاہیے اور وہ کچھ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت کا تقاضا ہے۔

اس فتنہ کے فرو ہوتے ہی دوسری اُس سے زیادہ سخت فتنہ کی آندھی شام سے اٹھی جس نے اسلامی مملکت میں تاریکی پھیلادی وہ امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کی بغاوت تھی جس نے صِفّین کی خونریز شکل اختیار کی۔ اس جنگ کے آغاز اور اثنار اور انجام میں بہت سے جاذب توجہ امور پیش آتے رہے۔

معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی کا نہر فرات پر قبضہ کر لینا اور حضرت علی کے لشکر پر پانی بند کر دینا۔ مجبوراً آپ کا پانی کی خاطر حکم جنگ دینا، آپ کے لشکر کا ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لینا اور یہ ارادہ کرنا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اُس نے ہم پر بند کیا تھا مگر حضرت علی بن ابیطالب کا اس کو گوارا نہ فرمانا اور کہنا کہ پانی مشترک چیز ہے، سب کو پانی پینے کی اجازت ہونا چاہیے۔ حسین نے اس سے یہ سبق ضرور حاصل کیا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے اور اُس کے کمینہ طرزِ عمل کا معاوضہ اُس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی پابندی کا تحفظ کرتے رہنا چاہیے۔

جنگ صفین میں حسین دیکھ رہے تھے کہ اُن کے والد بزرگوار کو مسلمانوں کی خونریزی سے کتنی تکلیف ہے۔ وہ پکار پکار کر امیر شام سے کہہ رہے ہیں کہ اس سے کیا فائدہ ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ تم نکل آؤ میدان میں اور میں نکل آؤں اور بس اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے مگر امیر شام نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے علی جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں کے آگے آگے تھے۔ اُن کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے اس لیے ذرا بھی اُن کو جھجک نہ تھی۔ اُن کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اُس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ آغوش مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بے شک وہ اُس موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بستر راحت پر ہو چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہو تو اپنی موت مرو گے اور قسم اُس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلواروں کی آسان ہیں فرش خواب پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے۔ چنانچہ اُن کا طرز عمل ہمیشہ اسی کا مظہر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو عمر انتہائی عزیز ہوتی ہے۔ رسول کا ارشاد کہ علی میرے بستر پر سو رہو اور علی کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا۔ اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھینچی ہوئی تلواریں لیے قتل پر آمادہ ہیں مگر وہاں راہ حق میں موت کوئی چیز ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس جنگ صفین میں آپ کا عمل اسی بے پرواہی بلکہ شہادت کی آرزومندی کا مظہر تھا۔ ملاحظہ کیجیے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۱۲ اور نیشاپوری کی غرائب القرآن ج ۱ ص ۳۲۹ "علی بن ابی طالب صفین کی جنگ میں صرف ایک کرتا پہنے ہوئے گردش کرتے تھے۔ آپ کے فرزند امام حسن نے عرض کی کہ بابا یہ تو جنگ کرنے والوں کا انداز نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! تمہارے باپ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کہ موت اُس پہ گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔ پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں اور جن کے سامنے یہ سیرت ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں اُنھیں موت کا اندیشہ کیسے رہ سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حسین مثل اپنے بھائی حسن اور محمد بن حنفیہ کے اس جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ برابر حصہ لے رہے تھے اور بڑے بڑے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے چنانچہ ابو حنیفہ دینوری

نے "الاخبار الطوال" ص۱۸۴ میں ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے جبکہ امیر المومنین کے لشکر کے بڑے حصّہ نے شکست کھائی تھی لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے علی کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور جگر افراد۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو میسرہ کی جانب متوجہ کیا اور اُدھر قبیلۂ ربیعہ کے لوگ تھے جو اب تک اپنی طرف کے دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علی کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے حسن اور حسین اور محمد حنفیہ ہیں اور تیر علی کے کان کے پاس سے اور کاندھوں کے پاس سے گزر رہے ہیں مگر آپ کے بیٹے بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے ہیں اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیا یہ جذبۂ فداکاری اور قربانی کا معمولی منظاہرہ ہی جو علی کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علی کے یہ بہادر بیٹے موت کی پرواہ سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی جنگ میں حسین نے ایک اور منظر کا بھی اپنے باپ سے مشاہدہ کیا۔ وہ یہ کہ عین موقع جنگ پر آپ کی نگاہ آفتاب پر ہے۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ علی نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا یہ نماز کا وقت ہی؟! جنگ تو ہو رہی ہی! آپ نے فرمایا کہ اور ہم لڑ کا ہے کے لیے رہے ہیں۔ اسی نماز کے لیے تو جنگ کر رہے ہیں۔

حسین نے اس تعلیم کو محفوظ کر لیا کہ نماز اتنا اہم فرض ہی کہ کسی وقت نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو جب نماز کا وقت آئے تو ہمیں لازم ہی کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر کو وہ وقت آگیا کہ حضرت علی بن ابیطالب نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کر کے ہی جنگ موقوف کی جائے۔ ایک دن اور رات مسلسل ہنگامہ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجہ میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے۔ امیر معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا مگر عمر بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ تھی کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیے گئے کہ یہ قرآن ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے۔ حالانکہ جنگ کی ابتدا ہی میں حضرت

علی بن ابیطالب قرآن کے فیصلہ کی طرف دعوت دے چکے تھے مگر اُس وقت کامیابی کے تخیلات تھے اس لیے علی کی دعوت کو مسترد کردیا گیا۔ آج صرف شکست کے آخری انجام سے بچنے کے لیے قرآنوں کو سپر بنایا گیا۔ حضرت علی خوب واقف تھے کہ یہ مکاری اور چالبازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مگر آپ کے ساتھ والوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ بہت سے لوگ مچل گئے کہ اب تلوار روک لیجیے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہوجانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورت حال تھی جس کو علی بن ابیطالب گوارا نہ کرسکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التوا کا حکم دیا۔ طے پایا کہ ایک ثالث اہل شام کی طرف سے نامزد ہو اور ایک اہل کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہل شام کی طرف سے تو عمرو بن عاص ایسا امیر شام کا نفس ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علی بن ابیطالب نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبداللہ بن العباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے ہمدرد کو مقرر کریں جس پر آپ کو پورا بھروسا ہو تو وہی اپنی فوج والے پھر بگڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ان کو کیسے مقرر کریں آخر حضرت امیر نے انتہائی بددلی کے ساتھ فرمادیا کہ پھر جسے چاہو تم ہی مقرر کرو۔ ان لوگوں نے ابوموسی اشعری کو مقرر کیا جو پہلے ہی حضرت علی کی معاونت اور ہمدردی سے علیحدہ تھا۔ یہ معاہدہ بہت بادل ناخواستہ ہوا مگر مصلحت وقت یعنی اپنی جماعت میں خونریزی کا انسداد اسی پر موقوف تھا یقیناً حسین کے گرم جوانی کے خون کو عام جذبات کی دنیا میں اس کا متحمل نہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو فرض شناس انسان تھے جو اپنے پیشوا اور افسر کے حکم کے مطیع تھے چنانچہ جو معاہدہ کی دستاویز اس تحکیم کے بارے میں لکھی گئی اُس پر ابوحنیفہ دینوری کی تصریح کے مطابق سب سے پہلے گواہ حسن اور حسین فرزندان علی بن ابیطالب تھے (الاخبار الطوال ص ۱۹۰) مگر حسین نے دیکھا کہ باوجود حضرت علی بن ابیطالب کی اس غیر معمولی رواداری کے پھر بھی ساتھ والے مفسد آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے۔ ابھی گویا معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک جماعت حافظان قرآن کی جس کی پیشانیوں پر نمازوں کے گھٹے تھے۔ جن کی گردنوں میں قرآن حمائل تھے تلواریں کھینچے ہوئے علی کے سامنے آگئی یہ کہتی ہوئی کہ آپ مشرک ہوگئے

آپ نے آدمیوں کو حکم بنا لیا۔ حالانکہ حکم ہونا خدا سے مخصوص ہے۔ یہ "خوارج" کا فتنہ تھا۔ جس کے لیے جنگ نہروان کی ضرورت پیش آئی۔ حسین نے واقعات کے اس طویل سلسلہ کو بہت غور سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص مخلص، یکدل اور ہم آہنگ نہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہونچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شورشیں بالکل ختم نہیں ہوئیں اور آخر ان ہی خوارج میں سے ایک شخص کے ہاتھوں عین حالت نماز میں حضرت علی بن ابیطالب کے سر پر زہر آلود تلوار لگی اور ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کو آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس وقت حسین بن علی چھتیس ۳۶ برس کی عمر کو پہونچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسین نے اپنے والد بزرگوار علی بن ابیطالب سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سُنا اور کیا کچھ سیکھ لیا؟

اُن مسلمہ اعتقادی نظریات سے قطع نظر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت میں حضرت امام حسین کی روحانی عظمت کے متعلق قائم ہیں، عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت بھی یہ اہم تجربات اور یہ گرانقدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسین کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کی بلندی اخلاق وصفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

چوتھا باب

امام حسینؑ کی زندگی کا تیسرا دور - باپ کی وفات کے بعد سے اپنے عزم جہاد تک

سنہ ۴۰ھ	سنہ ۶۰ھ

جب حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب بستر مرگ پر تھے۔ تلوار کا وار کاری لگا تھا اور زہر کا اثر جسم میں پھیل رہا تھا، زندگی سے مایوسی ہو گئی تھی، اس وقت آپ نے حسنؑ و حسینؑ اپنے دونوں صاحبزادوں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا "میں تم دونوں کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلبگار نہ ہونا چاہے وہ دنیا خود تمھاری طلبگار بھی ہو۔ اور کسی دنیاوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مدمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ میں تم دونوں کو اور تمام اپنی اولاد کو اور اعزا کو اور اُن لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہونچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور اپنے شیرازہ کو مجتمع رکھو اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہو۔ اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، اُن کی برابر خبرگیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا کیونکہ پیغمبر نے ان کے بارے میں وصیت کی ہے اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا، کوئی تم سے بڑھ کر قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمھارے دین کا ستون ہے اور اپنے خدا کے گھر (خانۂ کعبہ) کا خیال رکھنا، زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا اور دیکھو خدا کی راہ مین اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا اور آپس میں صلۂ رحم رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی اچھی باتوں کی ہدایت اور بُری باتوں سے ممانعت کو ترک نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔ دیکھو اے بنی ہاشم

میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ تم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کردو! نہیں۔ میرے بدلے میں صرف میرا قاتل قتل کیا جائے اور یہ بھی لحاظ رکھو کہ اگر میں اس ضربت سے جانبر نہ ہوسکوں اور مرجاؤں تو اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگانا اور ہرگز اُس کو مُثلہ نہ کرنا یعنی اعضاو جوارح قطع نہ کرنا اس لیے کہ پیغمبر نے فرمایا ہے کہ خبردار کسی کو مُثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو۔"

نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات پتھر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ یہ صورت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بستر بیماری پر ہے، اُس کی موت کا ہنگام قریب ہے، اور اس وقت وہ اپنے تمام اہلبیت میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلا کر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات اُن فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کرسکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات سے متعلق کرتے ہیں مگر آل محمد تو دین و شریعت، کتاب اور سُنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفادِ عامہ، مفادِ شریعت اور مفادِ الٰہی سے متعلق ہیں۔ ان وصیتوں کا ہر ہر لفظ سعادت شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہوگیا۔ یہ الفاظ اُن کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہے کہ "فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیاوی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیاوی نقصان کی کبھی پرواہ نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مدمقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔" ان الفاظ کو دونوں بیٹوں نے اپنی اپنی زندگی میں حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ پیش نظر رکھا اور کبھی یکسر مو اُس سے انحراف نہیں کیا۔ باپ کے یہ الفاظ بھی اُن کے دماغ میں گردش کرتے رہے کہ "آپس میں کبھی اختلاف نہ کرنا۔ قرآن پر سب سے زیادہ عمل کرنا۔ نماز کا خیال رکھنا۔ خانۂ کعبہ کا خیال رکھنا۔"

آئے گا موقع جب آپ کو معلوم ہوگا کہ بھائیوں نے یک جہتی کو کیسے قائم رکھا۔ قرآن پر عمل کس طرح کرتے رہے اور نماز کی اہمیت کو کیسے سخت موقعوں پر پیش نظر رکھا اور خانہ کعبہ کی حرمت

کا کتنا لحاظ رکھا۔

یہ الفاظ بھی اُن کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے کہ "خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔" خصوصیت کے ساتھ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسین کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار ہے۔

حضرت علی بن ابیطالب کی وفات کے بعد تمام مُسلمانوں نے مل کر آپ کے بڑے فرزند امام حسن کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے پہلا خطبہ جو ارشاد کیا ہے اس میں حضرت علی بن ابیطالب کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کئے آپ کی سیرت اور مال دنیا سے پرہیز کا تذکرہ کیا۔ اور اس وقت آپ پر گریہ کا غلبہ ہوا اتنا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کئے عبداللہ بن عباس نے کھڑے ہو کر لوگوں کو دعوت بیعت دی اور سب نے انتہائی خوشی اور رضامندی کے ساتھ آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اُسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہو گی اور اگر میں جنگ کروں تو تمھیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہو گی۔ سب نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ آپ نے نظم و نسق اور بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا۔ اطراف میں عمال مقرر کیے۔ حکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

ابھی ملک حضرت علی کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسن پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ امیر شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور اُن کے فقتھ کالم کے لوگوں نے اپنی کارروائیاں جاری کر دیں چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم

کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسن نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو ایسا ہے تو پھر تیار رہو، یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھکو خبر معلوم ہوئی کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی فہمی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہمیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر اپنی دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے" اس خط کے بعد امیر شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی رد و بدل ہوئی۔ بہرحال ان واقعات نے امام حسن اور اُن کے ساتھ امام حسین کو یہ خوب بتلا دیا کہ امیر شام معاویہ کی عداوت حضرت امیر سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ اُن کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ ایک مستقل دشمنی ہے اور اس سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرا امر یہ کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیے جائے پناہ موجود ہے اور اگر وہ ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دو آدمی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنھیں کافی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے پھر بھی اس خط کے مضمون اور دوسرے حالات سے حسین دیکھ رہے تھے کہ اُن کے بھائی امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار رہیں اور وہ حق کے بارے میں اُس سے کوئی مراعات کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بے شک حسن کو اور اُن کے ساتھ حسین کو اپنے ملک کی فضا سے بے اطمینانی ضرور تھی۔ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ کچھ لوگ حضرت علی کی فوج میں شامل تھے لیکن وہ قرابت، دوستی یا اور کسی وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیر کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے۔ اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزومند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم نے میرا دل پیپ سے

بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا۔ کبھی فرماتے تھے کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمھاری جماعت سے تبادلہ کرے اُس طرح جیسے سونے کے سکہ کا مبادلہ چاندی کے سکّہ سے ہوتا ہے یعنی وہ دس تم میں کے لے لے اور ایک انہوں میں کا مجھے دیدے۔ آپ فرماتے تھے کہ دیکھو اہل شام اپنے لیڈر کی اطاعت کرتے ہیں درانحالیکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کہنا نہیں مانتے درانحالیکہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ باطل راستے پر اپنے لیڈر کی اتنی اطاعت کرتے ہیں جتنی تم حق کے راستے پر اپنے امام کی اطاعت نہیں کرتے۔ آپ فرماتے تھے کہ جب تم لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے چلو گرمی کے زمانے میں تو تم کہتے ہو کہ یہ تو تراتے کی گرمی ہے۔ ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے جاڑے کے زمانہ میں تو کہتے ہو کہ یہ تو کڑاکے کا جاڑا ہے اتنی مہلت دیجیے کہ یہ سردی کم ہو جائے۔ افسوس! جب تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تلوار کی آنچ سے اور اس سے زیادہ بھاگو گے۔

یہی وہ جماعت تھی اب جس کے ساتھ امام حسن کو سابقہ پڑا تھا۔ آپ ان لوگوں کی حالتوں کا خوب اندازہ رکھتے تھے لیکن جب تک صورت حال میں کوئی تبدیلی نہو آپ کا فرض تھا کہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہیں۔

امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے ضرور کچھ نہ کچھ یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہو گا اس کے علاوہ وہ سمجھتے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علی کی جو ہیبت تمام عرب کے قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اُسی درجہ پر حضرت امام حسن کے لیے ابھی حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے وہ سوچے کہ یہی موقع ہے عراق پر حملہ کر دیا جائے چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لیکر جسر منبج تک پہونچ گئے اس وقت امام حسن نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے گورنروں کو صورت حال کے مقابلہ کے لیے آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کے مشن کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سرد مہری سے کام لیا گیا۔ تھوڑی فوج تیار ہوئی تو اُن میں کچھ طبقۂ خوارج میں سے جو کسی نہ کسی حیلہ سے معاویہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل

کے دباؤ سے جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علی اور امام حسن کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ ادھر معاویہ نے عبداللہ بن عامر بن کریز کو اپنا مقدمۃ الجیش بنا کر آگے روانہ کیا اور اُس نے عین التمر سے ہو کر انبار میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ ادھر حضرت امام حسن اُس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور مقام دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں کی خنک طبعی کا مشاہدہ ہوا۔ آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے۔ میں تمھارا اُتنا ہی بہی خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیے۔ میں تمھارے بارے میں ایک فیصلہ کی رائے قائم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمّت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمھیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کروں۔" آپ کا یہ خطبہ حقیقۃً صحیح صورت حال کے جائزہ لینے کا بہترین ذریعہ تھا۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ وہ لوگ جو خوارج کی رائے رکھتے تھے پکار پکار کر کہنے لگے کہ حسن بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا اور آپ کا مُصلّا قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ کپڑے لوٹ لیے۔ یہاں تک کہ چادر آپ کے دوش سے اُتار لی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آواز بلند کی کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ فوراً یہ دونوں جاں نثار قبیلے ادھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دُور کیا۔ آپ یہاں سے روانہ ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر جراح بن قبیصہ اسدی ایک شخص انہی خوارج میں سے کمینگاہ میں چھپ گیا اور اُس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہو گئی۔ قاتل گرفتار کیا گیا اور اُسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیّاری کی۔ ادھر تو معاویہ نے اپنی بڑی فوج کے ساتھ انبار کا محاصرہ کیا اور ادھر ان کے مقدمۃ الجیش عبداللہ بن عامر کا مقابلہ امام حسن کی فوج کے ساتھ ہوا مگر ابن عامر نے مقابلہ سے گریز کیا۔ امیر شام کو حضرت امام حسن کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا علم ہو چکا تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی حیثیت سے اس وقت

امام حسن کو جنگ نہیں کرنا چاہیے اور یہی وقت ہے کہ حصول اقتدار کے لیے صلح کی پیش کش کر دی جائے مگر اسکے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن کتنے ہی بے بس اور بیکس ہوں مگر وہ علی وفاطمہ کے بیٹے اور پیغمبر کے نواسے ہیں اس لیے وہ کسی ایسے شرائط پر ہرگز صلح نہ کرینگے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوے اُنھوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ بن عامر کے ذریعہ سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے درپے نہ ہو اور خونریزی کی صورت پیدا نہ ہونے دو۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کو رشوتیں دی گئیں اور کچھ کمزور طبیعت والوں کو اپنی تعداد کی کثرت سے مرعوب کیا گیا اور دوسری طرف حضرت امام حسن کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط کو کہیں اُن شرائط پر میں صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اُن کا خیال صحیح نکلا۔ امام حسن واقعی اپنے ساتھیوں کی غداری سے پریشان تھے۔ اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبہ بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی تو ہوس کبھی رہی ہی نہیں انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا رہو۔ اب امیر معاویہ نے جواب بے مُنھ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا سوائے شخصی اقتدار کی خواہش کے اور کچھ نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ آپ نے اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کرکے امیر معاویہ کے پاس روانہ کیے۔ وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہوجاتا ہے چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ حضرت امام حسین اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسن کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کررہے تھے۔ اُنھوں نے ان واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اُس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور صحیح اندازہ رکھتے تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اُنھوں نے دشمن سے مقابلہ کے لیے ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال یک قلم دل سے نکال دیا۔ وہ اپنے والد بزرگوار

کے ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ اُن کے سامنے تلواریں کھینچ کر آگئے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرزِ عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں کس طرح ان کے بھائی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تھی ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسین اپنے بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اُس سخت اور ناگوار موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر انھوں نے یقینی حالات کو دردمندانہ طریقہ پر ضرور سُنا اور اُس زخم کو دیکھا ہوگا جو اُن کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آگیا تھا اور اس کا اثر اُن کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے۔

آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم کے لیے نقطۂ اوّل صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صلح کے امکانات پیدا ہونے تک ہے اس لیے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خودداری کے خلاف نہ سمجھو۔ چاہے جذباتی لوگ اُس پر معترض بھی ہوں اور چاہے اس کے لیے تمھیں اپنے جاہ و اقتدار، راحت و آرام یا کسی دوسرے ذاتی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہرحال تمھارا مقدس فریضہ ہے۔ یہی سبق حسین کو اپنے نانا سے ملا تھا۔ یہی اُن کو اپنے باپ سے ملا تھا اور یہی اب اُن کو اپنے واجب الاطاعت بھائی امام حسن سے مل رہا تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اور اُن کے سامنے دوبارہ آگئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستے میں دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسا کرو جب تک کہ اُس کے خلاف نتیجہ سامنے نہ آئے۔

حسین اصول اور مسلک کے لحاظ سے امام حسن کے ساتھ بالکل ایک تھے اس لیے آپ نے بھی اس سے کوئی اختلاف نہیں فرمایا۔

ان واقعات اور ان کے بعد کے بہت سے حالات پر تبصرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں واقعۂ کربلا کے اسباب کے تحت میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ وہاں ان کے بہت سے جزئیات پر مزید حاصل بحث کا موقع ہوگا۔ یہاں پر تو صرف ان واقعات کو حضرت امام حسین کی زندگی کے اہم تجربات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس لیے اس سے زیادہ لکھنا سلیقۂ تصنیف کے خلاف ہے۔

بہرحال صلح ہوگئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں۔ امیر معاویہ کی شہنشاہی مملکت اسلامیہ میں عمومی طور پر مُسلّم ہوگئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز یمن اور ایران وغیرہ نے بھی اطاعت قبول کر لی حضرت امام حسن کو اس صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے جس طرح کے دلخراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا اُن کا برداشت کرنا اُنہی کا کام تھا وہی لوگ جو کل تک "امیر المومنین" کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے آج " مذل المومنین "یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرنے لگے مگر امام حسن نے صبر اور استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن اُدھر کیا ہوا؟ وہاں یہ ہوا کہ امیر شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مستحکم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے نزول اجلال کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو۔ حج کرو۔ یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مُسلّم ہو جائے۔ وہ حسن کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہوگئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسن کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور اُن کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کشائی کرتا۔

اقتدار شاہی کی جرأت اس نقطہ تک پہونچی کہ کوفہ میں امام حسن اور امام حسین کی موجودگی میں امیر شام نے حضرت امیر اور امام حسن کی شان میں ناسزا کلمات استعمال کیے۔ اس موقع پر سکوت کرنا اعتراف و اقرار کا مرادف سمجھا جا سکتا تھا اس لیے فوراً امام حسین بھائی کی جانب سے جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسن نے آپ کو بٹھلا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا۔ حسین نے یقینی اسی وقت سے سمجھ لیا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ممکن ہے کہ اُسی وقت طے بھی کر لیا ہو کہ اب ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے۔ نہ وہ ذمہ داریوں کے محل

سے ناواقف تھے۔ انہیں اب صبر آزما انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آگے بڑھانا تھا اور اس کے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ وقت کی موجودہ ساکن مگر پر اضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسن نے اس مصالحت اور امور سلطنت سے کنارہ کشی کے بعد کوفہ کا قیام ترک کیا اور اپنے نانا کے جوار میں مدینہ جا کر بس گئے۔ حسین نے بھی بھائی کا ساتھ دیا اور مدینہ ہی میں جا کر قیام فرمایا جب تک کہ زمانہ کوئی دوسرا گل کھلائے اور حالات کسی حیثیت سے پلٹا کھائیں آئے گی یہ بحث کہ بنی امیہ نے پروپیگنڈا کر کے اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں بھائیوں کے باہمی اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اُن کا شاید مقصد یہ تھا کہ جس طرح حضرت علی بن ابیطالب کے زمانہ میں شام کی حکومت نے یہ سیاسی فتح حاصل کر لی تھی کہ آپ کے بھائی عقیل کو آپ سے جدا کر کے دمشق میں بلوا لیا، اُسی طرح اب وہ امام حسن کے مقابلہ میں یہ سیاسی فتح حاصل کر سکیں گے کہ آپ کے بھائی کو آپ سے جدا کر کے اپنے ساتھ ملا سکیں گے مگر اُنھیں نہیں اندازہ تھا کہ وہ عقیل تھے اور یہ حسین ہیں۔ ان کے نفس کی بلندی اور ضمیر کی پختگی ایسے کمزور طرز عمل سے اُتنی بلند ہے جتنی مرکز زمین سے فلک الافلاک کی رفعت۔ یہ جاہ پسند یا آرام طلب یا جذباتی انسان نہیں ہیں جو اس قسم کے پروپیگنڈے کا شکار ہو جائیں قول عمل، اصول اور مسلک میں وہ اپنے بھائی امام حسن کے ساتھ بالکل متحد تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اُن کے بھائی امام حسن نے اگرچہ فرض کے شکنجہ میں کس کر خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال اُن کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار درمیان میں آئے گی اور یہ کہ آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہیں ہو سکتا اور وہ اس کے لیے تیار تھے اگر حالات کی رفتار اُنہی کے دور حیات میں اُس آخری نقطہ تک پہونچ جاتی۔ ع۵ وہ اکثر یہ اشعار بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے:۔

من عاذ بالسیف لاقی فرصۃ عجبا — موتا علی عجل او عاش منتصفا

لا تو کبوا السہل ان السہل مفسدۃ — لن تدرکوا المجد حتی ترکبوا عنفا

ع۵ کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی مطبوعۂ لیدن ص ۵۳

(یعنی) "جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون اور اطمینان حاصل کرلے گا۔ یا دنیا سے گزر جانا جلدی سے اور یا زندگی ایسی جو عدل و انصاف کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل نہیں کرسکتے ہو جب تک کہ دشوار گزار منزلوں کو طے نہ کرو۔"

انسان کی زبان پر وہی کہاوتیں آتی ہیں اور وہی اشعار اُس کو پسند آتے ہیں جو اُس کی افتاد طبع اور اصول و مسلک کے مطابق ہوں حسینؑ ان اشعار کے معنی خوب سمجھتے تھے اور اس سے اُن کے دماغ میں احساسات کی ایک برقی رو دوڑ جاتی تھی وہ جانتے تھے کہ ہم کو اپنے نصب العین کی بقا کے لیے ایسی ہی غیر معمولی دشوار گزار راہوں کو طے کرنا پڑیگا اور اُسکے لیے ہم کو مستعد رہنا چاہیے۔

بہرحال حضرت امام حسنؑ اور اُن کے ساتھ امام حسینؑ معاہدہ کی خلاف ورزی کی رفتار کا مطالعہ کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ایک ایک کرکے ان شرائط کو کس حد تک پامال کیا جاتا ہے اور وہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی کب لیتا ہے؟

اس دوران میں یہ حضرات بالکل ملکی اور سیاسی امور سے بے تعلق رہے مگر امام حسینؑ نے دیکھا کہ اُن کے بھائی حضرت حسنؑ اسکے بعد بھی بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے، اسکی مختلف صورتیں تھیں۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے اُن کی رفعت مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندان پیغمبرؐ کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی پاک ہے کہ ان کے خلاف کوئی ایسا الزام جو کھُلا ہوا اصول شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی طرح مفید نہ ہوگا اور وہ ہرگز مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لگائے گئے جو شرع کے حدود کے اندر تو ہوں مگر عام نگاہوں میں کچھ اچھی حیثیت سے دیکھے نہ جاتے ہوں مثلاً کثرت ازدواج اور کثرت طلاق۔ یہ چیز بجائے خود شرع اسلامی میں جائز ہے لیکن بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جس سے لوگ حضرت امام حسنؑ کی نسبت کچھ اچھی رائے قائم نہ کریں اسی طرح دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کا پروپیگنڈا اور ایسی

بہت سی چیزیں جو صرف اموی پروپیگنڈا کی پیداوار تھیں۔

دوسرے عمال بنی امیہ اور اُن کے ہوا خواہوں کا حضرت امام حسنؑ سے برابر تاؤ سخت کلامی اور دشنام طرازی جس سے کسی وقت مشتعل ہو کر حضرت امام حسن یا بنی ہاشم میں سے دوسرے لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں اور اس سے ایک طرف ان پہ معاہدہ کی خلاف ورزی کا اخلاقی الزام عاید کیا جا سکے دوسرے ان کی خوں ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے۔ اس کا اندازہ امام حسین کے اُن الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے ہیں امام حسن کی وفات کے بعد جبکہ آپ کے جنازہ میں مروان رو رہا تھا۔ امام حسین نے کہا "آج تم روتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم ہی انھیں غم و غصہ کے گھونٹ پلاتے تھے" مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا" اس سے آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام حسن کی نسبت جو کچھ ایذا رسانی کی جاتی تھی اُس کا حسین کے دل پر ایک نہ مٹنے والا نقش قائم ہوتا تھا مگر اس خاندان کا نظم و ضبط دیکھنے کے قابل ہے کہ جب سردار کی طرف سے یہ اصول قائم کیا گیا کہ ہمیں صبر و سکون کے ساتھ قائم رہنا چاہیے تو ہر ایک شخص اُس کا اس طرح پابند ہو گیا کہ ہزار خون کھولے اور دشمن کی طرف سے اشتعال پیدا کیا جائے مگر کیا ممکن کہ کوئی ایسا فعل کسی ایک سے سرزد ہو جائے جو مقررہ اصول و مسلک کے خلاف اور ضبط و انتظام کے منافی ہو اس انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد بھی امام حسن کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی سلطنت وقت کو جب کوئی بہانہ اُن کے خلاف کھلے ہوئے جور و ستم کا نہ ملا تو خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جا رہا تھا۔ معاویہ کے بیٹے یزید نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن کی زوجیت میں تھی سازباز کر کے ایک لاکھ درہم انعام کا وعدہ کیا اور اُس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوا دیا۔ امام حسن کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے اور حالت بالکل خراب ہو گئی آپ نے اپنے بھائی امام حسین کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو میرے جد بزرگوار رسول خدا کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر لوگ مزاحمت کریں تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خوں بھی گرنے نہ پائے تم مجھکو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنتہ البقیع میں دفن کر دینا۔

۲۸ صفر سنہ ۵۰ھ کو وہ امن و صلح و سلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امام حسین وصیت کے مطابق اپنے بھائی کو غسل و کفن کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسول کی طرف لے چلے۔ بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ اُن کو وہاں دفن کریں گے۔ سب کے سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے اور بیچ میں سدِّ راہ ہوئے۔ قریب تھا کہ جنگ کی نوبت آئے مگر امام حسین اپنے بھائی امام حسن کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے آپ نے بتلایا کہ ہم دفن کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف بطور وداعِ آخری روضۂ رسول کی زیارت کرا کر تابوت کو واپس لے آئیں گے۔ بنی ہاشم اس وقت بےچین تھے اور خود امام حسین کے دل میں تلاطم تھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ خدا کی قسم اگر بھائی کی وصیت اور اُن کے اُصول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسے تم حسن کے دفن کرنے سے روک سکتے ہو۔ بہرحال بات رفت و گزشت ہو گئی۔ حسن کو روضۂ رسول پر دفن نہ ہونے دیا گیا اور اُنھیں جنۃ البقیع میں دفن کیا گیا مگر یقین سمجھو کہ حسین کے دل پر ایک گہرا ناسور تھا جو بنی امیہ کے ظلم و عناد سے ہمیشہ کے لیے پڑ گیا اور جس کا اندمال غیر ممکن تھا۔

اتنے ہی پر اکتفا نہیں ہوئی بلکہ آپ کو یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسن کی وفات پر اظہارِ مسرت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے۔ اتفاق سے اس وقت ابن عباس دمشق میں تھے۔ اُنھوں نے یہ الفاظ سُنے تو کہا کہ خوش نہ ہو۔ تم بھی حسن کے بعد عرصہ تک زندہ نہیں رہو گے آخر کو تمھیں بھی یہی دن نصیب ہوگا (الاخبار الطوال ص۲۲۴)

حضرت امام حسن کی وفات بنی ہاشم کے لیے ایک سخت حادثہ تھی چنانچہ ع۵ اس سانحۂ عظیم پر بنی ہاشم ایک مہینہ کامل سوگوار رہے (حاکم در مستدرک ج ۳ ص۱۷۳) مگر اس کے بعد بھی امام حسین اُسی راستے پر قائم رہے جو امام حسن نے قائم کر دیا تھا اور اس طرح یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ آپ کو اپنے بھائی سے اُصولی اختلاف تھا اور صرف اُن کے دباؤ کی وجہ سے آپ اُس پر قائم تھے ایسا نہیں بلکہ آپ اُسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحبِ اختیار ہونے کے بعد بھی اُسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ امام حسن کے بعد اموی اقتدار کی جرأت اور چیرہ دستی اور بڑھ گئی دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۵۱ھ میں حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کا قتل اور عمرو بن الحمق

ع۵ مولانا عینی شاہ نظامی

کا حکم گرفتاری اور پھر اُن کے سر کا جسم سے جدا کر کے نیزہ پر بلند کیا جانا واقع ہوا۔ کس لیے ؟ صرف حکومت وقت کی من مانی کارروائیوں پر اظہار اختلاف اور خاندان رسول کے ساتھ دوستی کے جرم میں۔ اس واقعہ کا امام حسین کے دل پر بڑا اثر ہوا اور آپ نے امیر شام کو اس بارے میں احتجاجی مکتوب روانہ کیا لیکن اُس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔

مجاہدۂ کربلا کے اسباب کے تذکرہ میں ان واقعات پر بسیط تبصرہ کیا جائیگا مگر یہاں تو ان واقعات کو سرسری طور پر صرف اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ تم ان سے حسین کی زندگی کے اس پہلو پر غور کرو کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں ایسے تلخ تجربات کو کس پُرسکون انداز کے ساتھ گزارا اور اس سے اُن کے نفس کی کس پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

وہ اموی سیاست کی رفتار کو برابر ناقدانہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور بالکل خاموش تھے مگر اُس طرح کی خاموشی جس کے سناٹے میں طوفان کی آمد ہوتی ہے۔ وہ ایک جلد باز شخص کی طرح نہیں بلکہ عاقبت اندیش انسان کی طرح صبر و سکون کے لمحات میں اپنے آخری اقدام کی اسکیم مرتب کر رہے تھے اور منتظر تھے کہ وہ وقت کب آتا ہے جب اس اسکیم کے نفاذ کا موقع آئے۔

دس۱۰ برس کی طولانی مدت اس صبر و سکون اور انتظار میں گزری اور آخر رجب ۶۰ ھ میں وہ وقت آیا جب امیر معاویہ کی وفات ہوئی اور معاہدہ کی آخری شرط دم توڑ کر ختم ہوئی شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا مگر اُنھوں نے اپنے بعد اپنے فاسق و فاجر بیٹے یزید کو خلیفہ بنا کر مسلمانوں کے سر پر مسلط کر دیا۔ یزید تخت خلافت پر بیٹھا اور وہ حسین سے بیعت کا طلبگار ہوا بس یہ ہے اب واقعۂ کربلا کا آغاز جس کے اسباب، تفصیلات اور نتائج آپ کو کتاب کے دوسرے حصّہ میں معلوم ہونگے۔

پانچواں باب

امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور مختلف اوصاف

عرب کے فلسفی شاعر نے کہا ہے:- انّ العظائم کفوٴھا العظماء "بڑے کارناموں کے لیے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں"۔ ایک دوسرے موقع پر وہی شاعر کہتا ہے:-

علیٰ قدر اھل العزم تأتی العزائم — وتاتی علیٰ قدر الکرام المکارم
ویکبر فی عین الصغیر صغارھا — وتصغر فی عین العظیم العظائم

(یعنی) صاحبان ارادہ کی مقدار کے مطابق ہی ہوتے ہیں اُن کے ارادے اور بزرگ مرتبہ اشخاص کے درجہ ہی کے لحاظ سے ہوتی ہیں اُن کی بزرگیاں۔ چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس کی ہمت نہیں کرتا یا کر لیتا ہے تو اُس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھکر اُس پر نازاں ہو جاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اُسے کر گزرتا ہے اور اس پر بھی اُس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اُس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو کربلا کے ایسے عظیم الشان واقعہ کا ہیرو ہونا ہی حسین کے نفس کی بزرگی اور اُن کے کیرکٹر کی بلندی کے متعلق وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے جسے شاید تاریخ کے قلم نے محفوظ نہ کیا ہو یا تاریخ کے صفحات کو اُلٹ کر ہم نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نادر خصوصیات عالم وقوع میں آ نہ سکتے تھے اگر اُسکے انجام دینے کے لیے حسین کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعۂ کربلا میں عظمت اور اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی تھی اگر اُس کا تعلق حسین ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

ایک ہی کام نوعیت، اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے مختلف ہو جاتا ہے اپنے کرنے والے کی شخصیت کے

اختلاف سے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے دور میں ایسی صورتیں کئی دفعہ آئیں کہ ملک کے سب سے بڑے سیاسی قائد نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور موت کے آنے تک کے روزہ کی نیت کرلی اگر وہ بات حاصل نہ ہو جس کی خاطر ہڑتال کی گئی ہو۔ دنیا نے دیکھا کہ اس برت نے بالا و پایئن کے تمام حلقوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور آخر ایک محدود دائرہ میں سہی لیکن وہ مقصد حاصل ہوتا گیا جس کے لیے یہ برت رکھے گئے تھے مگر کیا یہی نتیجہ حاصل ہوسکتا تھا اگر یہ کھانا پینا چھوڑ دینے والا کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے ملک میں کوئی عظمت و اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ کوئی دوسرا غیر معلوم وغیر مشہور آدمی اگر ایسا کرتا تو فاقوں مر کر جان دیدیتا اور خودکشی کا مجرم بن جاتا مگر نہ ملک میں کوئی انقلاب برپا ہوتا۔ نہ اقتدار اعلیٰ پر کوئی اثر پڑتا۔ اس مثال سے آپ نے خوب سمجھ لیا ہو گا کہ محل کے اختلاف اور شخصیت کے تفرقہ سے عمل کی نوعیت اور اسکے نتیجہ میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہبی دنیا میں اسکی مثال حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا ہے کون نہیں جانتا کہ مسیحی مشن نے اپنی تبلیغ میں کتنی اہم کامیابی حاصل کی اس دردناک واقعہ کی تصویر دکھا کر کہ حضرت یسوع مسیح خدا کے بندوں کو نجات دلانے کے لیے سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ جانے دیجیے اس بات کو کہ مسلمان مذہبی طور پر اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے کہ حقیقتہً حضرت مسیح کی صلیب پر وفات ہوئی ہے مگر جہانتک عیسائیت کی تاریخ کا تعلق ہے اور اُن کی مقدس مذہبی کتابوں کا اُنھوں نے اس واقعہ کو بڑی پر تاثیر صورت سے دکھایا ہے اور اسکے ذریعہ سے دنیا میں اپنے مشن کی اشاعت کی ہے مگر کیا اس صلیب پر چڑھنے کے واقعہ میں کوئی جان رہ جاتی ہے اگر اس کا تعلق عیسیٰ ایسے مقدس اور برگزیدہ انسان کے ساتھ نہ ہو جسے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا کہتے ہیں۔ روزمرہ ہزاروں ڈاکوؤں کو سولی دی جاتی ہے لیکن اُن کے سولی دیئے جانے پر نہ کسی کے منھ سے آہ نکلتی ہے۔ نہ واہ مگر حضرت عیسیٰ کی صلیب وہ تھی جس نے ایک قوم کو زندہ کیا اور آج تک زندہ بنائے ہوئے ہے۔ یونہی سقراط کا جام زہر پی لینا بلکہ خود ہمارے اسلام کے مقدس رسول کا گھر سے بے گھر ہو جانا یعنی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کرنا ان تمام واقعات میں تاثیر پیدا ہوئی صرف اُن شخصیتوں کے لحاظ سے جن کے ساتھ اُن واقعات کا تعلق ہے۔

بے شک ان تمام واقعات میں اور واقعۂ کربلا میں ایک بنیادی فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ ان واقعات کی اہمیت اور تاثیر کا راز صرف شخصیتوں میں مضمر ہے لیکن واقعۂ کربلا جیسا کہ بعد میں آپ کو معلوم ہوگا خود ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اُس کی مثال کوئی مل نہیں سکتی لیکن اُن خصوصیات سمیت بھی اُس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ وہ حسینؑ ایسے بلند انسان کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بفرض محال کرتا بھی تو اُس کی یہ تاثیر نہیں ہو سکتی تھی اس لیے واقعۂ کربلا کا وقوع بھی حسینؑ کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اُس کی وہ تاثیر بھی جو عالم اسلام میں پیدا ہوئی حسینؑ کے نفس کی رفعت و بلندی اور اُن کی شخصیت کی برتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعاکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص عملی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے شخصیت کی رفعت و شہرت اور سربلندی سے اور پھر اُس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اُس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعۂ کربلا ہو نہیں سکتا تھا اور اُس میں یہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی تھی بغیر امام حسینؑ کی شخصیت کے مگر حسینؑ کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمایان عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کا آفتاب خطِ نصف النہار پر پہنچ گیا واقعۂ کربلا کے سبب سے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اتنی محفوظ نہیں ہے جتنی کہ واقعۂ کربلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط و خال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ بھی محفوظ ہیں۔ سبب اس کا صاف ظاہر ہے۔ واقعۂ کربلا کے پہلے امام حسینؑ کو مؤرخین کی نگاہ بس اُس حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی اولاد میں اُن اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ، عصمت اور پاکیزگی کا مجسمہ تھا۔ جیسے اُن کے اوصاف و کردار کے متعلق کبھی اجمال اور کبھی کچھ تفصیل کے ساتھ بعض واقعات سخاوت، عبادت، ریاضت و حلم وغیرہ کا تذکرہ کر دیا ہے ویسے ہی امام حسینؑ کے متعلق بھی جستہ جستہ اس قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اُس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو سنہ ۶۰ھ کے پہلے تک کیا معلوم تھا کہ یہ انسان ایک ایسے عظیم انقلاب کا بانی ہونے والا ہے جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر ناپید ہوگی

تاکہ وہ ابتدائے عمر سے اُن کی زندگی کے ہر جزیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور اُنھیں سینہ بسینہ محفوظ کر کے لب بہ لب منتقل کرنے کے کتابوں کے دامن تک پہونچاتے۔

لیکن ایک طرف تو واقعۂ کربلا کے دوران میں تمہیدی یا ضمنی طور پر تاریخ نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر دیے ہیں وہ آپ کے اوصاف و عادات کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہونچایا ہے اُن سے بھی حسین کی عظمت اور اوصاف و کمالات کے متعلق ایک روشن مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ یا شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف و کمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ گاہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراج بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسباب جو کسی شخص کی انسانی عظمت کی تشکیل اور انسانیت کے عنصر کی تعمیر کرتے ہیں حسب ذیل تین امور ہیں۔ پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت۔ تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اُسکی صلاحیت و استعداد و فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز اُن صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر پہونچانے کا کام انجام دیتی ہے یا بسا اوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز اُن فعلی کمالات میں پختگی پیدا کر کے ملکۂ ذاتی بناتی اور اُن میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ حضرت امام حسین میں یہ تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ آپ کے خاندانی خصوصیات وہ تھے جن کی نظیر ملک عرب میں پائی نہ جاتی تھی۔ اسکو پہلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ملتی نہ تھی سوائے ظلم و جبر اور قہر و استبداد کے۔ اُنھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپکے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے اُن کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ ملاحظہ کیجیے تاریخ میں یہ موقع کہ بنی امیہ کا ظالم تاجدار یزید جس کے حکم سے حسین قتل کیے گئے تھے۔ آپ کے قتل کے بعد جب آپ کے اہل حرم کو مقید کر کے اپنے دربار

میں بلواتا ہے اور گویا اپنی فتحمندی کا مکمل اعلان کرتا ہے تو اُسی وقت اُس کے دماغ کی تاریک فضا میں حسین کے روشن اوصاف کی بجلی تڑپنے لگتی ہے۔ وہ فتح کی ترنگ کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے اہلِ دربار کی طرف اور کہتا ہے "جانتے ہو یہ مصیبت ان پر کیوں آئی؟ صرف اس لیے کہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے باپ میرے باپ سے بہتر اور ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور ان کے نانا میرے نانا سے بہتر اور یہ خود مجھ سے بہتر ہیں اور خلافت کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں" اب جواب سُنیے اِن اُن کا یہ کہنا کہ اُن کے باپ میرے باپ سے بہتر تھے تو یہ تو اس سے ظاہر ہے کہ میرے باپ اور ان کے باپ کے درمیان جھگڑا ہوا اور دنیا کو معلوم ہے کہ کس کے موافق فیصلہ ہوا (یہ اُس فریب کارانہ سازشی تحکیم کی طرف اشارہ ہے۔ جو جنگ صفّین کے بعد ہوئی تھی لیکن دنیا کو معلوم ہے کہ اس کے نتیجہ کو کسی فریق نے بھی تسلیم نہیں کیا اور وہ ایک بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوئی) "بیشک اُن کا یہ کہنا کہ اُن کی ماں میری ماں سے بہتر تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کی بیٹی فاطمہ میری ماں سے بہتر تھیں اور یہ کہنا بھی کہ اُن کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے۔ یہ بھی یقینی ہے اس لیے کہ جو شخص خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہو وہ ہرگز رسول کا مدِ مقابل کسی دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا مگر ان کی سمجھ کا پھیر تھا اتنا کہ انھوں نے قرآن کی اس آیت کا خیال نہیں کیا کہ سلطنت کا مالک خدا ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔"

آخر یزید کو کیا ضرورت تھی کہ اپنی فتحمندی کے اس جشنِ طرب میں حسین کے خاندانی خصوصیات اور اُن کے دعاوی کا تذکرہ کرے جنھیں بہرحال اُسے باوجود دھاندھلی کے فی صدی پچھتر تسلیم کرنا ہے مگر نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں آدمی ایک دماغی کشمکش اور ضمیر کی نیش زنی کے موقعوں پر کیا کرتا ہے۔ یزید کے سامنے حسین کی فضیلت خود اُسکے نفس کو حقیر دکھلا رہی تھی اور جب وہ خود اپنے کو حقیر دیکھ رہا تھا تو اُسے نظر آرہا تھا کہ میرے دربار کا ہر فرد مجھے یونہی حقارت سے دیکھ رہا ہوگا۔ پھر یہ جاہل اور مغرور آدمی کے کردار کی ایک بوالعجبی ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے نفس کو کسی طرح دھوکا دیتا ہے اور پھر اُسی دھوکے میں دوسروں کو مبتلا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے مدِ مقابل کی فوقیت کے

خیال کو کسی طرح دماغوں سے نکال دے۔ یہی ایک مضطربانہ کیفیت یزید کی اس گفتار میں مضمر ہے مگر آخر میں ہوا کیا؟ صفات کی جنگ میں یزید کی شکست اور کھلی ہوئی شکست، وہ حسینؑ کے حسب و نسب کے مقابلہ میں کوئی بات ایسی نہ پیش کر سکا جو اسے متعلقہ منصب کا اہل ثابت کر سکے۔ اس تمام صدائے بے ہنگام کی آخری تان ٹوٹی صرف اس پر کہ یہ تو سلطنت ہے جس کے پاس پہونچے بس اسی کا حق۔ اس دلیل کی بنا پر دنیا کے کسی بادشاہ کو ظالم، ناانصاف اور قابل نفرین و ملامت سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ چنگیز ہو چاہے ہلاکو اور چاہے دنیا کا کوئی اور انتہائی ظالم بادشاہ۔

ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو انسان کے حسنِ فطرت کے ضامن ہیں حسینؑ نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے اُن کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی تھی۔ یہ تفصیل سے آپ کے سامنے دوسرے باب میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گزرنا پڑا تھا جن میں آپ کو جذبات نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑا تھا اس لیے آپ کے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کا اندازہ آپ کو تیسرے اور چوتھے باب سے ہو سکتا ہے مگر اُن کے نتیجہ کو ذرا ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ حسینؑ کو سات ہی برس کی عمر میں اپنے نانا کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور اُس انقلاب کو دیکھا جو رسولؐ کی وفات کے بعد سیاسی مرکزیت کے اس بارگاہ سے ہٹ جانے سے ظاہر ہونا چاہیے تھا۔ یہ وہ موقع تھا کہ بنی ہاشم کے لوگ یا بعض دوسرے افراد اگر حضرت علی بن ابیطالب کو ان کے حقوق یاد دلاتے تھے اور ترغیب دیتے تھے کہ آپ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیے مگر حضرت علی ایسے شجاع اور طاقتور انسان نے مفاد اسلامی کی خاطر صبر و ضبط سے کام لیا تھا۔ یہ زمانہ پچیس برس تک رہا۔ ظرف زماں کا یہ حصّہ وہ ہے جس میں حسینؑ نے کمسنی کے حدود کو ختم کر کے نوجوانی کی منزل کو طے کیا اور پورے شباب کے درجہ تک پہونچے۔ عمر کا یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں ولولہ، اُمنگ اور حوصلہ انسان سے خلاف تدبّر اقدامات کرا دیا کرتا ہے مگر تمام ناگوار حالات کے باوجود حسینؑ نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو نظم، اصول اور اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہو بلکہ آپ نے تیسرے باب میں دیکھا ہے

کہ جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ جناب عثمان محصور تھے اور اُن پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو حضرت علی نے حسن اور حسین اپنے دونوں فرزندوں کو پانی پہونچانے کے لیے بھیجا تھا وہ باغیوں کی شورش کی پرواہ نہ کرتے ہوے گئے اور اپنے فرض کو انجام دیا۔ حضرت علیؑ کے دورِ حکومت میں مخالفوں کی جارحانہ کارروائیوں کے مقابلہ میں حسین شریک رہے اور آپ سُن چکے ہیں کہ حسین نے بعض سخت موقعوں پر جان کو انتہائی خطرہ میں ڈال کر باپ کا ساتھ دیا ہی مگر جب صفین میں قرآن نیزوں پہ بلند کیے گئے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے اختلاف سے مجبور ہو کر حضرت علی کو جنگ ملتوی کرنا پڑی تو جواں سال حسین نے بلا توقف سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اپنے بھائی حسن کے ساتھ اُس معاہدہ پر دستخط کیے جو التوائے جنگ کے لیے تحریر کیا گیا تھا حضرت علی شہید ہو گئے اور اُن کی جگہ پر حسن امام حسن پیشوا تسلیم کئے گئے اور آپ کو اپنے حریف سے صلح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حسین نے بھی اس مصالحت کے شرائط کی پابندی کی۔ دس برس کا زمانہ یوں ہی گزرا اور اس زمانہ میں ایسے واقعات پیش آتے رہے جو پیمانۂ صبر و ضبط کو چھلکا دیں مگر امام حسین نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے معاملات سے کنارہ کش، گوشہ نشین اور خاموش رہتے ہوے بھی امام حسن زہر سے شہید کئے گئے اور تاریخ کا یہ عبرتناک واقعہ بھی سامنے آیا کہ حضرت امام حسن کو اُن کے نانا رسول اللہ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت نہ دی گئی اور مزاحمت کی گئی یہاں تک کہ کہا جاتا ہی جنازہ پر تیر چلائے گئے جن میں سے چند تیر تابوت کو توڑ کر امام حسن کے جسم تک پہونچے مگر بھائی کی وصیت اور حالات کے تقاضے کی بنا پر امام حسین خاموش رہے اور اپنے بھائی کو روضہ رسول سے الگ دوسرے مقام پر دفن کر دیا۔ ان واقعات سے ثابت ہوا کہ حسین کوئی جذباتی انسان نہ تھے وہ متحمل اور صابر تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آ کر کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہونچے جن کے وہ خود اور اُن کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ایسا صلح کل، متحمل، امن پسند انسان کیسے ایک ایسے اقدام کے لیے تیار ہو سکتا ہے جس میں وہ اور اسکے تمام ساتھی ایک دم تہ تیغ ہو جائیں لیکن جب ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسا بھی کر گزرتا ہے۔ اس سے

اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرائض کے مقابلہ میں فنا کر دینے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہونچ سکتا۔

نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا ملکہ یہی وہ ایک جامع اور وسیع مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہو جاتے ہیں مگر حضرت امام حسین کے کمالات و اوصاف کی تشریح کے لیے جب اہل معرفت نے قلم اٹھایا تو اُس پر اجمالی تبصرے کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زریں روایا سامنے آئے ۵؎ ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسین کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے کان عالما بالقران عاملا علیہ زاہد اتقیا نقیا ورعا جوادا فصیحا بلیغا عارفا باللہ ودلیلا علیٰ ذاتہ تعالیٰ۔ "وہ قرآن کے عالم اور اس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیز گار سخی، شیریں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذات الٰہی کا ایک ثبوت تھے"

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں بہ مجبوری اُن الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علما اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں پھر اُس کا حوصلۂ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اُس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربی نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہدیا کان الحسین السبط اٰیۃ من اٰیات اللہ "سبط رسول امام حسین خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے" یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلوں سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔

حسین بے شک ذات الٰہی کا ثبوت اور اُس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی حسین کو دیکھکر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کا کلام:۔

۵؎ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگ کائنات اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

عبادت آپ کی، وہ جسے عام زبانوں میں عبادت کہا جاتا ہے ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ تھا اس لیے کوئی حرکت وسکون بھی آپ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ شب و روز میں ایک ہزار رکعت پڑھتے تھے اور اکثر روزے رکھتے تھے۔ ۲۵ حج آپ نے پاپیادہ کیے (تہذیب الاسمار نووی ج ۲)

ایک مرتبہ کا تذکرہ ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں حاجیوں کا قافلہ بھی ان تک پہونچ گیا۔ اب جوان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً اُن کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اُتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر کچھ لوگوں کی طاقت رفتار نے جواب دیا سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ بزرگ صحابی تھے اُن سے آ کر کہا کہ اب تو راستہ چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہے مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں سردار پاپیادہ راستہ طے کریں۔ سعد امام حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگواروں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو اُن کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستہ چلیں اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں بزرگوار سوار ہو جائیں امام حسن نے فرمایا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض یہی قرار دیا ہے کہ ہم خانہ کعبہ کی طرف اپنے پیروں پر جائیں مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوار شاہراہ سے ہٹ کر

دوسرے راستے سے روانہ ہوگئے۔

عبادت الٰہی کے ساتھ آپ کو جو دلی وابستگی تھی اُس کا اندازہ آپ کو امام کے اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ٩ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی مہلت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ اس ایک شب کی مہلت لے لو کہ ہم اس کو عبادت وذکر الٰہی میں گزار دیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اُس کی عبادت وذکر سے کتنی محبت ہے چنانچہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شب اُنھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کس طرح گزاری تھی۔ تاریخ میں یہی فقرہ ہے کہ لھم دوی کدوی النحل یعنی اُن کے تسبیح وتہلیل اور ذکر ومناجات کی آوازرات کے تاریک سناٹے میں گونج رہی تھی۔ ایسی جیسی شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز سنائی دیتی ہے" اور نماز آپ نے روز عاشورا ایسے سخت وقت میں ادا کی ہے جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر جب نماز ظہر کا وقت آیا تو آپ نے نماز ظہر ادا کی۔ جماعت کے ساتھ اس طرح کہ دو جاں نثاروں کو محافظت کے لیے سامنے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اُسے اپنے سینہ پر روکیں۔ ادھر نماز تمام ہوئی اور ادُھر اُن میں سے ایک صحابی سعید بن عبداللہ حنفی زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسین نے خالق کی عبادت اور فریضۂ نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔ بے شک یہی وہ بندہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں کہا جائے ؎

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

اسی کے ساتھ وہ فیاض تھے اور خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات بکثرت ہیں۔

خود رسول اللہ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپنے ہی سے اس صفت کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ طبرانی کی روایت کے مطابق آنحضرت نے ارشاد فرمایا:۔ امّا حسن فلہ ھیبتی وسوددی وامّا حسین فلہ جرأتی وجودی (یعنی) "حسن کے لیے میرا رعب وداب اور شان سرداری ہے اور حسین میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے" (صواعق محرقہ ص١١٤)

ع۵ "حسین فرزند نبی اوصاف نبی کا مالک تھا لیکن خصوصیت سے نبی کے حسین کو اپنی سخاوت وشجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضور کے اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں" ع۶ "آنحضرت کا ارشاد اقدس امّا الحسین فلہٗ جودی لفظ بہ لفظ درست نکلا۔ کاشانۂ امامت پر مسافروں کا اور درویشوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دوران نماز میں ایک دن صدائے فقیر سُنی دو رکعت پر نماز ختم کی اور قنبر سے دریافت فرمایا بیت المال میں کتنی رقم ہے؟ قنبر نے عرض کیا دو سو درہم اہلبیت کے صرف کے رہ گئے ہیں۔ فرمایا اس صدا دینے والے کی نذر کردے۔ ہمارا خدا مالک ہے (ابن عساکر)

ایک دن مسجد نبوی میں سُنا کوئی خدا سے دس ہزار دینار مانگ رہا ہے۔ آپ مکان واپس ہوئے اور غلام کے ہاتھ دس ہزار دینار اُس مانگنے والے کے پاس بھجوا دیئے (ابن ابی شیبہ)

ایک دن آپ نے ایک سائل کو پچاس ہزار درہم دیئے اور اُس رقم کے باندھنے کے لیے دوش اقدس سے چادر بھی اُتار کر دی اور اپنے ہاتھوں سے اُس رقم کو اس میں باندھا اور سائل کے دوش پر رکھا۔ قنبر نے عرض کیا شب کے خرچ کے لیے کچھ نہ رہا۔ فرمایا عشاؤنا من اللہ۔ ہمارا شب کا انتظام خدا کے پاس سے ہو کر رہے گا (احیاء العلوم)

نجد سے کسی نے خط لکھا "یا ابن رسول اللہ ادرکنی" جواباً آپ نے اس کے پاس دس ہزار درہم بھیجدیے (احیاء العلوم)

ایک دن سائل نے صدا دی "حسبتہٗ للہ یا ابن رسول اللہ" غلام سے دریافت فرمایا کچھ ہے؟ عرض کیا صرف سو دینار ہیں۔ آپ نے اُن دیناروں کو کپڑے میں باندھا اور پٹ کی آڑ سے سائل کے حوالے فرماتے ہوئے کہا انی استحیی منک یا عبد اللہ (اے بندۂ خدا میں تجھ سے شرمندہ ہوں (سفینۃ النجاۃ)

مضافات مدینہ میں چار سو صحابیوں کے ہمراہ کسی دن تفریح فرما رہے تھے۔ ایک راہرو ایک نفیس گھوڑے پر سوار اچھے لباس سے ملبوس سامنے سے گزرا اور آپ کے احباب سے پوچھا یہ جوان کون ہیں جو آنحضرت کا عمامہ بر سر اور آنحضرت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں

ع۵ مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی لدھیانہ ع۶ مولانا عینی شاہ صاحب نظامی

آپ کے گھوڑے پر سوار اور آنحضرت کی شمشیر لگائے ہیں؟ اصحاب نے کہا تجھے نہیں معلوم یہ حسین فرزند رسولخدا ہیں۔ یہ سوار معاندین جناب امیرؑ سے تھا۔ اُس نے جناب امیر کی بارگاہ میں بیحد گستاخیاں کیں اسپر آپ مسکرانے لگے اور فرمایا اگر دھوپ لگ گئی ہو تو چلا آ اور ہمارے کھانے پینے اور سامان تفریح میں شریک ہو جا اور اگر تو تنگ دست ہے تو یہ دس ہزار دینار لے اور چلا جا۔ اس نووارد نے اشرفیاں سنبھالیں اور کہا قسم بخدا اے حسین میں نے آپ سے بڑھکر کوہ وقار اور جبل حلم کسی کو نہ دیکھا۔ دوستوں نے عرض کیا حکم ہو تو اس کی گردن ناپیں۔ فرمایا نحن الجبال القواصف لا یزعزعنا العواصف "ہم وہ مستحکم کوہ ہیں جن کو ہوائیں ہلا نہیں سکتیں (سیلۃ النجاۃ ۲۷۱)"

عـہ "ایک اعرابی مدینہ میں آیا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ سخی یہاں کون ہے؟ لوگوں نے کہا حسین بن علی۔ سائل حاضر ہوا تو حسین نماز میں مشغول تھے۔ وہ دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور آپ کی مدح میں یہ اشعار پڑھے۔

لم یخب الان من رجاك ومن حرّك من دون بابك الحلقة

"جس نے آپ کے دروازے کی زنجیر ہلائی اور آپ سے امید لگائی وہ کبھی محروم نہیں رہا"

انت جوادی و انت معتمدی ابوك قد كان قاتل الفسقة

"آپ ہی ہیں میرے سخی داتا اور میرا آسرا اور آپ کے باپ وہ تھے جو فاسقوں کو قتل کرنیوالے تھے"

لولا الذی كان من اوائلكم كانت علينا الجحيم منطبقة

"اگر آپ کے بزرگوں کے کارنامے جو ہوئے ہیں نہ ہوتے تو ہم سب جہنم میں جاتے"

حضرت نماز سے فارغ ہوئے تو غلام سے دریافت فرمایا کہ مال حجاز میں سے کیا باقی ہے؟ عرض کیا کہ چار ہزار دینار۔ آپ نے فرمایا ہم سے زیادہ مستحق اس مال کا آ گیا ہے۔ پس اپنی عبائے مبارک اُتاری اور ان دیناروں کو اُس میں لپیٹ کر دروازہ کے پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور وہ تمام دینار سائل کو عطا فرمائے اور پھر قلت مال کی معذرت ان الفاظ میں فرمائی

عـہ مولانا سید مبارک علی صاحب عالم آگرہ

خذها وانّی الیک معتذر واعلم بانّی علیک ذو شفقہ
"لے لو اس کو اور میں تم سے عذر خواہ ہوں اور یقین جانو کہ مجھے تمھارے ساتھ نہایت ہمدردی ہے!"
لوکان فی سیرنا الغداۃ عصا امست سمانا علیک منن فقتہ
لکنّ ریب الزمان ذو غیر والکف منّی قلیلۃ النفقہ

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ زمانہ نے ہم کو تنگدست کر دیا ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو میں باقی نہ رکھتا دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اُس اعرابی نے وہ مال تو لے لیا مگر رونے لگا اس پر حضرت نے کہا کہ شاید یہ مال تمھاری ضرورت سے کم ہے۔ اُس نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ مجھکو یوں رونا آیا کہ افسوس ایک روز ان سخی ہاتھوں کو زمین کھالے گی۔"

آپ کا لقب "ابو المساکین" تھا۔ ؎۱ "فی الحقیقت حسین کا لقب "ابو المساکین" صحیح ہے راتوں کو کھانے، روٹیوں اور کھجوروں کے لپشتارے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتے تھے اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہونچاتے تھے جس کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے۔ (شہید اعظم ص۴۷۸)

ایک روز دیکھا کہ ایک غلام سرِ راہ بیٹھا ایک کُتے کو کھانا کھلا رہا ہے۔ اُس سے حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں ایک غمزدہ انسان ہوں۔ میں نے چاہا کہ اس حیوان مخلوق الٰہی کو خوش کروں۔ شاید اس کے بدلے میں خدا میرے غم کو دور فرمائے۔ میں ایک یہودی کا غلام ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اُس سے علٰحدہ ہو جاؤں۔ اس بیان سے حسین رحم مجسم متاثر ہوئے۔ فوراً اُس یہودی کے گھر تشریف لے گئے۔ دو سو دینار (اشرفی) اس غلام کی قیمت دی اور غلام کو آزاد کر دیا یہودی اس خلق و رحم و بخشش کو دیکھکر حیران ہو گیا اور عرض کی لے فرزند رسول آپکے اس عطیۂ و رحم اور عزّت افزائی کے سبب میں یہ غلام بھی حضور کی نذر کرتا ہوں اپنا باغ بھی اس غلام کو دیتا ہوں اور آپ کا یہ زرِ قیمت بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں آپ نے فرمایا کہ یہ روپیہ میں نے تجھکو ہبہ کر دیا ہے۔ یہودی نے عرض کی مولا میں نے یہ رقم بھی اس غلام کو بخشدی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے یہ غلام مع اس مال و باغ

؎۱ ناموس اسلام۔ خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب پٹیالہ

کے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ سبحان اللہ یہ ہے حسین کا رحم و اخلاق - یہ ہے حسین کا جود و سخا۔

عـ۵ عمرو بن دینار کی روایت ہے کہ اسامہ بن زید ایک مرتبہ بیمار ہوئے اور امام حسین عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ اسامہ کہہ رہے ہیں واغماہ (اف کس قدر رنج و غم ہے) حضرت نے فرمایا اے بھائی کیا غم ہے؟ اسامہ نے کہا کہ مجھے اپنے قرضہ کی فکر ہے کہ میں ساٹھ ہزار درہم کا قرضدار ہوں۔ حضرت نے فرمایا وہ قرضہ مجھ پر ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں ادا کر دوں گا اسامہ نے کہا کہ مجھکو ڈر ہے کہ قبل ادا ہونے کے شاید میں مرجاؤں آپ۔ حضرت نے فرمایا کہ تم ہرگز اُس وقت تک نہ مروگے جب تک میں تمہارا قرضہ ادا نہ کر دوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت نے اُن کی زندگی میں اُن کا قرضہ کل ادا کر دیا۔"

ممکن ہے کہ ان روایات میں سے بعض میں کوئی نقاد روایت و درایت کے لحاظ سے کچھ موشگافی سے کام لے یا کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کوئی ہیرو جب دینی یا دنیاوی اعتبار سے ایک بڑے درجہ پر مان لیا جاتا ہے تو اُس کی نسبت خوش عقیدہ حلقوں میں اسی قسم کے حکایات اکثر مشہور ہو جاتے ہیں مگر اس خیال کے ظاہر کرتے وقت یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کے حکایات غلط طور پر بھی اُسی کی نسبت مشہور ہوا کرتے ہیں جس کے طرز زندگی کی ساخت اُن حکایات کے لیے موزوں ہو۔ یعنی جب تک کسی کے سچے حالات کچھ نہ کچھ اُسی نوعیت کے نہوں اُس وقت تک اُس کے لیے رومانوی واقعات کی پیداوار نہیں ہوتی۔ آخر بڑے آدمیوں میں عبد اللہ بن زبیر بھی تو ہیں مگر اُن کی نسبت تاریخ "بخیل" کی لفظ استعمال کرنے میں نہیں جھجکی۔ بڑے آدمیوں میں عباسی خلیفہ منصور دوانقی کی بھی تو شخصیت ہے مگر اس کے لیے بخل کے حکایات رومانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں پھر اگر دینی و دنیوی عظمت کا لازمی نتیجہ ہی یہ ہوتا کہ اُس کے جود و سخا کے حکایات زیادہ مشہور ہوں تو ہر بڑے آدمی کے لیے یہ بات حاصل ہونا چاہیے تھی۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ شخصیت جس کے لیے تاریخ یا سیر کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات درج ملتے ہیں بجائے خود اس صفت میں ایک اعلیٰ درجہ پر فائز تھی جب ہی اُس کی نسبت راویوں کو اس قسم کے حکایات بیان کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

عـ۵ مولانا سید مبارک علی صاحب عالم۔ آگرہ۔

ع۵ حسین ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب کسی صاحب ضرورت نے تمھارے آگے دست سوال دراز کیا تو گویا اُس نے اپنی عزت تمھارے ہاتھ بیچ ڈالی اور اُس کی قدر نہ کی۔ تمھارا یہ فرض ہے کہ تم اُسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو۔"

خلق خدا کی خدمت اور انسانی برادری کے ساتھ ہمدردی ہی کے تحت میں داخل ہے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور اُن کی آزادی کی کوشش کرنا۔ یہ وہ چیز ہے جسے اسلام نے خاص اہمیت دی ہے، اُس نے اگرچہ غلامی کو یک قلم ختم نہیں کیا تھا لیکن ایسے اسباب ضرور فراہم کئے تھے کہ اگر اُس کے قانون پر عمل ہو تو ایک وقت میں دنیا کی ہر فرد آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہو سکتی ہے۔ نیز غلامی کی حالت میں اُن کے معاشرتی معیار کو بلند کر کے انسانی شرافت کا احساس پیدا کرایا۔ اسی پر حضرت پیغمبرؐ اور اُن کے خاندان کا عمل بھی قائم رہا۔ وہ غلام اور کنیز سے مثل عزیزوں کے برتاؤ کرتے تھے اور ایک ذرا سی بات کے بہانہ پر اُسے آزادی کی دولت سے مالامال کر دیتے تھے۔ حضرت امام حسین کے طرز زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ہیں۔

ع۵ "آپ دلتسرا میں بیٹھے کھانا نوش فرما رہے ہیں۔ ایک کنیز کے ہاتھ سے کھانے کا گرم گرم پیالہ آپ کے چہرۂ انور پر گر پڑتا ہے۔ آپ کنیز کی طرف نگاہ گرم سے دیکھتے ہیں۔ وہ فوراً قرآن کی آیت کا یہ ٹکڑا پڑھ دیتی ہے کہ (الکاظمین الغیظ) یعنی "غصہ کو پی جانے والے" حسین فرماتے ہیں کظمت غیظی "اچھا میں نے اپنے غصہ کو پی لیا" کنیز دوسرا ٹکڑا آیت کا پڑھتی ہے والعافین عن النّاس "لوگوں کو معاف کرنے والے" حسین فرماتے ہیں اعفوت عنك (میں نے تجھے معاف کیا" پھر کنیز بولتی ہے "واللہ یحبّ المحسنین" "اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے" حسین فرماتے ہیں انت حرّۃ لوجہ اللہ سبحانہ "میں نے تجھے خدائے سبحانہ کی خوشی کے لیے آزاد کیا۔ اس کے ساتھ جو وظیفہ اُس کنیز کا مقرر تھا وہ بھی آپ نے قائم و برقرار رکھا (وسیلۃ النجاۃ ص۲۰۲)

ایک مرتبہ ایک کنیز ریحاں کے پھولوں کا ایک گلدستہ نذر گزرانتی ہے حسین خوش ہو کر اُس کو آزاد کر دیتے ہیں انس بن مالک پاس حاضر ہیں۔ وہ کہتے ہیں یا ابن رسول اللہ پھولوں کے ایک گلدستہ پر اس قدر قیمتی لونڈی کو آپ نے آزاد کر دیا۔ فرمایا دیکھو خدائے جلیل کا ارشاد ہے اذا حیّیتم بتحیّۃ فحیّوا

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ   ع۲ ناموس اسلام

باحسن منہا او رد دوہا، جبکہ کوئی تمہارے ساتھ کوئی اعزاز کا برتاؤ کرے تو اُس سے بہتر برتاؤ تم اُس کے ساتھ کرو یا کم از کم اُتنا ہی کرو۔" اس کنیز نے اپنی بساط کے مطابق بہترین ہدیہ میرے لیے پیش کیا اب میری جانب سے اس کے لیے اس سے بہتر ہدیہ یہی ہے کہ میں اس کو آزاد کر دوں (وسیلۃ النجاۃ ص۲۷۱)

کربلا میں جس طرح آپ نے غلاموں اور کنیزوں کی عزت افزائی فرمائی ہے اُس کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا۔

خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی کے اس بہترین جذبہ کے ساتھ آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابل عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اُس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے اس کا بہترین ثبوت وہ واقعہ ہے جسے امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر (ج ۱ ص۲۷۲) میں اور علامہ نیشاپوری نے تفسیر غرائب القرآن (ج ۱ ص۲۳) میں لکھا ہے کہ ایک اعرابی امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تسلیم بجا لایا اور عرض حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپ کے جد بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرو یا تو شریف النفس عرب یا سخی سردار یا حامل قرآن یا وجیہ و شکیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفتیں مجتمع ہیں۔ عرب قوم، اُس کو تو شرف آپ کے جد بزرگوار سے حاصل ہوا۔ اور سخاوت، یہ آپ کا شیوہ اور خصلت ہے اور قرآن، وہ آپ ہی لوگوں کے گھر میں نازل ہوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپ کے جد بزرگوار کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسنؑ و حسینؑ کو دیکھ لینا۔ یہ پُر معرفت تقریر سُنکر حضرت نے فرمایا کہ تمہاری حاجت کیا ہے؟ اُس نے اپنی حاجت زمین پر لکھ دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سُنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں ہنر موجود ہے اور میں نے اپنے جد بزرگوار کا ارشاد یہ سُنا ہے کہ احسان بقدر معرفت ہونا چاہیے اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں اپنا ایک تہائی مال دیدوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دیدونگا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دیدونگا۔ میرے پاس مال دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے زر نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اُس نے کہا پوچھیے خدا میری مدد کرے گا۔ آپ نے فرمایا بتاؤ کون سا عمل سب میں بہتر ہے؟ اُس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اُس نے کہا خدا پر بھروسا رکھنا۔ حضرت نے فرمایا انسان کی زینت کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو

فرمایا اگر یہ نہ ہو؟ اُس نے کہا کہ پھر مال ہو جس کے ساتھ سخاوت موجود ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اُس نے کہا پھر فقیری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اُس نے کہا تو پھر ایک بجلی گرے اور اُس شخص کو جلا کر خاک کر دے۔ یہ سُننا تھا کہ حضرت کو ہنسی آگئی اور وہ پوری تھیلی اُس کی جانب پھینکدی۔

یہ طرز عمل غربار اور مساکین کو معلومات مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرّک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفات جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے ایسے جس سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے الناس اعداء لما جھلوا "لوگ دشمن ہوتے ہیں اُس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں" وہ روسار اور حکّام جو خود علم و ہنر سے بے بہرہ ہوا کرتے ہیں اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر میں علم و ہنر کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے رہنما ہمیشہ افراد جامعہ کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علی کی زندگی اسی میں گذری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

جانے دیجیے اُن خطبات و اشعار کو جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علم آلہیات اور معارف حقہ کے خزانہ دار ہیں اور اُن دعاؤں اور مناجاتوں کو جو آپ کی زبان سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ "صحیفہ حسینیہ" کے نام سے اس وقت موجود ہے اور جو خالق و مخلوق کے باہمی ربط کی بے نظیر آئینہ دار ہیں، اگر آپ جوامع حدیث کی سیر کیجیے تو اُن میں آپ کو مسائل فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ سے منقول ملیں گے۔

اُس وقت بھی جب آپ اہل حرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفر غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فرزدق بن غالب شاعر نے ملاقات کی ہے اور اس نے کچھ مسائل آپ سے صید اور مناسک حج کے متعلق دریافت کیے ہیں اور اُن کا جواب حاصل کیا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسین پر نثار ہو رہا تھا۔ اُن میں حافظان قرآن تھے۔ عالمان کتاب اور حاملان حدیث تھے۔ ان کے جذب و کشش

کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوائے ایسی ذات کے جو خود ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہو۔
امام حسین، رحمدل بھی تھے، اس کا ثبوت گزشتہ کئی واقعوں سے ہو جاتا ہی مگر اس کا بلند درجہ یہ ہی کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھا جاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو فراموش کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ اس کا بہترین اندازہ حُر کے لشکر کے ساتھ آپ کے نیک سلوک سے ہوتا ہے۔ یہ حُر کون تھا؟ آپ کا ایک دشمن تھا جو گرفتار کرنے کے لیے آیا تھا مگر اُس کو اور اُس کے لشکر کو پیاسا دیکھکر عرب کے بے آب و گیاہ راستوں میں آپ نے اپنے ساتھ کا تمام پانی پلوا دیا اور اپنا اور اپنے ساتھیوں کا بلکہ عورتوں اور چھوٹے بچّوں تک کا کوئی خیال نہیں کیا۔
ان تمام بلند صفات کے ساتھ آپ انتہائی متواضع اور منکسر تھے چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ عـ۵ "ناناکے روضہ سے زیارت کرکے بیت الشرف کو تشریف لئے جا رہے ہیں کہ راستے میں چند مسکین غریب فقیر بیٹھے ہوئے ملے جو اپنے بھیک کے ٹکڑے سامنے رکھ کے کھا رہے تھے۔ آپ کو دیکھکر اُن سب نے پکار کر کہا اللّٰھم یا ابن رسول اللہ حسین فوراً اُن فقیروں محتاجوں کے پاس نہایت مسرت، خوش روئی، اور خوش خلقی سے زمین پر بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ بھائیو تم لوگ جانتے ہو کہ صدقہ آل محمد پر حرام ہے۔ اس لیے میں تمھارے اس طعام میں شرکت سے معذور رہوں۔ ہاں میں اس لیے کہ تمھارے ساتھ کھانے میں شرکت کروں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ آج تم سب میرے مہمان ہو چلو اور میری دعوت کو قبول کرو۔ سب کو ساتھ لے کر در دولت پر تشریف لاتے ہیں۔ دستر خوان بچھتا ہے سب کو اپنے برابر بٹھاتے ہیں۔ خود شریک ہوتے ہیں اور سب کو نہایت محنت و مشقت سے سیر فرماتے ہیں"
اس تواضع اور خاکساری کے باوجود آپ کے رفعت مرتبہ اور بلندی صفات اور جلالت قدر کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوں لوگ نگاہ اُٹھا کر بات نہیں کرتے تھے چنانچہ جب ایک شخص نے امیر معاویہ سے آپ کا پتہ پوچھا تو جواب دیا کہ مسجد نبوی میں داخل ہوتے ہی تمھیں ایک حلقہ نظر آئے گا جس میں لوگ اس خاموشی سے بیٹھے ہونگے گویا اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔ یہی ابو عبد اللہ الحسین کا حلقہ ہوگا (ابن عساکر جلد ۴ صـ ۳۳۲)
جو لوگ آپ کے خاندانی مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ اور صفات کی برتری کے

عـ۵ ناموس اسلام

قائل تھے۔ (ملاحظہ ہو ابن اثیر جزری کی کتاب "اسد الغابہ" ج ۳ ص ۲۳۵) مسجد نبوی میں ایک مجمع تھا جس میں ابو سعید خدری اور عبد اللہ بن عمر بن العاص اور بہت سے لوگ موجود تھے اُدھر سے حضرت امام حسین کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیم اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جواب سلام دیا۔ اُس وقت عمر بن العاص کے فرزند عبد اللہ چپ رہے۔ جب سب جواب دے کر خاموش ہو گئے تو اُنھوں نے آواز بلند کی اور کہا وَعَلَیکَ السَّلامُ وَرَحمَۃُ اللّٰہِ وَبَرکاتُہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوے اور کہا کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہل زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہل آسمان کا کون ہے؟ سب نے کہا ضرور بتلائیے۔ اُنھوں نے کہا وہ یہی راستے سے گزرنے والا، اُنھوں نے مجھ سے جنگ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی ہے اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہو جائیں تو یہ میرے لیے سُرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہوگی۔

یہ عبد اللہ خاندان بنی اُمیہ میں زہد اور تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگ صفین میں اپنے باپ عمر بن العاص کے ساتھ حضرت علی سے جنگ کرنے کے لیے آگئے تھے۔ اُس وقت سے حضرت امام حسین نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی مگر اس کے باوجود اُن کے دل پر حضرت امام حسین کے بلند اوصاف کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

خود امیر شام معاویہ کا واقعہ ہے جو طبری نے درج کیا ہے کہ جب حضرت امام حسین نے اُن کو ایک سخت خط لکھا ہے جس میں اُن کے اعمال و افعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی تو اُس وقت امیر معاویہ کو بڑا ہی غصہ آیا اور سخت پیچ و تاب کھایا۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدی لوگوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا سخت خط لکھئے جو حسین کو خود اُن کی نگاہوں میں ذلیل کردے معاویہ نے کہا کہ میں جو کچھ لکھوں وہ غلط ہوگا یا صحیح۔ اگر غلط ہوگا تو اُس سے کوئی نتیجہ نہیں میرا ضمیر خود مجھے ملامت کرے گا اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسین میں مجھے ڈھونڈھنے سے بھی کوئی عیب ملتا نہیں۔ پھر میں اُنھیں جواب میں سخت باتیں کس طرح لکھوں۔ یہ حسین بن علی کی راست بازی اور راست کرداری تھی جس کی وجہ سے فریق مخالف کو کوئی انتقادی پہلو نظر نہ آتا تھا۔

اسی راستبازی میں داخل ہے اخلاقی جرأت حسین میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپنے میں حضرت عمر بن الخطاب ایسے پر جاہ و جلال انسان کو منبر پر ٹوک دیا اُس وقت جب اُنھیں

منبر پر خطبہ پڑھتے دیکھا قریب آکر کہنے لگے انزل عن مجلس ابی "اُتر پڑو میرے باپ کی جگہ ہے"، حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ کہتے ہو صاحبزادے تمہارے ہی باپ کا منبر ہے۔ خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں ہے۔ روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بخدا میں نے اس بچہ کو یہ ہدایت نہیں کی تھی حضرت عمرؓ نے کہا کہ بخدا ہم بھی آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ مشہور مؤرخ ابن سعد نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صاحبزادے کو اُٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور کہا کہ کیا بال ہمارے سروں پر آپ کے باپ کے سوا کسی اور نے اُگائے ہیں یعنی جو کچھ رفعت اور بلندی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اُن ہی کے سبب سے ہے۔ (صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی ص۱۰۵)

اسی اخلاقی جرأت کا نتیجہ ہوتا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو شریعت اسلام کا ایک بنیادی حکم ہے یعنی اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت حسینؑ کو اس کا بچپنے سے شوق تھا نہ صرف یہ کہ وہ کھیل کود سے متنفر تھے جیسا کہ حذیفہ بن یمان صحابی رسولؐ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسینؑ کو کھیلتے ہوئے بچوں کے ساتھ دیکھا۔ بچے کھیل رہے تھے مگر حسینؑ دیوار سے لگے کھڑے تھے (اعلام الوریٰ) بلکہ کسی کو غلط کردار کرتے دیکھ کر ٹوکنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بے شک اس کے ساتھ اخلاق اور طریق حکمت و موعظۂ حسنہ کا لحاظ تعلیم قرآن کے مطابق مقدم سمجھتے تھے جس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عـہ ایک روز حسنؑ و حسینؑ دونوں بھائی ایک پیر مرد کے پاس سے گزرے جو غلط وضو کر رہا تھا یہ خیال ہوا کہ اس کو ہدایت کرنا ضروری ہے مگر اس بڈھے شخص کو ٹوکنا اور صاف صاف یہ کہنا کہ تم جاہل مسئلہ ہو اور وضو سے واقف نہیں ہماری کمسنی کو دیکھتے ہوئے تہذیب کے خلاف اور اس کی دل شکنی کا باعث ہے آخر آپس میں مشورہ کر کے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُس بڈھے کے پاس گئے اور کہا کہ اے میاں بزرگ ہم دونوں بھائیوں میں یہ بحث ہے کہ کون وضو ٹھیک کرتا ہے تو ہم آپ کے سامنے وضو کریں آپ ہمارے درمیان فیصلہ کر دیجئے اور بتا دیجیے کہ کون وضو صحیح کرتا ہے۔ اُس نے کہا بہتر آپ وضو کیجیے میں تبلا دوں گا۔ دونوں صاحبزادوں نے اس کے سامنے وضو کرنا شروع کیا۔ وضو تمام ہوا۔ بوڑھے نے دیکھا تو دونوں کا بالکل ایک انداز ہے۔ فوراً اسے توجہ پیدا ہوئی۔ اُس نے

عـہ ناموسِ اسلام

کہا صاحبزادو میں سمجھا آپ کا کیا مطلب ہے۔ آپ دونوں کا وضو ٹھیک ہے میں نے ہی وضو غلط کیا تھا۔ اب میں دوبارہ وضو کئے لیتا ہوں" اس طرح فرض بھی ادا ہو گیا۔ اخلاق بھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ پھر جب بچپنے میں تعلیم وارشاد اور اصلاح خلق کا یہ جذبہ تھا تو عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس میں کتنی ترقی ہوتی گئی ہوگی۔

راست بازی اور راست کرداری کا بڑا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکۂ کربلا کے پہلے مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورت حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بتا کر ساتھ والوں کو حفاظت جان و مال کے لیے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال اور ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دیدی مگر جو راستا پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا تھا اُس سے ایک انچ نہ ہٹے۔

اُنھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ اُن کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے ؂ "اُنھوں نے اپنی فطرت کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ انسان ہوتے ہوئے انسان سے برتر زندگی گزاری اور کوئی ایسا فعل صادر ہی نہ ہوتا جو مثال ہو کر نہ رہتا امام حسین کا قول تھا کہ غصہ کرنا کتے کی عادت ہے۔ اسی لیے ایک ایسے موقع پر جب کوئی انسان غصہ سے آگ بگولا ہو گیا امام حسین نے فرمایا لایدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب (وسیلۃ النجاۃ) یعنی جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں ملائکہ قدم نہیں رکھتے۔ مطلب یہ تھا کہ غصہ کر کے انسان کو کتا نہیں ہونا چاہیے"۔

حضرت امام حسین کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا اُن میں سے ایک

؂ سید ارشاد حسین صاحب آنریری اے وکیل رائے بریلی

نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یک جان ویک دل ہو کر اُن کے مقصد کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔

ان واقعات پر تفصیلی تبصرہ اور کربلا کے واقعہ کے جزئیات سے انسانیت کی جس معراجِ کمال کا اندازہ ہوتا ہو وہ دوسرے حصّہ کے ساتویں باب میں آپ کے سامنے آئے گا مگر یہاں بھی گزشتہ واقعات وحالات سے آپ کو ایسے صفات نظر آگئے جو حسین کو دنیائے انسانیت کا ایک معیاری نمونہ ثابت کر دیتے ہیں اور اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حسین میں جاذبیت صرف اس وجہ سے نہیں ہو کہ وہ بے گناہ قتل ہو گئے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہر انسان کی فطرت ہی بلکہ اُن کے اوصاف وکمالات جو اُن کے واقعات زندگی سے ظاہر ہیں اُن کی جانب تمام انسانی برادری کے دلوں کو موڑتے ہیں اور ہر باخبر اور کشادہ دل انسان اس پر مجبور رہے کہ وہ حسین کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور ان کی عظمت کا اعتراف کرے

حقیقت یہ ہو کہ ؏ "حسین کی ساری زندگی اور اس زندگی کے تمام محاسن واقعۂ کربلا کے لحاظ سے ایک دیباچۂ کتاب، ایک تعلیمی دور، عظیم الشان عملی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ایسی عادت پڑ جائے کہ گالیاں دینے والے گالیاں دیں اور گالیاں کھانے والا ماتھے پر بل نہ لائے بلکہ اُس کے چہرہ پر تبسّم کی لہر دوڑ جائے۔ جب تلخ وتند گفتگو کے جواب میں نرم وشیریں الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہو جائے۔ تب ہی تو کربلا کی ایذا سہنے کیلئے جگر آئے گا۔ جب کربلا کے پہلے صبر وحلم وبردباری اور خلق عظیم کی عادت پڑ گئی تب کربلا کے معرکۂ امتحان میں قدم رکھا تاکہ پائے ثبات میں لغزش نہ ہو۔"

؏ سید ارشاد حسین صاحب ازہر

حصۂ دوم

واقعۂ کربلا کے اسباب و تفصیلات

(تمہید)

ع۱ "تاریخ کے واقعات مثل روزمرہ کے واقعات کے یا تو اتفاقی واقعات ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ قطعی اسباب کے نتائج کے برخلاف ہنگامی طور پر بغیر کسی پیش بندی کے وقوع میں آئے ہوں۔ قسمت کے سبب واقع ہوئے ہوں یا پھر مشیت الٰہی کا نتیجہ ہوں۔ بہرحال جو صورت بھی سمجھ لیجیے اُن واقعات کا ظہور اُس مبہم قوت کا نتیجہ ہوگا جو اکثر ہمارے بہترین تخمینوں اور نہایت احتیاط سے مرتب کردہ اسکیموں کو منقلب کر دیتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کے قطعی تسلسل کا نتیجہ ہوں گے۔ ممکن ہے اس کہنے پر اکتفا کر لی جائے کہ تاریخ میں اتفاقی واقعات کا فقدان ہے اور اُس کے تمام واقعات کی تحلیل کرنے کے بعد ہم یقین کر سکتے ہیں کہ وہ قطعی اسباب و علل ہی کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن ایسا کہہ دینا جلد بازی اور غلطی کا مرادف ہوگا۔ اس لیے کہ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ تاریخ میں ایسے اتفاقی واقعات بھی پیش آئے ہیں جن کے صحیح وجوہ کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

مثلاً فرانسیسی انقلاب اور اس کے ساتھ کے انتہائی مظالم، اُس کے کورانہ سب و شتم، اُس کے ناپاک غصے کی لہر اور اُس کے انسانیت و اخلاق سوز واقعات کا سبب عوام کے اُس شدید کرب و بےچینی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو صدیوں سے مطلق العنان طبقہ امراء کے پیروں تلے پیسے جانے کی وجہ سے پیدا تھی لیکن اسکے فوراً ہی بعد نیپولین کی درخشندہ اور مستعجل حکومت میں حریت عوام پر پہلے سے زیادہ مصائب و شدائد کی بارش ہونا اور پھر بھی نیپولین کا ایک ہیرو اور نجات دہندہ کی حیثیت سے پوجا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسکی تعبیر کیونکر کی جائے گی؟ ایک دوسری مثال لیجیے اور وہ یہ کہ ہم یہ

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی

مان لیتے ہیں کہ موروگوں کا اسپین سے نکالا جانا اُن کے آپس کے جھگڑے، آپس کے بغض و حسد اور خود موری حکمرانوں کی کمزور اور متزلزل حکمت عملی کا نتیجہ تھا لیکن عبدالرحمٰن جس کے زیرِ قدم سارا یورپ تھا اور جس کے بہادر اور قوی ہیکل سپاہیوں کے لیے فرانس کی تسخیر ایک معمولی کام تھا، وہ چارلس مارٹل کے ہاتھوں کیوں شکست کھا گیا؟ اسے ہم سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ اب جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ تاریخی واقعات یا تو اتفاقی ہوتے ہیں اور یا یقینی اسباب کے ماتحت ظہور میں آتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعۂ کربلا کوئی اتفاقی واقعہ تھا یا یہ کہ وہ بدیہی اسباب کے ایک قطعی تسلسل کے تحت ظہور میں آیا دوسرے الفاظ میں آیا وہ ایک انتہائی جوشیلے گورنر کے مظالم کا نتیجہ تھا جو اپنے شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا یا یہ کہ اس واقعہ کے اسباب ذرا گہرائی میں ہیں؟ جواب کے لیے ہمیں اُس زمانہ کی سیاسی اور سماجی کیفیت کا جائزہ لینا پڑیگا اُن تمام واقعات کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا جو کہ اس واقعہ عظمیٰ کا مقدمہ تھے اور تب ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ واقعۂ کربلا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا ——"

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک واقعہ کے بہت سے اسباب ہوں یعنی سب نے مل کر اُس کے وجود کی تشکیل کی ہو اور ان اسباب میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض تمام جماعتوں کے نزدیک قابلِ قبول ہوں اور بعض کسی خاص جماعت کے نقطۂ نظر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہماری کتاب جونکہ ایک بین الاقوامی ادارہ کی ترجمان ہے اس لیے ہمیں واقعۂ کربلا کے اسباب کا وہی پہلو پیش کیا جا سکتا ہے جو صرف تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے کسی شخص یا طبقہ کے اس حق پر ضرب نہیں لگ سکتی کہ وہ اپنے ذاتی معلومات یا تحقیقات یا مسلمات کی بنا پر اس بارے میں کچھ اور بھی خیال کرتا ہو۔

ہم واقعۂ کربلا کو جس حیثیت سے دیکھتے ہیں اور جس کے تسلیم کرنے پر ہر شخص مجبور رہی وہ یہ ہے کہ واقعۂ کربلا اُس انقلابی کشمکش کی ایک کڑی ہے جو اسلام کا پیغام پہونچنے سے دنیا میں اور بالخصوص ملک عرب میں پیدا ہو گئی تھی اور جس میں پیغمبرِ اسلام کا تصادم ہوا تھا اُن طاقتوں سے جو اُن کے اصلاحی مقاصد میں سدّ راہ بن کر کھڑی ہوئی تھیں —— اس تصادم کی ایک خاص صورت تھی جو کربلا کے میدان میں واقعۂ کربلا کے شکل میں پیش آئی لیکن جس کی صورت انوکھی اور اپنے طرز میں بالکل نرالی تھی۔ جب ایسا ہی تو ہمیں واقعۂ کربلا کے اسباب سمجھنے کے لیے اُس انقلاب کی کیفیت دیکھنا ضروری ہے جو اسلام کے آنے سے دنیا میں پیدا ہوا تھا۔

ع۵ "آیئے بعثتِ رسولؐ سے قبل کے عرب یعنی ایامِ جاہلیت کی سیر کریں اس لیے کہ بغیر اس کے اسلام کے ابتدائی دور میں عرب کے خیالات اور اُن کے رجحانات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے گا۔

ظہورِ اسلام سے تقریباً ایک صدی قبل کا زمانہ جو "ایامِ جاہلیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بالکل غلط طریقہ پر سمجھا گیا ہے۔ مسلم مؤرخین نے اسلام کے قبل کے عرب، اُن کے رسم و رواج، اُن کے عادات و اطوار اور طریقِ بود و باش کو نہایت جوش کے ساتھ بُرا بھلا کہہ کر اُس زمانہ کے عربی سماج کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ انھوں نے عربوں کو صرف بربریت پسند اور تمدّن و تہذیب سے بیگانہ ثابت کیا ہے۔ جن کا محض یہ مشغلہ تھا کہ وہ ذرا سے اشتعال پر قتل کر دیں، انتقامی خونریزی سے لُطف اندوز ہوں، شراب کباب میں مست ہوں مطلق العنان شہوت پرستی کریں، جوا کھیلیں اور اپنے دشمنوں کے اونٹوں اور عورتوں کو چرا لیں یا اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیں۔ جو لوگ واقف ہیں کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ تھا، کاروبار اور تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا اُن کو عربوں کی مذکورہ بالا تصویر کتنی غلط معلوم ہوگی، وہ لوگ جنھوں نے حمیری بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ سے اُن کی تاریخ کا علم حاصل کیا ہے، کتبوں اور روایتوں سے معلومات فراہم کی ہیں، سدِّ مارب، باغِ شدّاد اور تختِ بلقیس ملکۂ سبا کا ذکر سُنا ہے وہ ان مسلم مؤرخین کی روایتوں کو کتنا مبالغہ آمیز سمجھیں گے!

اگر کوئی شخص اس بات کا خیال کرے کہ شمالی عرب جنوبی عرب کی تہذیب و تمدّن سے بالکل غیر متاثر رہا اور بالکل عالمِ بربریت میں پڑا رہا تو اس شخص کی غلط فہمی کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ وہ ایامِ جاہلیت کی شاعری کو ایک نظر دیکھ لے جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اُن کی شاعری یہ بھی ظاہر کر دیگی کہ ایامِ جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے بھی حامل تھے، مثلاً بہادری، سخاوت، مہمان نوازی، وفاداری، راستبازی، شوہری محبت اور برادری انس وغیرہ، خلاصہ یہ کہ شاعری اُن کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اُس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب اگرچہ سادہ اور اکھڑ تھے لیکن شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری بالخصوص اُن میں سے چند کی، اس بات کو بھی ظاہر کر دیگی کہ اگرچہ وہ اُس زمانہ کے دو الہامی مذہبوں کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بُت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ ان دونوں مذاہب کے خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے

ع۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

اُن کا اعتقاد تھا کہ ایک خدائے توانا ہی جس تک وہ اپنے بتوں کے ذریعہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ ظہور اسلام سے کچھ ہی قبل موحدین کا بھی ایک گروہ عرب میں نمودار ہو چکا تھا جو اپنے کو "حنیف" کے نام سے یاد کرتے تھے اور بُت پرستی کو معیوب سمجھتے تھے۔ جب ہم قدیم عرب کے اس خیال پر غور کرتے ہیں کہ کعبہ ابراہیم اور اُن کے بیٹے اسمٰعیل کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور جس کا ذکر قرآن میں "انسانوں کا پہلا (متبرک) گھر" کے نام سے ہوا ہے۔ نیز یہ کہ عربوں کی اکثریت جناب اسمٰعیل کی نسل سے تعلق رکھتی ہے تو ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو سکتا کہ عربوں نے ازمنۂ قدیم کے روایات کو محو کر دیا ہوگا اور اپنے آباؤ اجداد کے تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی سوسائٹی انحطاط پذیر تھی۔ یعنی اگرچہ اُس میں کچھ عمدہ قدیم خوبیوں کا شائبہ موجود تھا لیکن زیادہ تر اس میں بُری عادتیں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ وحشی اقوام کی طرح بالکل سادہ اور معصُوم نہ تھے بلکہ اُن کی مثال اُس جماعت کی سی تھی جو کہ اچھے دنوں سے دوچار ہونے کے بعد اپنی خصوصیات و شرافت کو پس پشت ڈال کر برباد ہو رہی ہو۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرض حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت اُن کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ اُن کے کاروان حجاز اور عراق اور شام میں اب بھی اسباب سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب اُن میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غربت نے انھیں حریص بنا دیا تھا۔ اُن میں خدا کا ایک دُھندلا اور مدھم تخیل موجود تھا لیکن اُن کے بُت اُن کے نزدیک زیادہ مقدس تھے وہ ایک صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ سے متنفر رہنا چاہتے تھے جسے وہ "شعلۂ آگ" یا اُس منحوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام بچے پیدا ہوتے ہیں تشبیہ دیا کرتے تھے لیکن اُن کے ملک کی نوعیت اور خود اُن کی غربت اُن کو مجبور کرتی تھی کہ وہ اپنے ہمسایہ کے مال پر دست تطاول دراز کریں۔ وہ اپنے مردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام کشی کی عادت سے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلاً بعد نسل برابر خونریز جنگیں ہوا کرتی تھیں جن سے کہ سیکڑوں گھروں کو موت اور رنج و غم کا مزہ چکھنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے اس لیے کہ وہ اُن کے جگر کے ٹکڑے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ

اُن کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیز بنادی جائیں، یا اُن کے رحم و کرم پر ڈال دی جائیں
اور اس لیے وہ اُن کی موت کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے بہترین علاج سمجھتے تھے ——"

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ دورِ بربریت و وحشت سے
گزرتی ہوئی قوم میں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ اُن کے دلوں پر جیسا نقش بٹھلایا جائے وہ سادگی
سے اُتر آئے گا اس لیے کہ اسکے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے مگر عربوں کی تمدنی خرابیاں
وہ تھیں جو خود مادی ساخت کے تمدن اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انھوں نے عربوں
کی افتادِ طبع کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساسِ برتری قومیت سے منتقل ہو کر جب انفرادیت کی طرف آتا ہی تو اُس کا نتیجہ ہوتا ہے
باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی یہ بات عربوں میں انتہا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ جسٹس
امیر علی تحریر کرتے ہیں "کلٹ قوم کی نفرت سیکسن قوم سے، آئرلینڈ والوں کی انگریزوں سے،
پولینڈ والوں کی رشن قوم سے صدیوں کے مظالم اور بدنظمی سے ظاہر ہے جس کے ماتحت کمزور قوم
کراہ رہی تھی۔ سیاسی رقابت کلیدہی شدید نفرت کی۔ یورپ میں رسم و رواج کا اختلاف اور
بسا اوقات پیدائش کا اختلاف دو قوموں کے میل جول میں ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہی جو کہ بجبر
ایک ہی حکومت کے محکوم بنا دیئے گئے ہوں لیکن عموماً دیکھا گیا ہی کہ چند صدیوں کے اختلاف و
نزاع کے بعد وہ آپس میں مل جل گئے ہیں، محمد سے قبل عربوں کی حالت پر یہ کلیہ منطبق نہیں ہوتا
رسول کے ظہور سے بہت قبل ہی حمیری زبان جو کہ سامی اور ملکی زبان سے مرکب تھی خالص عربی
کو اپنی جگہ دے چکی تھی۔ یہ خالص عربی زبان بنی مضر بولا کرتے تھے جنھوں نے کہ عوام پر دماغی
تفوق حاصل کر رکھا تھا بقیہ تمام عرب لب و لہجہ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ایک مشترک
زبان بولتے تھے۔ اُن کے رسم و رواج، خیالات، مذاق سب یکساں تھے لیکن ان تمام باتوں
میں یکسانیت کے باوجود ان کے قبائل میں اختلاف و افتراق نہایت نمایاں اور غیر معمولی تھا"

اسی احساس برتری میں انفرادیت کے غلبہ کا نتیجہ تھا کہ مساوات انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی
اور غلبہ، طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی
کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اُس کے قبیلہ کے سیکڑوں بیگناہ

آدمیوں کو مار ڈالا جاتا تھا تب سمجھتے تھے کہ اُس کے خون کا بدلا ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدّنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا، ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی کی بناء پر وہ امتیازات قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

عہ "گالی لاوم فرانسیسی فاضل، مسٹر لیبان، مسٹر ڈوزی، اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے فاضل مُصنف مسٹر لاروس لکھتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی قسمتیں روم اور ایران کے ہاتھوں میں تھیں یہ دونوں حکومتیں یورپ اور ایشیا کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔ سیاسی خانہ جنگیاں، مذہبی فتنہ سامانیاں قہر کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ نہ کوئی سیاسی وحدت تھی۔ نہ کوئی دینی تنظیم۔ رہزنوں اور غارتگروں اور مردم خواروں کے صفات انسانی فضائل میں شمار ہوتے تھے۔ اس وقت ان کی عظمت کا معیار یہ تھا کہ ان کی تلوار کی باڑھیں زیادہ تیز تھیں اور جنگ کے قیدیوں کو یہ جس طرح چاہتے تھے معذب کر سکتے تھے۔ حکام رعایا کے احساسات کے قائل نہ تھے۔ عوام کو ایک بے جان مخلوق سمجھتے تھے جس کے وجود کی مصلحت ہی یہ ہے کہ وہ امراء کی مرضی میں کام آئے۔ مظلوم انسانیت میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان چیرہ دستیوں کے مقابلہ کے لیے خم ٹھونکتی۔"

عہ۲ "اس وقت کی دنیا کا اگر نقشہ سامنے رکھا جائے تو عجیب و رنگی نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو دنیا کے مختلف ممالک اپنی تہذیب، تمدن، معاشرت، فلسفہ، اور ایجادات سے جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر دوسری طرف چند امراء کے سوائے ہر ملک میں عام خلق خدا پریشان و سرگردان پھرتی ہے کہیں پتھر کے دیوتاؤں کے سامنے انسانی خون بہایا جا رہا ہے۔ کہیں اللہ کے بندوں کو شودر کہکر بھیڑ بکری کے مانند ذبح کیا جا رہا ہے۔ کہیں آتشکدوں کی روشنی میں اندھیر۔ انسانوں کو اپنی عیش پرستی اور ہوس رانی کی قیمت قرار دیا جا رہا ہے۔ کبھی اپنے اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے آدمیوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مسل کر پھینک دیا جاتا ہے اور کوئی اُف تک نہیں کر سکتا۔ کوئی اُٹھتا ہے

عہ مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری عہ۲ آغا طاہر نبیرۂ آزاد دہلوی

اور ایک خونخوار جماعت تیار کر کے اللہ کی زمین کو فتح کر کے اس کے بندوں کو غلام بناتا چلا جا رہا ہے۔ کسی کی جنبش ابرو انسانوں پر قتل عام کا فرمان جاری کر کے انسانی خون کا دریا بہا رہی ہے۔ اپنی ہم جنس عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھ کر اُتارا اور پہنا جا رہا ہے۔ اگر کہیں غیرت نے جوش مارا تو زندہ بیٹیوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ اگر آنکھیں بند کر کے تصور کریں تو انسان نہیں بلکہ بھیڑیے ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے دکھائی دینگے۔ انسانیت کے درد و محبت کے بجائے ان کے چہرے جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، خیانت، ظلم و جور کے آئینہ دار نظر آئیں گے۔"

ع۱ "عرب میں کوئی خاص مذہب نہیں تھا۔ ان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ عرب بُت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے اور کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بُت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی۔ واضح رہے کہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے اور بتوں کی ۳۶۰ تعداد سے بھی مطلب یہی تھا۔ تاہم وہ اور دوسرے مذاہب سے بھی نابلد نہیں تھے اس لیے کہ کعبہ جو عربوں کی قومی زندگی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس میں یہود، مجوس، اور نصاریٰ کے ٹھٹھ لگے رہا کرتے تھے مگر یہ مذاہب بھی پستی کی طرف مائل نظر آ رہے تھے۔ اُن کے اعمال ناشائستہ، ان کی دوسرے طبقوں سے بیگانگی، ان میں رواداری کا فقدان اور آپس کی خونریزی ایسے واقعات تھے جو عربوں کے دماغ پر کوئی افادی اثر پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان مذاہب کا ظلم و استبداد بھی حد سے متجاوز ہو چکا تھا اور فطرت انسانی کسی ایسے انسان کی خواہاں تھی جو ان کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔"

ایسے وقت میں ع۲ "محمد بن عبد اللہ پہلو میں ہمالیہ پہاڑ کا ایسا مضبوط دل اور طوفانی سمندروں کی طرح زلزلہ افگن ہمت لے کر اُٹھے اور قربانی کی تیز و تند لہروں سے جاہلانہ تمدن کی کثافتوں کو بہا لے گئے۔ ذہنی و عملی انقلاب پیدا ہو گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق نوع کے مکمل ضابطے بن گئے اور مردہ انسانیت کے چہرہ پر زندگی کی رعنائیاں دوڑنے لگیں۔"

ع۳ "ان کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ وہ محض وحشی لوگوں کو متمدن نہیں بنا رہے تھے

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ پٹنہ   ع۲ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

ع۳ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سُدھارنا چاہتے تھے۔ ان کا کام اُن تمام عقائد و توہمات، رد یاد
مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں۔ رسول اُن لوگوں
کو بردباری، خاکساری، عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے جن کے نزدیک شرافت کمزوری کی دلیل
سمجھی جاتی تھی اور انتقام نہ لینا نہایت ذلت اور کمزوری کی علامت متصوّر ہوتا تھا۔ رسول اُن
لوگوں کو مساوات اور اُخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے
اور اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کی نہایت سختی کے ساتھ حفاظت کیا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے
علاوہ اسلام کو عربوں کی اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اُس نے شراب کی
ممانعت کردی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے
قمار بازی بند کردی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل و جود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخربِ اخلاق
عادتوں کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان
کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے اور یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست
انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں سے برتری کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔"

عـ۵ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولتمندوں کے زیرِ حکومت
مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغامِ آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود
کے درمیان واسطہ بننے کے دعویدار تھے۔ آزادی گروہ امراء کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی
قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقہ
پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ آزادی غلاموں
اور نیچ ذاتوں کے لیے اُن کے مالکوں کے مظالم اور خلافِ انسانیت بیرحمانہ سلوک سے۔
آزادی طبقۂ نسواں کے لیے اُس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل
سے بھی محروم کر دی گئی تھیں۔ آزادی عام انسانوں کے لیے اُن قیود سے جن میں وہ ذات
پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے اُن کی حیاتِ اجتماعی
فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے۔ گروہِ انسانی اس طرح اپنی

عـ۵ خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر

خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا مسلمانوں کے عظیم المرتبت شاعر اور فیلسوف اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے:-

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود ماند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و سلطان و پاپا و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نَے او خوں شدہ

اسلام نے اسے ایک پیغام آزادی سنایا، حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کئے جن سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے غربا مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جو اب تک بڑی بے دردی سے پیسا جا رہا تھا نئی امیدوں اور اپنے کارآمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا۔

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
اعتبارِ کار بنداں را فزود خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انساں را حصارے تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید بندہ را باز از خداونداں خرید
حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ
عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوشِ او وا کردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہونچانا چاہتا تھا۔"

اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ سوائے اس کے مساوات قائم کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ

نہ تھا۔ دولت ایک خارجی شے ہی۔ ممکن ہے مساوات قائم کرنے کے لیے آپ دولت کو برابر تقسیم کردیں لیکن بازووں کی طاقت، موروثی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں ہے اس لیے اُس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اُس نے غور کیا اور صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہی؟ احساس اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہوجائے گی تو اُس کے اجزار میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہوجانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعوے رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصور رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورث اعلیٰ کی نسل سے ہیں، ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوئے اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگت اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہی جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور پر منسوب ہوسکیں۔ دوسری لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اُس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہوجائے گا۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایکا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک ملک والوں کے درمیان رابطۂ اتحاد قائم ہوا تو دوسرے ملک والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آرہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد قائم ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا

ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گورے لوگوں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اُٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اُٹھی اُس نے ادہر والوں کو تو متحد کیا اور اُدھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اُصول کو لیتے ہوئے کہ اتحاد افراد کی بنیاد اتحاد مرکزی پر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے، اور بیچ کے اُن تمام خطوط کو مٹا کر ان کے بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر پھر کچھ رہے نہیں اس لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے کوئی مادی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہوگی وہ محدود ہوگی اور محدود ہونے کے ساتھ اُس میں قریب و بعید کم اور زیادہ کے حدود پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اُس غیر مادی بلند و بالا تر طاقت سے وابستہ کیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اُس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہی جب اسلام نے معبود برحق اور خدائے کل بتا کر سب کا قبلۂ مقصد بنا دیا ہی اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں افراد جامعہ میں احساس اُخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی شے ہی۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورث اعلیٰ کی اولادیں برادری قائم ہو جاتی ہی اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادر وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یک جہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن جائیں، یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

؏ "توحید کے تخیل نے ایک طرف نوع انسانی کو ایک ایسی ارفع و اعلیٰ نوع قرار دیا جس کیلئے دریاؤں، پہاڑوں، آگ، سورج، سانپ، ہاتھی وغیرہ تمام انواع و اقسام کی مخلوقات کو اپنا معبود قرار دینا ایک ناقابل تلافی جرم ہو گیا۔ دوسری لفظوں میں انسان کو یہ سبق پڑھایا کہ کوئی مخلوق یا بالفاظ دیگر کوئی موجود مادی اس کی اہلیت نہیں رکھتا کہ انسان کا معبود بن سکے اور اس کا مالک کہلائے

؏ سید مقصود حسین صاحب نجم امروہوی

دوسری طرف "حکمت عملی" ہیں اسی تخیل نے "مساوات"، "حریت" اور "انصاف" کا سبق پڑھایا یہی تخیل کہ ایک "مادی مخلوق" انسان کی مالک قرار نہیں پا سکتی جب سوسائٹی کے مروجہ اصول و قوانین کو اس کے ماتحت جانچا گیا تو اسی نے انسانی مساوات اور انسانی آزادی کی بنیاد ڈالی۔ اسلام کی آمد کے وقت قبیلہ وارانہ سوسائٹی کا رواج تھا۔ ہر قبیلہ پر اُس کا سردار قابض ہوتا اور مختلف قبیلے ہر وقت اپنی اپنی برتری کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ توحید کی تعلیم نے اس جنگ و جدل کا خاتمہ کیا اور انسان کو یہ سبق پڑھایا کہ تمام انسان ایک ہیں۔ ان کا مفاد ایک ہے اور ان کی مضرت بھی ایک ہی ہے۔ سرداران قبیلہ کی فوقیت ایک غلط چیز ہے اور انسان کی قبیلہ وارانہ تقسیم کا نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس طرح اسلام کی آمد نے قبیلہ وارانہ نظام کے محدود تخیل سے یک بیک انسان کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ تک پہنچا دیا۔"

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغائرت برتی تھی۔ انھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اُس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کو ذکر کرتے ہوئے ایک طنز آمیز انداز میں اس سے مخالفت کی اور اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس بلکہ مسلمانوں کو اقوام عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ھو ربنا و ربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیار امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نئی قدر امتیاز کی قائم ہوگی اور وہ یہ کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہو۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ ع "ایک انسان کو دوسرے انسان پر نسل، رنگ یا وطنیت کی بنا پر نہیں فضیلت حاصل ہوتی بلکہ اعمال و افعال کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ مفاد مجموع کے لیے کارآمد اور ارتقائے تمدن کے ممد و معاون افعال اعمال حسنہ قرار پائے اور عمرانی

ع سید مقصود حسین صاحب نجم امروہوی

زندگی کو مضرت پہونچانے والے کام افعال قبیحہ قرار پائے۔ یہ تمام انقلاب اسلام کی آمد سے ظہور پذیر ہوا جس کی بنیاد "توحید" کے تخیل پر تھی۔"ع۱ "اس انقلاب کی صحیح تصویر کھینچی تھی جعفر بن ابی طالب نے بادشاہ حبش کے دربار میں جبکہ انھوں نے کہا" اے بادشاہ جہالت و بربریت ہم پر محیط تھی ہم بُت پرستی کیا کرتے تھے۔ ہماری زندگی نہایت ناپاک تھی۔ ہم میں انسانیت و اخوت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ "قوت حق ہے" ہمارا قانون و نظام تھا لہذا خدا نے ہم ہی میں سے ایک ایسے شخص کو پیدا کیا جو صحیح النسب، خوش اخلاق اور پاک کردار ہے۔ اُس نے ہمیں توحید کی تعلیم دی اور شرک سے محفوظ رکھا اُس نے ہمیں بُت پرستی اور جھوٹ سے منع کیا فرائض کی انجام دہی کی طرف رغبت دلائی رحم کرنے کی ترغیب دی اور حق ہمسایہ کی عظمت جتائی، اُس نے ہمیں عورتوں کو حقیر سمجھنے سے روکا، اور یتیموں کا مال غصب کرنے سے منع کیا۔ اُس نے ہمیں بُرائی سے پرہیز اور اچھائی کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت کی۔ اُس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور دیگر امور شرعیہ کے لیے حکم دیا۔"

ع۲ "مسٹر باسورتھا سمتھ صاحب ایم۔اے اپنی کتاب "محمد اینڈ محمڈن ازم" میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ سب سے بڑا ہے اور اس کے سوا اور کوئی شے بڑی نہیں ہے۔ یہی مسلمانوں کا مذہب ہے اسلام یعنی انسان کو چاہیے کہ خدا کی مرضی پر توکل کرے اور ایسا کرنے میں نہایت خوش ہو۔ یہی مسلمانوں کا طرز زندگی ہے۔"

لالہ لاجپت رائے صاحب اپنی کتاب "سوانحعمری سوامی دیانند" صفحہ ۷۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس وقت بھارت ورش میں مذہبی کمزوری اپنا پاؤں جمارہی تھی، اُس وقت عرب کے ریگستان میں ایک مہاپرش (عظیم الشان انسان) ایک عجیب و غریب مذہب کی تعلیم دے رہا تھا۔ اسلام کی وحدانیت کیا ہے؟ ایک آتش خیز پہاڑ تھا جس کی اُبلتی ہوئی لہر کے سامنے نہ بُت پرستی ٹھہری نہ انسان پرستی ٹھہری، نہ عیسیٰ پرستی، جہاں جہاں تک یہ لہر پہونچی راستے میں صفائی کرتی چلی گئی۔"

اس نظریۂ توحید سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ع۳ "متحدہ انسانیت کے اسلامی تصور نے عربوں کو نئی زندگی کا پیامبر بنادیا جس نے

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ ع۲ ناموس اسلام ع۳ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

اُن کے اقتصادی مسائل کو بھی تشنہ نہ چھوڑا۔ یہ صحیح ہو کہ مذہب نے اُن پر بہت سی پابندیاں عائد کر کے اُن کی بے اعتدال زندگی کو نئی قیدوں میں جکڑ دیا لیکن اُنھیں دور تک ایک شاندار مستقبل کا رستہ دکھا دیا۔ قوم میں عملی مساوات کو مکمل اور کارآمد بنانے کے لیے رسول نے سود خواری کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا۔ آزاد تجارت کا اصول جاری کیا گیا تھا اور غلّہ کی گرانی کے زمانہ میں غلّہ کو آیندہ منافع کی امید پر چھپا کر رکھنا بہت بڑا جرم قرار دیا گیا تھا۔ ان باتوں نے عربوں کے محدود تصوّر حیات کو اُن کے چھوٹے چھوٹے قبائلی مسائل سے ہٹا کر بڑے بڑے ملکی اور اقتصادی مسائل میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں تاریخ کے ارتقاء کے راہبر تھے اور اگر حالات صحت بخش اور متوازن رفتار سے چلتے رہتے تو وہ ترقیاں جن سے اسلامی ممالک آج بھی محروم ہیں کب کی اپنا اثر ڈال چکی ہوتیں۔"

(۲) اخلاق پر بہت زور دے دیا گیا یہاں تک کہ بانی اسلام نے اپنا مقصد حیات ہی یہی قرار دیا اور اعلان کیا انّما بعثت لاتمّم صالح الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انّما بعثت لاتمّم حسن الاخلاق یعنی "میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہی"۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۲۸) مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ تمھیں تمھارے اعمال کی سزا نہ ملے گی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائیگا۔ مُسلمان وہ ہے جو احکام خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مُسلم کی شان نہیں ہے۔ جو مستحق ہو اُس کے آگے سر خم کرنا اسلام کا درس ہی۔ تم اس کے پیرو جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اس کے احکام کی تعمیل کرو ورنہ اُس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ اُمّت مرحومہ میں شامل ہونے کے قابل۔

عـہ "واشنگٹن ارونگ کے خیال میں رسول کا "نظریۂ خیرات" ہمدردی، اور رحمدلی کے بڑے حدود کو محیط تھا۔ رسول کہا کرتے تھے کہ ہر اچھا کام خیرات ہی۔ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا خیرات ہی۔ انسان کو عمدہ کاموں کی ترغیب دینا خیرات ہے۔ بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرنا خیرات ہی۔ اندھوں کی مدد کرنا، راستے سے پتھر اور کانٹوں کو دور کر دینا۔ یہ سب خیرات ہی کے ضمن میں آتے ہیں۔ رسول زبان کی خیرات پر جو بہت ضروری ہے اور جس کی

عـہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہی بہت زور دیا کرتے تھے۔ ابو جاریہ جو کہ بصرہ کے باشندہ تھے مدینہ میں جب آئے تو رسول سے کچھ اخلاقیات کے ملتجی ہوے۔ رسول نے انھیں ایک چیز بتائی اور وہ یہ کہ کسی کی بُرائی نہ کیا کرو۔ ابو جاریہ کا بیان ہی کہ اُس روز سے میں نے کسی شخص کو چاہے وہ آزاد ہو یا غلام بُرا بھلا نہیں کہا اسلامی قوانین زندگی کے اخلاقیات اور تواضع کے آخری حدود تک پہونچے ہوے ہیں۔ اسلام کی ہدایت یہاں تک ہی کہ کسی گھر میں داخل و خارج ہوتے ہوے لوگوں کو سلام ضرور کرو۔ اپنے دوستوں جان پہچان والوں اور راہگیروں کو سلام کر لیا کرو۔ سوار کو چاہیے کہ پیادہ کو سلام کرے۔ جو گزر رہا ہو اُسے بیٹھے ہوے لوگوں کو سلام کرنا چاہیے ایسا کوئی مذہب نہیں ہے جس میں حیوانی زندگی کے لیے اتنے مُستند دستور العمل موجود ہوں قرآن حکیم کا ارشاد ہی کہ زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں اور کوئی طائر نہیں مگر یہ کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ہیں اور خدا ہی کی طرف پلٹیں گے۔" آگے واشنگٹن ارونگ لکھتا ہی کہ مشرق میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہی جو جانوروں پر مظالم کو روکے۔ اس کا سبب تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ چند سال کے قانون نے جس بات کے لیے اب کوشش کی ہی وہ بہت زمانہ ہوا عرب کے عظیم المرتبت پیغمبر نے انجام دیدیا تھا"

(۳) معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات اور اصلیت میں ایک ہی ہیں (خلقنا کم من نفس واحدۃ) قبائل کی طرف اُن کا انقسام صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہی (انا جعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا) مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہی (لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی) فضیلت و بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ وابستہ ہی۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے مؤذن اپنا بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہی کہ اذان دے! تو قرآن کی آیت اُتری (یا ایھا النّاس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، انمیں کوئی فرق نہیں (اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ص۲۵)

(۴) عے۵ "اسلامی سیاست سے پہلے عرب میں جتنی حکومتیں ہوئیں وہ ایسی ہی تھیں جیسی

عے۵ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

عموماً دنیا میں ہوا کرتی ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ پیغمبر اسلام نے اس استبدادی حکومت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ چاہتے تھے نہ صرف عرب میں بلکہ تمام دنیا میں الوہی سیاست قائم کریں۔"

مولانا عبد الحامد صاحب بدایونی فرماتے ہیں "اسلام در اصل حکومت الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے اسلامی حکومت کا دارومدار عدل و انصاف پر قرار دیا گیا ہے چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعمّا یعظکم بہ (سورۂ نساء) ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الّا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (مائدہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لیس لاحد علیٰ احد فضل الا بدین وتقویٰ۔"

عہ "ماہرین علم النفس جانتے ہیں کہ ہر تمدن کی بنیاد تین اصولوں پر قائم ہے۔ مذہب، فنون لطیفہ سیاست جن میں سے مذہب کی طاقت باقی دو اصولوں سے مسلمہ طور پر زائد ہوتی ہے۔ اسلامی تمدن کے بانی نے اس مغائرت کو مٹا کر یہ چاہا کہ فنون لطیفہ اور سیاست کی جگہ بھی مذہب ہی کو حاصل ہو تاکہ قوت میں انتشار نہ ہو اور دین و دنیا ایک ہو کر باہمی تصادم کی خلش مٹ جائے۔ شک نہیں کہ خواہش ہر تمدن کے بانی کی یہی ہوتی ہے کہ وہ محکم اصولوں کی تلاش و جستجو کرے۔ بانی اسلام نے ایسا ہی کیا لیکن قابل ستائش وہی مؤسس و قائد ہے جو

(۱) اپنے اصولوں کو ہموار سطح پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

(۲) جو بیشتر سہولتیں عملی راستوں میں پیدا کر دے۔

(۳) جو تمام انقلابات کے مقابلہ کے واسطے غیر متزلزل اصول بتادے۔

(۴) جو تمام طبائع اور فطرت کے اقتضاء کے مناسب اصول وضع کرے۔

(۵) جو دوسروں کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کو کم سے کم گنجائش دے۔

(۶) جو دوسروں سے خود بھی بلا وجہ تصادم و مزاحمت نہ کرے۔

(۷) جو کسی فرد یا افراد سے مخصوص نہ ہو۔ عام مخلوقوں کی احتیاج کو پورا کرے۔

عہ علامہ ہندی

(۸) جس میں دین و دنیا میں ایک دوسرے سے مزاحمت نہ ہو۔
اسلام کو انہی خصوصیات کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ مذہب اسلام نے سیاسیات اور فنونِ لطیفہ کے صرف اُن شعبوں کو رد کیا جو امور رہشت گانہ کے خلاف ہیں نہ کہ عام امور مثلاً گانا، بجانا، آلات لہو کا استعمال اور اُن کا بنانا۔ یہ اسلام نے حرام قرار دیا ہے محض اس لیے کہ دنیا سعی و کوشش جد و جہد، عمل، محنت و مشقت، جفاکشی کے لیے بنائی گئی ہے سستی، کاہلی، لہو و لعب، بیکاری اور قوائے بہیمیہ کو ہیجان میں لانا بدترین شے ہے۔ بت تراشی کو اسلام نے حرام قرار دیا اس لیے کہ یہ بُت پرستی کا ذریعہ بنتی ہے جو انسانی شرافت و خودداری کے خلاف ہے۔ لیکن ان سے بہتر اور مفید شعبوں کا اسلام نے خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ بہت سے غیر منکشف اسرار کو بتا کر نوعِ انسانی کی توجہ اس طرف مبذول کی تاکہ ان کو اختیار کر کے انسانی ضروریات کے دسترس کو محدود فضا سے باہر لایا جائے۔ اسی طرح سیاسیات۔ مذہبی عبادات سے لے کر معاملات تک ہر شے میں سیاسی و اجتماعی پہلو مضمر ہیں اور اسلام کا کوئی اصُول بھی سیاست سے خالی نہیں مگر اسلام میں ہرگز اُس سیاست کو جگہ نہیں مل سکتی جہاں خود غرضی ہو، چالاکی ہو، حیلہ سازی ہو، سرمایہ داری ہو یا مزاحمت ہو۔"

غرض یہ ہے کہ اسلام میں سیاست "حصُولِ اقتدار کے کامیاب ذرائع کے استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک و ملّت کے صحیح نظم و ضبط اور امورِ خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی۔ مثال میں خود حضرت پیغمبر کی ذاتِ گرامی ہے۔ باسورتھ اسمتھ لکھتا ہے۔ "سیاسی رہبر اور مذہبی پیشوا یعنی قیصر اور پوپ دونوں کے فرائض محض ایک شخص انجام دے رہا تھا۔ وہ پوپ ضرور تھے لیکن پوپ کی ریاکاریوں سے پاک وہ قیصر بے شک تھے لیکن کثرتِ افواج سے بے نیاز۔ بغیر کسی مسلّح فوج کے، بغیر کسی دنیاوی محافظ کے، بغیر کسی محل کے اور بغیر کسی معینہ آمدنی کے۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے کا مدعی ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی طرف کا بھیجا ہوا بادشاہ تھا تو یہ صرف محمدؐ کی ذات ہے۔ وہ بغیر ذرائع کے تمام قوتوں کے مالک تھے خطابات اور رسمی باتوں سے بلند تھے اور دربار کی آداب و قواعد سے الگ تھے۔ وہ حق کے طالب تھے۔ لباس اور قوت کے مشتاق نہ تھے۔ اُن کی اندرونی اور بیرونی دونوں زندگیاں یکساں تھیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے "عدیم المثال خوش قسمتی سے تاریخ میں محمدؐ ایسی کوئی ایک

ہستی بیک وقت تین فرائض انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی یعنی یہ کہ محمدؐ ایک قوم کے بانی ہوئے ہیں۔ ایک سلطنت کے بانی ہوئے ہیں اور ایک مذہب کے بانی ہوئے ہیں۔ ایسی مثال کوئی دوسری نہیں مل سکتی۔"

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ محمد مصطفٰےؐ نے اُس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "اُن کو ہر شخص پر خود اُس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے" کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قرشی عورت کا بیٹا ہوں جو شوربے میں روٹی چور کر (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی (طبقات ابن سعد ج اقسم ا مطبوعۂ لیدن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۴)

یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں شریعت الٰہیہ کی رہبری سے الگ حکمران کا کوئی مستقل تخیل پیدا نہ ہو اور سوائے خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

عـ۱ "چونکہ رسول اللہ کی تعلیم آسان اور دل میں اُتر جانے والی تھی "جیو اور جینے دو" کے زرین قاعدے اس میں پوشیدہ تھے، نیک دل لوگ جوق در جوق اسی دین میں آنے شروع ہوگئے" اس کے علاوہ عـ۲ "عوام کو جذب کرنے کے لیے اسلام نے بہت سی جاذب چیزیں پیش کیں اور قدیم روایات و خصوصیات کو ترک کر دینے پر اُن کو خوب دولت و ثروت دی۔ اسلام نے اُن کے تحفظ اور بچاؤ کا بندوبست کیا۔ سوسائٹی میں اُن کے وقار کو اتنا بلند کیا جس کا کہ خیال وہ ایام جاہلیت میں کبھی بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسلام نے غریب ترین انسان کو انتہائی دولتمند کے برابر قرار دیا۔ غلامی کی بدنصیبی کی زحمتوں میں کمی پیدا کرائی اور عورتوں کے مرتبہ کو بلند کرایا ان باتوں سے عربوں نے شروع میں تامل و اکراہ کیا اور وہ متزلزل و غیر مطمئن رہے لیکن پیغمبرؐ کی پکار نے رفتہ رفتہ ان کے دلوں کو مسخر کر لیا اور وہ بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے" اور وقتی طور پر اور ایک دم سے اُس نے قوم میں ایک ایسی کایا پلٹ کر دی جسے حیرت انگیز کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا عـ۳ "پیغمبرؐ کی تاریخ تربیت کا نمایاں ترین معجزہ یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کے کانوں میں زندگی

عـ۱ آغا طاہر نبیرۂ آزاد عـ۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب عـ۳ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامل پوری

کے معنی اپنے خاص انداز سے اس طرح ڈال دیئے کہ ہر مُسلم کو اُس کے اعتمادِ نفس اور ایمان نے سَو سَو آدمیوں کے مقابلہ میں بنا دیا تھا۔ اسلام نے ہر مُسلم پر واضح کر دیا تھا کہ زندگی کا آخری مقصد عمل اور بنی نوع انسان کو مجموعی حیثیت سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ راستے پر لگانا ہے" ع۹ آنریبل سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد کی جلد دوم کے صفحہ ۲۶۹ و ۲۷۱ مطبوعہ ۱۸۶۱ء میں تحریر کرتے ہیں کہ "ہجرت سے تیرہ برس پہلے تو مکہ ایسی ذلیل حالت میں بیجان پڑا تھا مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا کہ سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بُت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی اور اپنے اعتقاد کے مطابق وحی الٰہی کی ہدایت کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ اُس قادر مطلق سے بکثرت و بہ شدت دعا مانگتے۔ اُسی کی رحمت پر مغفرت کی امید رکھتے اور حسنات و خیرات اور پاکدامنی اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اب اُنھیں شب و روز اُسی قادر مطلق کا خیال تھا اور یہ کہ وہی رزاق ہمارے ادنیٰ حوائج کا بھی خبر گیراں ہے"

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی عمارتی تشکیل کا تعلق ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں یہ خواب ایک مطابق تعبیر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے آگیا اور لاکھوں آدمی اُس کے تسلیم کرنے والے اور اُس کو حق کہنے والے ہو گئے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس انقلاب کے پیدا کرنے میں رسول کو کتنی دقتیں در پیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت پسندی یا قدامت پرستی کے امتیازات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری "آفتاب کی روشنی سب کو نہیں بھاتی۔ چمگادڑ کے لیے مہر نیمروز کی شعاعیں اور تیروں کی بارش یکساں ہے۔ اس کی آنکھوں کا سرمہ تاریک رات کی اندھیاری ہے جس میں چاند مُنھ لپیٹے پڑا ہو اور تارے آنکھ موندے سو رہے ہوں۔ اسی طرح اصلاح و ہدایت کا خیر مقدم سب انسان ایک طرح نہیں کرتے" کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ اُلفت رکھتے ہیں اس لیے اُنھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بغض للّٰہی" ہوتا ہے "بغض للّٰہی کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اُس انقلاب کا اُن کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور اُنھیں اُس سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے مفاد

ع۹ ناموسِ اسلام

قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور اُنھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ یہ منافع خواہ مالی حیثیت کے ہوں یا وجاہت و اقتدار کی حیثیت کے۔ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اُس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اُس سے مختلف طرح کے ذاتی نقصانات بہت سی قسم کے لوگوں کو پہونچ رہے تھے یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے اُن مہاجنوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنے ہوس دولتمندی کے پورا کرنے پر تھی۔ پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو اور ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو مقناطیسی کشش کے ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر مہاجن اور سرمایہ دار لوگ خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ جبکہ اُن کی زندگی کا دارومدار جن لوگوں کے روپیہ پر تھا اُنھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی یہ تعلیم کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اعمال و فرائض کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہوسکتا اُن لوگوں کے اقتدار پر کاری ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی جائداد پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریۂ تفوق و امتیاز بدل کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبانِ اقتدار جتنے تھے وہ چونکہ اسلامی معیار عزت کے لحاظ سے (۰) کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے اور جو لوگ پردیسی ہونے کی وجہ سے یا غریب ہونے کی وجہ سے یا اُن لوگوں کی نگاہ میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ اُٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جاتے تھے وہ بڑے صاحب عزت ہو گئے اس لیے کہ وہ عمل کی کسوٹی پر پورے تھے اور پرہیز گاری اور تقویٰ میں درجۂ کمال پر فائز تھے یہ بات اُن لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیسے گوارا ہوسکتی تھی جو اب تک عزت کی مسندوں پر اطمینان کے ساتھ براجرہے تھے اور جو خلقِ خدا کو خدا کے بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

چنانچہ عـہ ،، کے باشندوں میں اسلام اس نئی روح کے پھونکنے اور اخلاق کا یہ نیا معیار

عـہ خواجہ غلام السیدین صاحب

قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ نفسیات کے اس بڑے تجربہ اور تمدن کی اس نئی تنظیم کو رد عمل اور ظلمت کی خوفناک طاقتوں سے تصادم پیدا ہوا۔

عـ۵ اسلام کے بنیادی اصولوں کی اجنبیت اور ندرت ایسی چیز نہ تھی جس نے کہ انھیں رسول کے خلاف بغاوت پر مائل کیا ہو بلکہ جو چیز اس بغاوت کا سبب ہوئی وہ یہی کہ اسلام اُنھیں سدھارنا چاہتا تھا، ان کے سماج کی پوری عمارت کو نئے طریقہ سے بنانا چاہتا تھا اور اُن کی مرغوب ترین رسموں کو فنا کر دینا چاہتا تھا جس طرح یہودی فقہا نے عیسیٰ کے خلاف بغاوت کی تھی جو کہ اُنہی میں سے ایک تھے اور اُن کے فلاح و بہبود کے خواہاں تھے بس اسی طرح رسول سے بھی مقابلہ کرنے والے عرب انتہائی غیظ و غضب، بغاوت کے پورے عزم اور شدید قسم کے مظالم کے لیے تیار تھے جس طرح کورانہ سب وشتم اور نفرت نے یہودی پادریوں کو جناب عیسیٰ کے خون کا پیاسا کر دیا تھا اسی طرح عرب میں ایک خاندان جو کہ رسول سے برسرپیکار ہو گیا اگرچہ کسی مذہب کے ارکان پر مشتمل نہ تھا۔ تاہم اپنے ذاتی اغراض و مقاصد رکھتا تھا جس کو کہ اسلام اُن سے سلب کرنا چاہتا تھا پہلے تو اُنھوں نے (بخیال خود) اس "معمولی انسان" اور "پاگل شاعر" کی بات پر قطعاً توجہ نہ کی بلکہ وہ رسول کا مضحکہ اڑاتے اور طنز و استہزا کرتے رہے لیکن اُنھیں بہت جلد ہی احساس ہوا کہ یہ "پاگل شاعر" بہرحال نرا پاگل ہی نہیں تھا اور یہ کہ اس کے الفاظ اُن کے قوت و اقتدار کو صدمہ پہونچانے کے لیے کافی ہیں وہ نہایت تفکر و تشویش کے ساتھ رسول کے پیروؤں کے بڑھتے ہوئے حلقے کو دیکھ رہے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ چھوٹی سی نالی چشمہ کی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور بہت جلد اپنے سیلاب میں اُن کو اور اُن کے مقاصد کو بہالے جائے گی وہ اب نہایت شدت اور انہماک کے ساتھ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے کوشاں ہوئے اُن کی مخالفتیں استحکام حاصل کرتی گئیں اور اُن کی دشمنی رسول کی ہر نئی کامیابی کے ساتھ بڑھتی گئی۔" ان کے ہاتھوں پیغمبر کو غیر معمولی تکالیف اور شدائد کا سامنا کرنا پڑا جن کا آپ نے غیر معمولی استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مکہ کی آپ کی زندگی ان دکھ بھری داستانوں سے بھری ہوئی ہے اس مخالف جماعت میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے بہت پیش پیش قبیلہ بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا جو امام حسین کے قاتل یزید کا دادا ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت

عـ۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

بہت قدیمی تھی۔ اتنی قدیمی کہ عوام نے اُس کو ایک طبعی اور قدرتی بات سمجھ لیا اور اس کے لیے یہ حکایت بیان کی جانے لگی کہ ابوسفیان کا پردادا عبدالشمس اور بنی ہاشم کے مورث اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انگلی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ مجبوراً تلوار لائی گئی اور درمیان سے کاٹ کر الگ الگ کئے گئے اس وقت کاہنوں نے کہدیا کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی۔ یہ حکایت درست ہو یا نہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہی کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی جڑ پکڑلی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں عبدالشمس اور ہاشم میں جنگ یا منازعت کی کوئی مثال نہیں ملتی بے شک عبدالشمس کے بعد امیہ کی طرف سے مخاصمت کی ابتدا نظر آتی ہی جبکہ وہ اپنے چچا حضرت ہاشم کے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اُس نے ایک شکست خوردہ فریق کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ حال ہو گئے حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں سے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اُس کی روٹیاں پکوائیں اور اُنھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ اُن روٹیوں کو اُنھوں نے چورا کرایا اور اُن اونٹوں کو نحر کر کے شوربا تیار کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں اُنڈلوا کر وہ تمام روٹیوں کا چورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا اس کھانے کو عرب میں "ثرید" کہتے تھے۔ اس طرح اُنھوں نے تمام مکہ کے لوگوں کو کھانے سے سیر کیا اتفاق سے اسی کے بعد ابر آیا۔ پانی برسا اور قحط سالی دُور ہوگئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو "ہاشم" کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنی ہیں روٹیوں کا چورا کرنیوالا شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا ہے:۔

عمرو العلیٰ ھشم الثرید لقومہٖ ورجال مکۃ مسنتون عجاف

"بلند مرتبہ عمرو نے (یہ ہاشم کا اصلی نام ہی) اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے اُنھیں کھانا کھلایا اس حالت میں کہ تمام مکہ کے لوگ قحط سے بھوکے اور تباہ حال ہو رہے تھے"

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اُس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اُسے غیرت دامنگیر ہوئی اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اُتارنے کی کوشش کی مگر اتفاق سے وقت کی بات یا یوں کہئے کہ دل کی بات کہ وہ ہاشم کی نقل اُتارنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا اور

اُس کا یہ طرزِ عمل تمام قریش میں اُس کی رُسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی قصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اُس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحب فخر و لائق عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن لوگ منتخب کئے جاتے تھے جو علم قیافہ اور نجوم میں بھی بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے اُمیّہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر آپ کو معلوم ہے کہ لوگ ان باتوں سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو تانا تشنا شروع کر دیا اور مجبور کیا۔ آخر آپ کو بھی جوش آ گیا اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمین مکہ میں نحر کئے جائیں۔ اور دس برس کے لئے وہ مکہ سے جلاوطن ہو جائے۔ اُمیّہ اس شرط پر رضامند ہو گیا اور قبیلۂ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا۔ اُس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اُمیّہ کے خلاف کیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کئے اور اُنھیں نحر کرا کے پھر تمام اہل مکہ کی دعوت کر دی اور اُمیّہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ ہاشم اور امیّہ کے درمیان پہلی عداوت تھی (طبقات ابن سعد مطبوعۂ لیدن (ہالینڈ) ج ا قسم ا صفحہ ۴۳ و ۴۴)

اب عرب قوم کی کینہ پروری تو آپ سُن ہی چکے ہیں۔ کیا یہ داغ اُمیّہ اور اُس کی اولاد کے دلوں سے مِٹ سکتا تھا؟ پھر جبکہ بنیاد اُس کی حسد پر تھی اور حسد کی بنیاد فریق مقابل کی رفعت اور امتیاز کے حصول پر اور اس رفعت اور امتیاز میں اُس فریق کے اُس کے بعد اضافہ ہوتا جائے تو شکست خوردہ فریق کے حسد میں بھی اُسی تناسب سے اضافہ ہونا ناگزیر ہے اور اس حسد کے شعلے جتنے بھی اُٹھ سکتے ہوں وہ اُٹھتے رہنا لازمی ہیں۔

یہ بھی ایک بات آپ کو اس واقعہ میں ملے گی کہ اسی وقت سے اُمیّہ کی خصوصیت شام سے اور ہاشم کی خصوصیت حجاز سے قائم ہو گئی ہے۔ اس کا تاریخ کے آئندہ دور میں اس صورت سے قائم رہنا چاہے اتفاق کہہ لیجیے اور چاہے اس کی کوئی دوسری تاویل کر سکتے ہوں تو کیجیے۔ یہ آپ کو واقعہ

کے لحاظ سے اس کا پہ راحت حاصل ہے۔

ع۱ "بار بار شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیہ نسلی طور پر عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور اُن کے اندر دناءت، فریب، احساس کمتری اور دوسرے اس طرح کے مرکبات پیدا ہو گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کے یہاں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں سامنے سے مقابل پر حملہ کے لیے نہیں اُٹھتیں بلکہ وہ بغل سے یا پیچھے سے حملہ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر خاموش معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کا ہر قدم کسی سازشی حکمت عملی کے لیے اُٹھتا ہے"

بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افراد عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابل غور بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔

ع۲ "رسالہ تنزیہ الانساب میں جس کے مصنف مولوی محمد ماہ عالم صاحب چشتی ہیں حصہ دوم باب چہارم میں ابو سفیان کے نسبی سلسلہ کے متعلق لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ عبدالشمس کا کوئی فرزند امیہ نامی نہ تھا۔ ہاں ایک غلام ذکوان نامی تھا جس کو امیہ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اصابہ ابن حجر عسقلانی جلد اول ص۶۱۵ میں ہے کہ جب ثوب دربار معاویہ میں پہنچے تو اُنھوں نے اثنائے کلام میں معاویہ سے کہا کہ تم لوگ جھوٹا دعوےٰ کرتے ہو کہ امیہ عبدالشمس کا بیٹا تھا بلکہ حقیقت میں ذکوان غلام عبدالشمس تھا جس کو حقیر سمجھکر لوگ امیہ کہتے تھے۔ کتاب روض الانف سہیلی میں ہے کہ ایک بار معاویہ نے دغفل صحابی سے جو بہت کبیر السن تھے پوچھا کہ آپ نے حضرت عبدالمطلب کو بھی دیکھا تھا اُنھوں نے کہا ہاں دیکھا تھا وہ شیخ جسیم ووسیم تھے۔ ان کے دسوں بیٹے تاروں کی طرح گھیرے رہتے تھے۔ پھر معاویہ نے پوچھا کہ آپ نے اُمیہ کو بھی دیکھا تھا۔ کہا ہاں دیکھا تھا، وہ چندھا، کرنجا اور بدشکل عبدالشمس کا غلام تھا۔ معاویہ نے کہا وہ عبدالشمس کا بیٹا تھا۔ کہا ہاں تم لوگ ایسا ہی کہتے ہو مگر حقیقت میں وہ ذکوان غلام عبدالشمس تھا اور اُسی کو اُمیہ کہتے تھے"

عرب قوم کے یہ تاثرات بنی امیہ دیکھتے تھے اور گھبرا گھبرا کر بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ اُنھیں ناکامی ہوتی تھی۔ ع۳ "بنی ہاشم کی ہر ترقی بنی امیہ کی اُمنگوں کا تابوت بنتی جا رہی تھی اُنھیں یہ اچھا تھوڑی معلوم ہوتا تھا کہ عبدالمطلب کو "سیدالعرب" کہا جائے یا خانہ کعبہ

ع۱ سید احتشام حسین صاحب ہاشمی ایم اے ع۲ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی ع۳ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں یا عرب کے دور دراز کے لوگ جب آئیں تو عبدالمطلب ہی کا پتہ پوچھتے ہوئے آئیں۔ لیکن ہوتا یہی تھا ـــــ محمد مصطفیٰؐ بھی اُٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی چوٹ تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔" مولانا شبلی سیرۃ النبی جلد اول ص۱۵۸ پر لکھتے ہیں کہ "آنحضرت کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت کی مخالفت کی۔" حقیقۃً ع۱ "اب اس کا موقع نہیں رہ گیا تھا کہ بنی امیہ خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے بیٹھے رہیں اور بنی ہاشم کو عزت کے ساتھ ترقی کی روشن منزل میں قدم رکھتے ہوئے دیکھیں اور خود اپنے کو وقار و عزت کی مسندوں سے برطرف پائیں۔ ان کا دنیاوی اقتدار، عرب میں اُن کا سیاسی اثر اور اُن کے تمام ذاتی اغراض اس وقت خطرہ میں تھے اور اس لیے انھوں نے شدید مخالفت کا محاذ اسلام کے خلاف قائم کر دیا اور اس نئے مذہب کی ترویج و اشاعت میں روڑے اٹکانے لگے۔" اس وقت بنی امیہ کے روایتی خصوصیات کا ورثہ دار ابوسفیان ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ ع۲ "اُس نے دیکھا کہ محمدؐ کی آواز نے سارے عرب کو ہلا دیا ہے۔ اس وقت وہ اگر محمدؐ سے ٹکرائے گا تو سارا عرب اُس کو پہچان لے گا اس لیے اُس نے عرب کے اوباشوں کو اکٹھا کیا اور سب کو حضرت محمدؐ کے خلاف اُبھار دیا۔" آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں جسم پر پتھر مارے گئے۔ سر پر کوڑا پھینکا گیا۔ نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس سلسلہ کے کچھ واقعات کا تذکرہ پہلے حصہ میں آچکا ہے۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھا تو حضرتؐ کے چچا ابوطالب نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ ع۳ "ابوطالب کا رسول کو آخری مرتبہ پھر پناہ دینا تھا کہ ان قریشیوں میں بے حد خفگی بڑھ گئی اور اسی کو بہانہ بنا کر ابوسفیان نے اپنی جماعت کو تیار کر کے تمام قریش سے ہاشمیوں کا بائیکاٹ کرا دیا اور ایک عہد نامہ جاری کیا گیا جس کی رو سے ہاشمیوں سے نہ شادی بیاہ جائز ہوگا اور نہ اُن کے ساتھ تجارت جائز ہوگی یہاں تک کہ ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہونچنے نہ دیا جائے گا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال یعنی ۶۱۶ء کا ہے۔" تین برس کے بعد یہ بائیکاٹ ختم ہو گیا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے تو کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ابوطالب اور خدیجہ کی وفات کے بعد اس مخالفت نے

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی ع۲ مولانا مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری ع۳ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ۔

اتنا زور پکڑا کہ آپ کو ختم کر دینے کی پوری اسکیم تیار کر لی گئی جس کے بعد مجبوراً آپ کو اپنے دیس سے نکل کر پردیس کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔

مدینہ میں آکر بھی مخالفین نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ایک طرف تو اُن لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانے لگے۔ حالت یہ تھی کہ ع[1] "قریشیوں نے جن مردوں اور عورتوں کو اسلام قبول کرتے ہوئے دیکھا اُنھیں عرب کی چلچلاتی دھوپ اور تپتی ریت کی نذر کر دیا جب وہ شدت تشنگی سے جاں بلب ہو جاتے تو اُن کے سامنے بُت پرستی کی قدیم رسموں کی طرف پلٹنے یا پھر موت قبول کرنے کی تجویز پیش کی جاتی۔ ایسے لوگوں میں سے ایک **بلال** بھی تھے جو "حبش کے پہلے ثمر" اور "اسلام کے پہلے مؤذن" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اُن کا مالک **امیہ بن خلف** ہر روز بطحا کی تپتی ریگ پر اُنھیں لٹا کر ایک بھاری پتھر اُن کے سینہ پر رکھتا تھا لیکن اذیت رسانی کی یہ تمام تدبیریں بے سود ہوتی تھیں۔ بیچارے **یاسر** اور اُن کی زوجہ **سمیہ** کی ظلم وستم سے زندگی ہی ختم کر دی۔ **عمار** کو بھی سخت تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔"

دوسری طرف آپ کے جائے پناہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ اُن لوگوں کے گھر بار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدان مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آکر ہوئی **بدر** کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے صرف تین سو تیرہ [۳۱۳] آدمی جن کے اندر سوار ہونے کو صرف دو [۲] گھوڑے اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلواروں نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ حضرت **حمزہ بن عبد المطلب**، حضرت **عبیدہ بن حارث** اور حضرت **علی بن ابیطالب** نے وہ کارنمایاں دکھلایا کہ مخالفوں کی ہمت پست ہوگئی اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہونچا کہ حضرت **عبیدہ** اس جنگ میں شہید ہوگئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ع[2] "اس میں ابوسفیان کو محض اپنے بیٹے حنظلہ کی وفات ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا بلکہ اُس کا ایک دوسرا بیٹا عمرو بھی قید کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح اُس کی بیوی **ہندہ** کو بھی اپنے باپ **عتبہ** اور اپنے

ع[1] سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ   ع[2] سید امتیاز حسین صاحب

بھائی ولید کا ماتم کرنا پڑا۔ ابوسفیان نے دو سو تیز سواروں کو اکٹھا کیا اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک بوری ستو کی دی۔ جب وہ بڑھا تو اُس نے عہد کیا کہ وہ اُس وقت تک سر میں تیل نہ لگائے گا، ڈاڑھی میں خوشبو نہ لگائے گا اور نہ کسی عورت سے مطلب رکھے گا جب تک کہ وہ رسول سے مڈبھیڑ کر کے علی اور حمزہ کو قتل نہ کرے۔ مدینہ کے حدود میں تقریباً تین میل پہونچ کر اُس نے رسول کے دو پیرووں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ رسول مع اپنے پیرووں کے جنگ کے لیے نکل پڑے ابوسفیان مقابلہ کے وقت اپنے تمام قول وقسم کو بھول گیا اور گھوڑے کو مہمیز دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ فوج والوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ستو کی بوریوں کو اپنے پیچھے پھینک کر بھاگے اس جنگ کو اسی وجہ سے جنگ "سویق" کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سویق کے معنی ستو کے ہیں۔

ہجرت کے تیسرے سال اسلام کے لیے وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحد کی جنگ کہتے ہیں عکرمہ بن ابی جہل۔ ابوسفیان اور ہندہ کو اُس وقت تک کہاں چین پڑتا جب تک کہ وہ مدینہ والوں سے انتقام نہ لے لیں۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں اُن کی فوج میں قریشیوں کے علاوہ خاندان کنانہ اور تہامہ کے قبیلے بھی شامل تھے۔ فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے جن میں سات سو زرہ پوش تھے عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے افسر تھے اور خاص بات یہ تھی کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ چل رہی تھی جس کے ہمراہ پندرہ ۱۵ مکہ کی عورتیں تھیں ان کے ہاتھوں میں ڈھول تھے اور میدان جنگ میں وہ ڈھول بجا بجا کر بہادروں کی ہمت افزائی کر رہی تھیں"۔ ہندہ کے یہ اشعار اس موقع کے بہت مشہور ہیں:۔

نحن بنات طارق نمشی علی النمارق

ان تقبلو نعانق او تدبروا نفارق

فراق غیر وامق (استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۷۸۶)

"طارق" ستارے کی صفت آتی ہے اور اس لیے اگر یہ اشعار خود ہندہ ہی کے نظم کیے ہوئے ہیں تو یہ معنی ہیں کہ ہم حسن و جمال میں یا بلندی مرتبہ میں ستارہ ہائے فلک کی لڑکیاں ہیں، ہم ناز و نعمت سے ریشمی گدّوں پر چلنے پھرنے والیاں ہیں۔ اگر تم دشمن کے مقابلہ میں پیش قدمی کرو گے اور آگے بڑھتے جاؤ گے تو ہم تمھیں اپنے گلے سے لگائیں گے اور اگر تم پیٹھ پھراؤ گے تو ہمیشہ کے لیے ہم تم سے الگ

ہو جائیں گے، ایسا الگ ہونا جس کے ساتھ مہر و محبت کا کوئی جذبہ باقی نہ رہے گا۔" مگر سہیلی مصنف روض الانف کا خیال ہے کہ یہ شعر جو ہند گا رہی تھی خود اُس کے نہیں ہیں بلکہ وہ اُس کے پہلے کی ایک اُس کی ہمنام ہند بنت طارق بن قیاض الاودیہ کے اشعار ہیں جو اُس نے فرس و ایاد کی جنگ میں کہے تھے۔ اس صورت میں طارق شاعرہ کے باپ کا نام ہے اور مطلب بالکل صاف ہے۔ ہند کا گانا ان اشعار کو بطور تمثیل اور مناسبت موقع کے تھا۔

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ عـه "جب یہ فوج ابوار نامی قریہ سے گزر رہی تھی جہاں کہ رسول کی ماں آمنہ دفن تھیں تو اس وقت ہند نہایت مشکل سے ان کی بوسیدہ ہڈیوں کے ساتھ بے حرمتی کرنے سے روکی جا سکی اور اُحد کی جنگ میں جب رسول کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو یہ ہند جذبۂ انتقام میں اپنی صنف بلکہ انسانیت کے حدود سے گزر گئی۔ اُس نے اس بربریت کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہ کا پہلو چاک کرا کے اُن کا جگر نکلوایا اور اُسے مُنھ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلوبند اور سینہ بند بنایا۔" مولانا شبلی سیرۃ النبی ص ۲۷۳ میں لکھتے ہیں "خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بدلا لیا۔ ان کے کان ناک کاٹ لیے ہند (معاویہ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہ کی لاش پر گئی اور اُن کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے اُتر نہ سکا اس لیے اُگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو "جگر خوار" لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔" ابن عبد البر نے تو یہ روایت تک لکھ دی ہے کہ اُس نے حضرت حمزہ کے جگر کو بھون کر کھا لیا (استیعاب مطبوعہ حیدر آباد دکن ج ۲ ص ۷۸۶) آپ اس سے اُس عناد اور دشمنی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں بنی ہاشم، پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں بھی آخر میں بنی ہاشم کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت میں واپس گئے۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسول کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے ایک دفعہ آخری کوشش اُنھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف

عـه سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

اُن کو مل سکتی تھیں سب کو متحد کیا یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے وہ اُس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی جتھہ بندی کی وجہ سے "جنگ احزاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر وائے ناکامی کہ اس مرتبہ بھی شکست کا روز بد دیکھنا نصیب ہوا اور اُن کا وہ مایۂ ناز سورما جو اکیلا ایک ہزار آدمیوں کے مقابل سمجھا جاتا تھا علی بن ابیطالب کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اُترا۔ ابوسفیان کو باحال خستہ و تباہ مکہ واپس جانا پڑا۔ اور اب ہمت مقابلہ و لشکر کشی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے ہوئے تھے وہ بھر تھوڑی سکتے تھے۔

پیغمبر اسلام نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکین قریش کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوتی تو آپ نے مکۂ معظمہ کے حج کا ارادہ کیا۔ عـہ "مہاجرین کو اپنے وطن مالوف سے نکلے ہوئے چھ سال ہوگئے تھے۔ وہ جلاوطنی کے عالم میں مصائب و آلام کے خوگر بن چکے تھے اور اُنھوں نے اپنی سب چیزوں کو اسلام کی خدمت کے لیے تج دیا تھا۔ مگر چونکہ وہ انسان تھے۔ اُن کے دلوں میں بھی آرزو ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی جائے پیدائش تک جہاں وہ زندگی کا زیادہ حصہ گزار چکے تھے ایک مرتبہ اور پہونچ جائیں اُن کے دل میں یہ خیال برابر آتا ہوگا کہ وہ کسی طرح اپنے وطن مکہ کو جائیں چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب رسول نے خانۂ کعبہ کے طواف کا عزم لوگوں پر ظاہر کیا تو ہزاروں مہاجرین نے لبیک کا نعرہ بلند کیا لہذا مارچ ۶۲۹ء میں رسول اپنے متبعین کے ساتھ مکہ کو روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسول کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ مکہ کے باہر رسول کا راستہ روکنے کے کوشاں ہوئے اور اُنھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے آپ کو اس شہر مکہ میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے آپ ان لوگوں کے قلبی عناد کی کیفیت کا اندازہ پورے طور پر ہو سکتا ہے مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسول نے اُن سے صلح کی خواہش کی۔ بڑی دقت کے بعد ایک صلح نامہ مرتب ہوا جس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) رسول اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر حج کئے ہوئے واپس جائیں۔

(۲) دس سال تک آپس میں جنگ نہ ہو۔

(۳) اگر کوئی مکہ والوں میں سے جا کر مسلمانوں میں شامل ہو جائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ

عـہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

وہ اُسے واپس کردیں۔

(۴) اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آجائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۵) عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار ہے کہ چاہے وہ رسول کے ساتھ معاہدہ کرلیں یا مکہ والوں کے ساتھ ہو جائیں۔

(۶) سال آیندہ مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکیں گے۔

(۷) مسلمان اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ آسکتے ہیں یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھکر۔"

پیغمبر نے اس لیے کہ جارحانہ حملہ کا الزام عائد نہ ہو ان غیر منصفانہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مشرکین حقیقۃً اپنے جذبۂ عناد سے مجبور تھے وہ واقعی اپنی آنکھوں سے آپ کو خانۂ کعبہ کے پاس باطمینان اپنے طریقہ کی عبادت کرتے نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے تین دن کے لیے شہر خالی کردیا اور رسول اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔

میور نے لکھا ہے "وہ منظر کتنا عجیب و غریب تھا کہ جو اس وقت وادی مکہ میں نظر آرہا تھا، ایسا منظر جو دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ قدیم شہر تین روز تک اپنے تمام باشندوں سے خالی ہوگیا ہے جن میں بلند و پست سب ہی شامل ہیں۔ ایک ایک مکان ویران ہے اور جب وہ جارہے ہیں تو وہ نئے لوگ جو مدتوں سے جلاوطنی میں دن گزار رہے تھے خوشی خوشی اپنے بچپن کے خالی مکانوں کی طرف دوستوں کے ساتھ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور تھوڑے سے معین وقت کے اندر ہی حج کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ شہر کے بیرونی باشندے بلندیوں پر چڑھ کر نیچے اپنے نئے مہمانوں کی آمد و رفت کو دیکھ رہے ہیں جو رسول کی قیادت میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر رہے ہیں۔"

پیغمبر نے حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے اور قبیلۂ خزاعہ کو جو رسول کا حلیف ہوا تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تہ تیغ کردیا۔ پیغمبر کو جب معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف

قبیلہ کی امداد کے لیے فوراً روانہ ہو گئے۔ اب بھی رُخ مکہ ہی کی طرف تھا مگر تیور بدلے ہوئے تھے مشرکین میں طاقت مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں۔ اُنھوں نے ہتھیار ڈالا، دینا مناسب سمجھے اور رسول فاتحانہ شان سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ع۱ ”جس شہر کو ابھی آٹھ برس ہوئے رنج و حسرت کے ساتھ چھوڑا تھا وہی شہر، اللہ نے نہایت برتری اور کامیابی کے ساتھ آپ کے قبضہ میں دیا۔ بڑے بڑے سخت اور متعصب اکابر قریش مسلمان ہوئے بعض دباؤ سے، بعض اپنی خوشی سے اسلام کی حقانیت اور جاہ و جلال کو دیکھکر۔ اب حضور انور کا رحم و کرم ملاحظہ کیجیے کہ اُن لوگوں کو جن سے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچی تھیں، جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا تھا فتح مکہ کے وقت ان کی تمام خطائیں معاف کر دی گئیں۔ فتح کے موقع پر جب لوگ بیعت کر رہے تھے آپنے اُن سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو۔ سبنے جواب دیا خیراً اخ کریم و ابن اخ کریم ”ہمیں اچھائی ہی کی امید ہے۔ آپ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے فرزند ہیں،“ آپنے فرمایا اذھبوا فانتم الطلقا ”جاؤ تم لوگوں کو چھوڑ دیا“ اس کے بعد حضورؐ نے بیت اللہ کا طواف کیا اور جو تصویریں خانہ کعبہ میں بنی ہوئی تھیں ان سب کو محو کر دیا“

ع۲ ”اسٹینلی لین پول لکھتا ہی ”اب رسول کے لیے اپنی خون کی پیاسی طبیعت کے مظاہرہ کا وقت آگیا تھا۔ اُن کے ستانے والے اب ان کی مٹھی میں تھے۔ کیا اب رسول کا فرض نہ تھا کہ اُنھیں کچل ڈالیں، اُن کو شکنجہ میں کسوائیں اور اُن کے ساتھ اُسی طرح ظالمانہ سلوک کریں جیسا کہ اُنھوں نے آپکے ساتھ کیا تھا۔ اب انسان اپنے اصلی رنگ روپ میں ظاہر ہو گا۔ آؤ ہم اُسے متوحش نگاہوں سے دیکھیں اور شرم کا نعرہ پہلے ہی سے لگاویں لیکن یہ سب ہے کیا، سڑک پر کیوں خون کا دھبا تک نہیں ہے ؟ کہاں ہیں ہزاروں انسانوں کی لاشیں جو ذبح کر ڈالے گئے ہیں؟ یہ ایک واقعہ ہی کہ محمدؐ کی سب سے عظیم فتحمندی کا وقت وہی ہی جس وقت کہ اُنھوں نے اپنے نفس پر بھی عظیم فتح حاصل کی۔ رسولؐ نے نہایت فراخ دلی سے قریشیوں کے تمام افعال قبیحہ اور ایذا رسانیوں کو جو کہ اُنھوں نے آپ کے خلاف جائز رکھی تھیں معاف کر دیا۔ رسول کے مجاہدین نے بھی اُن ہی کی پیروی کی اور نہایت امن و آشتی کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔ نہ کسی کے مکان کو لوٹا اور نہ کسی عورت کی تذلیل کی“۔ باشور اٹھے سمجھتے نے

ع۱ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے ع۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

کہا ہے "محمدؐ کی فتح مکہ کو مارلس کے داخلۂ روم سے موازنہ کرو اور بعد کے تمام واقعات کا ایک دوسرے تقابل کرتے جاؤ اپنی اپنی قوت کو نئے سرے سے حاصل کرنے کے بعد دونوں کے اقدامات کو الگ الگ دیکھو اور بس۔ تب تم عرب کے پیغمبر کی فیاض و بلند اور رواداد طبیعت کا اندازہ کر سکتے ہو" ع۱ "مخالفین نا امیدی کی حالت میں حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ان کی قوت جواب دے چکی تھی اور باوجود اسکے کہ ان کے دلوں میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن ان کی زبانوں پر اسلام کا نام تھا"

اب بنی امیہ کے سرگروہ ابوسفیان نے بھی اسلام قبول کر لیا ع۲ "دوسری لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان نے اُس انقلاب کا ساتھ دینے کے لیے ارادہ کر لیا جو انکی ذاتی امنگوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتا تھا" اور سُنیے کہ ابوسفیان کی بیوی ہند نے بھی جس کے انتقامی جذبات کی تصویر آپ جنگ اُحد میں دیکھ چکے ہیں اسلام قبول کر لیا! مولانا شبلی سیرۃ النبی ص۲۸ میں لکھتے ہیں "ہند فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے"

تاریخ میں ابوسفیان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اُسے لکھنا ضروری ہے :-

حضرت عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان میں پرانے زمانہ کی دوستی تھی۔ عباس نے اس کے پہلے بھی بارہا سمجھانے کی کوشش کی تھی اور چاہا تھا کہ ابوسفیان اسلام قبول کر لے مگر نتیجہ میں ناکامی ہوئی اب حضرت رسولؐ کی فتح مکہ کے لیے جو روانگی ہوئی اور آپ سرزمین مکہ کے قریب پہنچے تو حضرت عباس نے ابوسفیان سے کہا کہ چلو میں تمھیں اپنے بھتیجے کے لشکر کا تماشا دکھلاؤں۔ اُسے ساتھ لے کر مکہ سے باہر ایک پہاڑ کی بلندی پر چلے گئے اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں رسولؐ کی فوج اُس طرف سے گزرنے لگی حالت یہ تھی کہ لشکر اسلام مختلف قبائل اور جماعتوں کے لحاظ سے علٰحدہ دستوں کی شکل میں اپنے اپنے سردار کی قیادت میں آ رہا تھا اور ہر دستہ کے بعد دوسرا دستہ اتنا پرشکوہ اور شاندار معلوم ہوتا تھا کہ ہر مرتبہ ابوسفیان گھبرا کر پوچھتا تھا کہ کیا یہی تمھارے بھتیجے کا لشکر ہے اور عباس ہنس کر کہدیتے تھے کہ نہیں یہ تو فلاں سردار کا جتھا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں حضرت پیغمبرؐ خاص بنی ہاشم کے گروہ کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے اور جناب عباس نے بتلایا کہ اب یہ میرے بھتیجے کا خاص دستہ ہے۔ ابوسفیان پر اس منظر کو دیکھکر بڑی

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب ع۲ سید احتشام حسین صاحب ایم اے

ہیبت طاری ہوئی اور اُس نے کہا پھر اب ؟ حضرت عباس نے کہا اب کیا سوائے اس کے کہ اسلام قبول کرو۔ اُس نے کہا کیونکر ؟ آپ نے کہا میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میں جانتا ہوں کہ میرا بھتیجا کریم النفس ہے وہ تمھارے اسلام کو قبول کرے گا چنانچہ حضرت عباس ابوسفیان کو لے کر رسول کے لشکر میں پہونچ گئے اور خیمۂ حضرت کی طرف متوجہ ہوئے مسلمانوں کا دل ابوسفیان کے ہاتھوں اتنا دُکھ چکا تھا کہ جونہی حضرت عمر کی نظر ابوسفیان پر پڑی فوراً تلوار لے کر جھپٹ پڑے اور کہا میں اس دشمن خدا کو قتل کرونگا مگر حضرت عباس نے منع کیا اور کہا ہمیں خدمت رسول میں پہونچنے دو۔ اُن سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے چنانچہ یہ دونوں پیغمبر کے پاس حاضر ہوئے۔ مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں "ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب سامنے تھے اور ایک ایک چیز اُس کے قتل کی دعویدار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرت کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبی) تھی اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں"۔ (سیرۃ النبی جلد ا ص ۲۷۶) چنانچہ عباس نے سفارش کی اور ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔

اس واقعہ سے ہر انسان یہ سونچنے پر مجبور ہے کہ فوج کی ہیبت سے آدمی سر جھکا سکتا ہے ہاتھ روک سکتا ہے ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے بلکہ اپنا گلا تک کاٹ سکتا ہے مگر اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت سے تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت و دشمنی جو اُن حدود تک پہونچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے کیا فوجی مظاہرہ کے اثر سے محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ بیشک اعتقادی طور پر ممکن ہی یہ مانا جائے کہ اس بارے میں رسول اللہ کا کوئی خاص اعجاز ظاہر ہوا۔ ہمیں اس اعتقاد سے متعلق تبصرہ کا اس تاریخی کتاب میں کوئی حق نہیں ہے اور اگر کچھ علما ءاس کے قائل ہیں تو ہم اُن کی رائے اور خیال کا احترام کرتے ہوئے اُس کا انکار نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر اس طرح کا کوئی معجزہ ثابت نہ ہو تو عام اصول فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ صرف اتنا کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدہے کی طرح سامنے موجود تھا اب مار آستین بنکر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہ نہیں

کہ دشمن کی یہ صورت اُس صورت سے زیادہ خطرناک ہے جبکہ وہ خنجر بکف گلا کاٹنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا ہو۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی خیال تھا ان کے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علی بن ابیطالبؑ کا۔ آپؑ نے فرمایا تھا ما اسلموا ولکن استسلموا "یہ لوگ حقیقتہً اسلام نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کے سامنے اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور بس" ؏ "ماحول اور واقعات نے انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ رسول کے احکام کے سامنے گردن جھکا دیں لیکن باطن میں اُن میں سے اکثر پہلے ہی کی طرح مشرک رہے۔ منافقت کی صورت خاص اُن لوگوں کا حصّہ تھی جنھوں نے کہ فتح مکّہ کے بعد جب رسول کا اقتدار حجاز اور عرب کے بڑے حصّہ پر قائم ہو چکا تھا تب اسلام قبول کیا تھا۔

قرآن مُسلمانوں کو بالتکرار ان منافق مُسلمانوں سے بچنے کی تنبیہہ کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ مُسلمانوں میں سے نہیں ہیں اگرچہ وہ ظاہر میں مُسلمانوں ہی کے ایسے ہیں اور ان کے قلب بدعتقادیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان منافقین کی تعداد اتنی کثیر ہوتی جاتی تھی کہ رسول کو اس سے بیحد تردد و تفکّر ہوتا تھا اور مجبوراً اُنھیں ان کے خلاف سختی برتنا پڑتی تھی۔ اگرچہ عموماً رسول کی طبیعت صلح پسند اور نیک تھی، وہ صلح کے پیغمبر تھے اور اُس وقت تک جنگ سے پرہیز کرتے تھے جب تک کہ اُنھیں مجبوراً جہاد نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ رسول غالباً یہ بھی امید کرتے تھے کہ وہ اپنے اخلاق اور کردار سے اُن کے دلوں کو تسخیر کرلیں، اُن کے قلوب نرم ہو جائیں اور اُن میں حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اپنے اس خیال میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں اکثر دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ لہٰذا بنی امیّہ اس نئے مذہب کی کیفیت سے خوش نہ تھے جس میں کہ فرقوں اور قبیلوں کے امتیازات کی کوئی اہمیت نہ تھی اور جس کا صدر اُن کے حریف قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور اُن کے خاندانی شرف اور ضدی احساسات کی نظروں میں قابل نفرت تھا۔

یہی فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے مخالفین میں صرف ایک بنی امیّہ ہی تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں اور بھی بہت سے منتشر خاندان اور قبائل ایسے تھے جو کہ اسلام کے دشمن تھے۔ ان قبائل میں زیادہ تر خانہ بدوش عرب بدو شامل تھے جو اسلام کے پیغام کو سمجھنے کی قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ اس نئے مذہب کے اصول اُن کے مشرک دماغ میں جو کہ صحرائی روایات کے عادی ہو چکے تھے بمشکل تمام گھر کر سکتے تھے۔

؏ ڈاکٹر محمود حسین مرزا صاحب

وہ کسی قسم کی پابندی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ صدیوں تک وہ آزادی کی زندگی بسر کر چکے تھے جس میں وہ سوائے شیخ قبیلہ کی اطاعت کے اور کسی کی اطاعت جانتے نہ تھے۔ جہاں وہ سوائے اُن قوانین کے جو کہ بالو کے تودوں اور صحرا کی صاف ہوا کے ساتھ عرب کے مطلق العنان خطوں میں اُنہی کے درمیان مشکل ہوتے تھے اور کسی قانون کو مانتے نہ تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد بُزکوہی کی طرح آزاد رہے تھے اور اپنے دشمنوں پر شیر دلی سے حملہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف معمولی بادشاہوں مثلاً حیرہ اور غسّان ہی کا مقابلہ کیا تھا بلکہ قیصر و کسریٰ کی طاقت و قوّت کو بھی پامال کر دیا تھا۔ ان جبروت اور وحشت کے مجسّمہ صحرائی انسانوں پر اسلام قیود عائد کرنا چاہتا تھا جسے وہ ہرگز خوشی سے قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے مقابلہ کیا اور پوری طاقت صرف کر دی۔ قرآن نے ان کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ "کفر میں بہت شدید تھے"۔ لیکن بنی امیہ ہی کی طرح یہ خانہ بدوش بھی اسلام کی ترقی میں سدّباب نہیں ہو سکے تھے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن کی حالت نازک ہی اور بہتر یہی ہے کہ وہ اسلام کے سامنے جھک جائیں۔ مجبوراً اُنھوں نے اسلام قبول کیا لیکن اس نئے مذہب کی رُوح یکبارگی ان کے رگ و پے میں سرایت نہیں کر سکی تھی۔ اُن کے لیے اسلام ایک نئی، اجنبی اور ناخوشگوار چیز تھی جسے اُنھوں نے مجبوراً قبول کیا تھا"۔

اس طرح کے لوگ جو شکوہ و دبدبہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوے تھے اُن کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہی یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبۂ انتقام اور اسکے ساتھ ساتھ ڈر جس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہونچا دیں اور اگر اُس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اُن خصوصیات امتیازی کو تبدیل کر دیں جو اُس نے قائم کئے ہیں اور جس سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہونچا ہے اور اسلام کے پردے ہی میں سہی، اُن حدود و امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے پیغمبر اسلام کی زندگی میں اُن کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی عــہ "ان سب کی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ ان کو عام مسلمانوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہونے دیا جاتا تھا نہ ان کو مسلمانوں پر حاکم بنایا جاتا تھا بلکہ اکثر تحفہ تحائف دے کر اُن کی دلجوئی بھی کی گئی تاکہ یہ لوگ اپنے ظالمانہ انداز بھول جائیں اور یہ نہیں تو ان کی آیندہ نسلیں اسلام میں رہ کر امن و امان کی زندگی اختیار کر لیں اور سچے مسلمان بن جائیں"۔

عــہ آغا محمد طاہر صاحب

مگر ان کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو اُن کے چہرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذبات دلی زبان سے بھی کھل جاتے تھے چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ جنگ حنین میں جب مُسلمانوں کی اکثریت میدان جنگ سے پسپا ہوئی تو ابو سفیان نے کہا بس جادو ختم ہو گیا (مدارج النبوۃ)

بے شک پیغمبر کے بعد اُن کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی پوری امید تھی۔ ع۱ "رسول نے دوسری ربیع الاول ۱۱ ہجری میں وفات پائی۔ قریش نے اُس نوزائیدہ مُسلم ریاست کے لیے حضرت ابوبکر کو جو اس وقت سن رسیدہ شخص تھے منتخب کیا"، اس وقت ابوسفیان نے سب سے پہلا حملہ اسلام پر کیا اس طرح کہ وہ آئے حضرت علی بن ابی طالب کے پاس اور کہنے لگے کہ غضب کی بات ہے تمھاری موجودگی میں اس مسند خلافت پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جما لیا۔ خدا کی قسم اگر تم کہو تو میں تمھاری مدد کے لیے مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔ اگر علی کی جگہ کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا حربہ وہ کاری تھا کہ اسلام کی بنیاد آج ہی ہل جاتی مُسلمان اسی وقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا مگر وہ نور آگہی سے دیکھنے والے نباض فطرت علی تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور ڈانٹ کر جواب دیا کہ تو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کا دشمن رہا (تصدیق کیلیے ملاحظہ ہو استیعاب ج ۱ مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۲۴۵ و ج ۲ ص ۱۷ و صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۳۷)

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب انھوں نے چولا بدلا اور اُدھر جا کر ملے۔ مذکورہ بالا واقعہ کے بعد اس ملنے کی حقیقت کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں مگر ذمہ دار افراد غالباً اس واقعہ پر مطلع نہیں تھے اس لیے انھیں اپنی اس روش میں کامیابی ہو گئی ع۲ "خوش قسمتی سے مُسلمان جو کہ درحقیقت راستباز اور راسخ العقیدہ مُسلمان تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بھی جو کہ نیم مُسلم تھے ان سب کو کچھ دوسری چیزیں اس وقت اپنی توجہ منعطف کر لینے کے لیے ملیں۔ وہ اب ایک مشترک سردار کے ماتحت ایک متحدہ جماعت کی حیثیت رکھتے تھے جن کے سامنے ایران اور یونان کے وسیع اور دولتمند مقبوضات موجود تھے یہ وہ ممالک تھے جنھوں نے ایک وقت میں ساری متمدن دُنیا کو اپنے ہی اندر سمو لیا تھا لیکن آج اخلاقی حیثیت سے پست اور سیاسی حیثیت سے کمزور ہو گئے تھے۔ اسلامی سپاہی اُس جوش و خروش میں پر ہو

ع۱ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ڈی لٹ) ہسٹری آف کربلا، ع۲ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

جس کی مثال نوعِ انسان کی تاریخ میں نادر ہے ان قدیمی تہذیب کے مراکز پر مثل باز کے حملہ آور ہوئے اور فتح وظفر کے نشہ سے مخمور ہو کر وقتی طور پر اپنی نجی اور ذاتی جنگوں اور نزاعوں کو پس پشت ڈال دیا۔"

یہی ہنگامہ خیز دورہ تھا جس میں اولاد ابوسفیان کو دمشق میں اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ع۱ "حضرت ابوبکر نے ملک شام پر فوج کشی کا تہیا کیا اور یزید بن ابی سفیان کو تقریباً ستائیس ہزار لشکر پر امیر مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے حصوں پر عمرو بن العاص ولید بن عقبہ۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ شرجبیل بن حسنہ۔ عکرمہ بن ابی جہل۔ عبیدہ جراح کو سپہ سالار مقرر کیا اور خالد بن الولید کو حکم بھیجا کہ فوراً عراق سے مہم شام کی کمک پر پہونچو چنانچہ وہ بھی تقریباً چھ سات ہزار فوج کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ امیر الامراً یزید بن ابی سفیان کے ساتھ سہیل بن عمرو اور اُن کے ایسے شیوخ قریش مشیر تدبیر تھے سپاہ قیصر روم اور لشکر عرب سے ملک شام میں متعدد لڑائیاں ہوئیں اور عرب نے بتدریج ملک شام کو آخر ۱۵ھ ہجری تک تمام فتح کر لیا اور شروع سے برابر ہر خطۂ مفتوحہ زیر نگین خاندان ابی سفیان آتا رہا اور یزید بن ابی سفیان بالاستقلال فرماں روا رہے۔"

ع۲ "علامہ ابن عبدالبر استیعاب جلد اول ص ۲۵۳ پر لکھتے ہیں کہ ذی الحجہ ۱۹ھ ہجری میں یزید نے دنیا سے رحلت کی۔ حضرت عمر کے پاس اُن کی خبر وفات ایسے وقت پہونچی جب ابوسفیان دربار خلافت میں موجود تھے۔ حضرت عمر نے خط پڑھ کر ابوسفیان کو تعزیت پیش کی۔ بیٹے کی خبر موت سُنکر ابوسفیان کو سب سے پہلے دمشق کی حکومت ہی کا خیال آیا۔ پوچھا کہ آپ یزید کی جگہ پر کس کو مقرر کر رہے ہیں حضرت عمر نے فرمایا اُس کے بھائی معاویہ کو۔ ابوسفیان نے خوش ہو کر کہا کہ حضور نے قرابت داری کے حق کا لحاظ رکھا۔ امیر معاویہ کو والی دمشق تسلیم کرنے کے ساتھ ہزار اشرفی ماہوار گورنری کی تنخواہ بھی مقرر ہوئی۔"

ممکن ہے کہ وہی تالیف قلب والی مصلحت اس میں بھی مضمر ہو اور ممکن ہے کہ ایک خطرناک عنصر کو حجاز کے مرکزی مقاموں سے دُور کرنے کی یہ صورت نکالی گئی ہو مگر سیاست کی دنیا میں بہت سے نتائج توقع کے خلاف برآمد ہوا کرتے ہیں۔

ع۱ عہد استبداد۔ سید غضنفر علی صاحب مرحوم ع۲ ناموس اسلام ج ۲

بنی امیہ میں سے بعض افراد کو مستثنیٰ کرنے کے بعد یہ کہنا کسی طبقہ کے نزدیک قابلِ انکار نہیں ہو سکتا کہ اس جماعت کا شام میں اقتدار قائم ہونا کیا تھا کہ ان کی امید کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اُن کی نیتیں کیا تھیں اور اصلی مقصد کون سے پیش نظر تھے۔ مگر اُن کو جمہور مسلمین کی بیزاری کے خوف سے احتیاط کی سخت ضرورت تھی۔ "گندم نما جو فروش" لوگوں کے منصوبوں کی تکمیل موقوف ہوتی ہے اس پر کہ ایمانداری کی نقاب اُن کی اصلیت کے چہروں پر پڑی رہے مگر دل کی باتیں فطرۃً کبھی کبھی زبان پر آ ہی جایا کرتی ہیں اُن میں سے چند مثالیں ہمارے سامنے تاریخ میں اب تک محفوظ ہیں جن کی صحت کی ذمہ داری اُن ہی مورخین پر ہے۔

پہلے جنگ یرموک میں جبکہ مسلمانوں کا مقابلہ سلطنت روم کے لشکر سے تھا اور معرکہ کا زار گرم تھا۔ اُس وقت ابو سفیان دُور سے کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا جب رومیوں کو غلبہ حاصل ہوتے نظر آتا تھا تو کہتا تھا ایہ بنی الاصفر یعنی شاباش اے ملک روم کے بہادرو اور جب مسلمانوں کو ذرا تقویت حاصل ہوتی تھی تو ابو سفیان کی زبان سے حسرت و یاس کے ساتھ یہ شعر نکلتا تھا۔

وبنو الاصفر الملوک ملوک　　　الروم لم یبق منھم مذکور

مطلب یہ تھا کہ ہائے افسوس کہ سلطنت روم کے پُرشوکت بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے نظر آتا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیرؓ سے بیان کیا اُس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔ زبیرؓ نے کہا خدا اسے غارت کرے۔ یہ نفاق سے باز نہ آئے گا۔ کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں۔ (استیعاب)

اس سے زیادہ تعجب خیز واقعہ دوسرا ہے جو اگر صحیح ہے تو اُس کی بنیاد اس بات پر مبنی سمجھی جا سکتی ہے کہ بے دین آدمی ہر ایک کو اپنا سا سمجھتا ہے اور ہر ایک کی دینداری کو نمائشی خیال کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کے چشم و چراغ تھے، اس لیے ابو سفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی قوت کے ساتھ ابلے کہ تاب نہ رہی۔ آپ کے خلیفہ ہونے کی خبر سُنی تو ابو سفیان آپ کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا اُس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہونچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ

یہی دنیاوی سلطنت۔ رہ گیا بہشت و دوزخ۔ اُس کو میں کچھ سمجھتا نہیں (استیعاب)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اُس کا مقولہ اپنی زبان میں یوں لکھا ہے:۔

"نیست آں مگر ملک و من در نمی یابم جنت را و نہ نار را"۔ یہ سُنکر حضرت عثمان نے ڈانٹ کر اُس کو اپنے پاس سے نکلوا دیا۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت عثمان نے اُس کی اس بات چیت کو ضرور انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا مگر اس کے باوجود ابو سفیان کے خاندان کے لوگوں نے حضرت عثمان کی نیک دلی سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور آخر میں حضرت عثمان کی جان لینے کے یہی باعث ہوے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب اپنی انگریزی کتاب "ٹریجڈی آف کربلا" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر کے بعد ریاست کی باگ حضرت عثمان کے کمزور ہاتھوں میں پڑ گئی جو ایک نیک اور شریف آدمی تھے مگر حکومت کی بھاری ذمہ داری کے قابل نہیں تھے۔ یہ اُن ہی کے دور سلطنت کے اثنا میں ہوا کہ اسلامی دنیا تقسیم ہو گئی دو فریقوں میں جو پھر کبھی متحد نہیں ہوے۔ اُن کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے زیادہ بداطوار لوگ تھے۔ جو صرف شخصی ترقی کا لحاظ کرتے تھے۔ اور اسلام کے مفاد کو بالکل بھولے ہوے تھے بعض اُن میں سے مذہب کے ایک ہلکے سے ملمع کے باوجود درحقیقت مشرکین سے بہتر نہیں تھے۔ حضرت عثمان کے بہت سے مقربین کے افعال جو خط نصف النہار پر پہونچ گئے تھے۔ مدینہ کے بلوہ اور اُن کے بدنصیب قتل کے باعث ہوے"

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی کتاب "محرم نامہ"، میں جس کا دسواں ایڈیشن مطبوعہ دہلی ۱۳۴۸ھ میرے پیش نظر ہے لکھا ہے:۔ "ان کو (حضرت عثمان کو) ان کے قبیلہ بنی امیہ کے شریر آدمیوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا اور ان کی خلافت سے خوب فائدے اُٹھانا شروع کئے۔ یہ بات دوسرے قبیلوں کے صحابہ اور ان مستحق لوگوں کو ناگوار ہوئی جن کا حق بنی امیہ کے غیر مستحق لوگوں کے سبب مارا جاتا تھا۔ مروان بن الحکم بنی امیہ میں بہت ہی خود غرض اور شریر آدمی تھا۔ یہی حضرت عثمان کی شہادت کا باعث ہوا اور اسی نے حضرت عثمان کو دوسرے صحابہ کی اچھی نصیحتوں پر عمل کرنے نہ دیا"

اس خاندان کے بعض دوسرے لوگ بھی ایسے ہی ناقابل اطمینان کیرکٹر کے تبلائے جاتے ہیں اور اُن کے دل میں بھی ویسے ہی جذبات معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ع۵ "عراق میں لشکر عجم پر

ع۵ دور استبداد مؤلفہ سید غضنفر علی صاحب مرحوم

عمرو بن العاص نے شبخون مارنے کا قصد کیا۔ قیس بن ہبیرہ مانع ہوئے کہ سپاہ بمقابلہ دشمن کم ہے عمرو بن العاص برہم ہو گئے اور کہا کہ میرے معاملہ میں تم کو دخل دینے سے واسطہ؟ قیس نے کہا میں امیر لشکر ہوں اور یہ بھی نہ ہوتا تو بھی میں تم کو اس بیجا جسارت سے روکتا۔ عمرو بن العاص نے کہا قیس یہ زمانہ جس میں تم امیر بنے ہو کیا برا زمانہ ہے۔ اگر میں تمھارا یہ دین چھوڑ کر اپنے دین قدیم کی طرف پھر جاؤں اور اس اپنے پرانے دین پر لڑ کر مر جاؤں تو یہ امر مجھکو اس سے زیادہ پسند ہے کہ تم دوبارہ پھر کبھی مجھ پر امیر ہو۔ (طبری ج ۴ صفحہ ۱۰۲ ۱۴ھ)

ہر مسلمان اپنے اسلامی جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے اس مقولہ کی اسپرٹ کے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے مغیرہ بن شعبہ جب حکومت کوفہ پر منجانب حضرت عمر مامور تھے تو وہاں اظہار فخر کے لیے لوگوں سے کہدیا کہ رسول اللہ کی قبر میں ان کی نعش مطہر اتارنے کے لیے میں بھی داخل ہوا تھا اور پھر سب کے بعد قبر سے باہر آیا۔ شیوخ کوفہ جب موسم حج میں مکہ میں آئے تو انھوں نے بہ قصد تصدیق حضرت علی سے اس واقعہ کا ذکر کیا حضرت علی نے فرمایا کہ مغیرہ نے غلط بیانی سے کام لیا (طبری ج ۳ ص ۲۰۵ ۱۱ھ)

بعد وفات حضرت عمر جب اہل شوریٰ باہم صلاح کے لیے حجرۂ ام المومنین عائشہ میں مجتمع ہوئے تو عمرو بن العاص اور مغیرہ دونوں در حجرہ پر آکر بیٹھ گئے۔ سعد بن ابی وقاص نے کنکریاں مار کر ان کو وہاں سے اٹھا دیا اور فرمایا یہ دونوں چاہتے ہیں کہ کہتے پھریں کہ ہم بھی حاضرین مجلس شوریٰ میں تھے (طبری ج ۵ ص ۳۶ ۲۳ھ)

جلسۂ عام میں جب عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عثمان کے انتخاب کا اعلان کیا تو مغیرہ نے ان سے کہا کہ آپ نے خوب انتخاب کیا اور پھر حضرت عثمان سے عرض کیا کہ آپ کے سوا اگر کسی اور کے ہاتھ پر عبدالرحمن بیعت کرتے تو ہم کبھی راضی نہ ہوتے۔ عبدالرحمن نے یہ فقرہ سنکر کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ اگر میں کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرتا تو تم بھی اسی کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اس سے یہی باتیں بناتے (طبری ج ۵ ص ۳۸ ۲۳ھ)"

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اونچے طبقہ میں ہمیشہ مشکوک نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان پر کوئی اعتماد و اطمینان نہ تھا۔

مقاصد چاہے جو کچھ ہوں مگر واقعہ یہ ہوا کہ اس خاندان کی حکومت کا شام میں قائم ہونا تھا کہ

اُنھوں نے ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش شاہانہ رکھی۔ کوئی سیاح اگر ممالکِ اسلامیہ کا سفر کرتا اور حجاز میں شہنشاہِ اسلام یعنی خلیفۃ المسلمین کے دربار کو دیکھتا اور پھر شام جا کر ایک صوبہ کے گورنر کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکّر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اُس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلالت کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پیغمبرِ اسلام کے جاری کیے ہوئے طرزِ زندگی سے مانوس صحابۂ کرام کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصُول قدر و قیمت اور معیارِ عظمت جو اُس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا فنا ہو جائے گا۔ ع۵ "موطا امام مالک" وغیرہ میں ہے کہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے ابو دردا صحابی نے منع کیا اور کہا ہم نے رسول اللہ سے سُنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے معاویہ نے کہا میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سُنکر ابو دردا نے کہا کیا خوب! میں تو رسول اللہ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں رہونگا اس کے بعد ابو دردا مدینہ چلے گئے اور حضرت عمر سے جا کر یہ سب حال بیان کیا۔ حضرت عمر نے معاویہ کو تنبیہی فرمان بھیجا اور لکھا کہ اس طرح کا عمل خلاف حکم رسول بیع و شرا میں ہرگز نہ کیا کرو۔ علامہ زرقانی اور نسائی وغیرہ صحیح اسناد سے لکھتے ہیں کہ عبادہ بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیع و شرا کے معاملہ میں اسی طرح کا قصّہ ہوا تھا۔ اور معاویہ نے اُن کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح بُرا نہیں سمجھتے۔ عبادہ نے کہا میں تو رسول خدا کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو خدا مجھے اس جگہ سے نکالے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہوں گا جب پر تم حاکم ہو۔ اس کے بعد عبادہ مدینہ چلے گئے۔ حضرت عمر نے پوچھا آپ کیوں چلے آئے؟ اُنھوں نے تمام قصّہ بیان کیا حضرت عمر نے فرمایا نہیں نہیں آپ وہیں تشریف لے جائیے۔ وہ مقام اور زمین جہاں آپ جیسے لوگ نہ ہوں بڑی خراب ہے۔ اس کے بعد معاویہ کو حکم بھیجا کہ تم عبادہ بن صامت پر امیر اور حاکم نہیں ہو۔ جو عبادہ کہیں اُس پر لوگوں کو چلاؤ۔ بے شک عبادہ امین ہیں (دراسات اللبیب ص۲۴۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستاران شریعت میں اس وقت سے

ع۵ ناموس اسلام

شروع ہوگئی تھی۔

عا، "حضرت عمر ملک شام میں تشریف فرما ہوئے تو صبح و شام معاویہ جب اُن کی ملاقات کو آتے ہر وقت جدا تازہ جلوس سواری ہوتا۔ حضرت عمر نے اس شان و شکوہ کو مشاہدہ فرما کر صرف اتنا اُن سے ارشاد فرمایا کہ صبح کو اور جلوس ہوتا ہے اور شام کو اور۔ اور یہ بھی تذکرہ کیا کہ سُنتا ہوں کہ ہر صبح کو تمھارے برآمد ہونے سے پہلے تمھارے دروازہ پر اہلِ حاجات کا مجمع تمھارا منتظر رہا کرتا ہے معاویہ نے جواب دیا کہ دشمن یعنی قیصر روم قریب ہے اور اُس کے جاسوس یہاں پھیلے ہوئے نگران حال ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوب شان و شوکت اسلام دیکھیں حضرت عمر نے فرمایا یہ مرد دانا کا کید اور زیرک و ہوش مند کا فریب ہے۔ معاویہ نے کہا آپ جو فرمائیے اُس پر کاربند ہوں حضرت عمر نے ارشاد کیا کیا خوب!! حالت تو یہ ہے کہ جس امر میں بقصد اعتراض تم سے سلسلۂ کلام شروع کرتا ہوں تم مجھکو ایسا متحیر بنا دیتے ہو کہ کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کیا کہوں اور کیا کروں (طبری ج ۶ ص ۱۸۴)

حضرت عمر کا دورِ حکومت ہمگی کچھ اوپر دس برس ہے۔ اتنی سی مدت میں ترقی و تنزل کا یہ منظر مشاہدہ میں آتا ہے۔ حسن بصری ایک مبسوط روایت میں ظاہر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے دورِ اسلام کو اونٹ کی عمر سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام کی ترقی کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب حالت تنزل طاری ہوگئی اور قریش دنیا کی دولت پر ٹوٹ پڑے ——

حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں آہیں بھر کے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا تھا کہ قریش میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی دولت و حکومت اُسی کو مل جائے —— تاریخ خمیس میں بحوالہ دول الاسلام ذہبی لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے عہد میں وفورِ دولت کا یہ حال تھا کہ دار الخلافہ مدینہ میں ایک گھوڑے کی قیمت ایک ایک لاکھ اور ایک باغ کی قیمت چار چار لاکھ درہم تک پہونچ جاتی تھی۔ بنی امیہ کے ایک طبقہ نے حضرت عثمان کے عہد میں تو مطلق العنانی دکھلائی کہ پناہ بخدا اور اس طرح وقارِ خلافت کو بھی نقصان پہونچایا اور رعایائے ملک کو بھی اور تنظیم اسلامی کو بھی۔ یہ لوگ ایسے جوڑ توڑ کیا کرتے تھے کہ جس سے ملک کو پیہم نقصانات ہی پہونچتے رہتے تھے مثلاً عبداللہ بن ابی سرح نے یہ فقرہ تراشا کہ عمر بن العاص مصر کے گورنر نے رقم خراج گھٹا دی۔ حضرت عثمان نے فوراً عمر کو معزول کر کے عبداللہ بن ابی سرح کو اُن کی

عا، دورِ استبداد

جگہ بھیج دیا۔ عبداللہ نے دکھانے کو جس طرح بنا خوب خراج وصول کیا۔ حضرت عثمان نے تعریفاً عمر سے کہا دیکھو اب وہ اونٹنی خوب دودھ دینے لگی عمر نے برجستہ کہا کہ جی ہاں اُس کا بچہ بھی تو مر گیا۔ یعنی خراج زیادہ وصول ہوا تو کیا۔ رعایا تباہ اور ملک کی سرسبزی بھی رخصت ہو گئی —— حضرت عثمان نے ۲۷ھ میں عمر بن العاص کو حکومت مصر سے معزول کیا تھا، اُس وقت سے وہ جب موقع و محل پاتے حضرت عثمان پر طعن و تشنیع کرتے رہتے تھے اور مدینہ چھوڑ کر فلسطین میں جا بیٹھے اور حضرت خلیفۂ ثالث کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ممالک محروسہ کی رعایا بگڑ کھڑی ہوئی اور حضرت عثمان پر چڑھائی کر دی۔ حضرت عثمان نے یہ حالت مشاہدہ کر کے معاویہ والی شام کو یہ فرمان بھیجا "اہل مدینہ کافر ہو گئے اور اُنھوں نے اطاعت حکومت سے سرکشی اختیار کر لی اور بیعت کو توڑ ڈالا۔ یعنی ایمان شکنی کی تم کو لازم ہے کہ اپنی پیشگاہ سے جنگ آوران ملک شام کو تند رفتار مرکبوں پر ہمارے پاس روانہ کر دو" یہ فرمان جب معاویہ کے پاس پہونچا تو انھوں نے اس کی تعمیل میں تساہل سے کام لیا بلکہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے (طبری ص۱۱۵ ۳۵ھ) حضرت عثمان نے اسی مضمون کے فرمان دیگر عمّال کو بھیجے جو اکثر بنی امیہ ہی میں سے تھے اور مدد مانگی مگر کوئی مدد کو نہ پہونچا۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ جیسے یہ لوگ خود منتظر تھے کہ شورش بڑھے اور اپنے اپنے صوبوں پر خود سرانہ قابض ہو جائیں۔ آخر اہل شورش نے حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا جب آپ کے قتل کی خبر عمر بن العاص کو پہونچی تو بفخر کہا میں ابو عبداللہ ہوں جو ٹھان لیتا ہوں بغیر گزرے نہیں رہتا"

سلطنت دمشق نے اتنے عرصہ میں پوری قوت حاصل کر لی تھی اور اُنھوں نے جس نیت سے بھی ہو اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کی بنیادیں قائم کر دی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "الحریت فی الاسلام" ص۲۶ میں لکھتے ہیں "خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور فتن و بدعات شروع ہوتا ہے جنھوں نے نظام حکومت اسلامی کی بنیادیں متزلزل کر دیں" اسی تمدن کا نتیجہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار نظر انداز ہو گئے اور وہ امتیازات ختم ہو گئے جو اسلام کے سادہ اور غریبانہ اصول نے قائم کئے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ہی حضرت ابوذر غفاری کا جلاوطن کیا جانا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ اُس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو اُنھیں اس وقت اسلامی ملک میں نظر آ رہی تھی۔ حالت یہ تھی کہ ع۵ "قبرص اور صقلیہ کی

ع۵ مولانا سید ابن حسن صاحب رضوی جارچوی ایم اے ایم ایل

دولت قصر دمشق کی زینت بنی ہوئی تھی۔ افریقہ کی لوٹ مار کا سامان تذر تعیش ہو رہا تھا اور بنی امیہ میں سے غیر ذمہ دار افراد خدا کے مال کو (حضرت علی کی لفظوں ہیں) اس طرح کھا رہے تھے جیسے اونٹ فصل بہار کی گھاس کھاتا ہے" رسول کا بڈھا صحابی ابوذر غریب مسلمانوں کو بھوکا مرتے دیکھتا تو کیا کرتا۔ دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتا پھرتا تھا جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ والذین یکنزون الذہب والفضۃ ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرہم بعذاب الیم "وہ لوگ جو سونے چاندی کو خزانوں میں سمیٹ کر رکھتے ہیں اور راہ خدا میں صرف نہیں کرتے انھیں عذاب دردناک کی مبارکباد دو" لا یحسبن الذین یبخلون بما آتاہم اللہ من فضلہ ھو خیراً لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ " نہ خیال کریں وہ لوگ جو خدا کی عطا کی ہوئی دولت کے ساتھ بخل کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے کچھ اچھی بات ہے نہیں بلکہ وہ اُن کے لیے بہت بُرا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ اس بخل کی ہوئی دولت کے طوق ان کے گلوں میں ڈالے جائیں گے"

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے چنانچہ جب امیر معاویہ نے قصر خضرا کی تعمیر کی تو ابوذر سے پوچھا کیوں اسے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذر نے فرمایا اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذاتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا (کتاب البلدان۔ ابی بکر احمد بن محمد ہمدانی معروف بابن الفقیہ مطبوعہ لیدن سنہ ۱۳۰۲ صفحہ ۱۵۶)

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مزاج قیصریت اس کا کہاں تحمل کر سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذر شام سے مدینہ بھیج دیے گئے اور وہاں سے جلاوطن کر دیے گئے ع؎ "وہ حسرتناک منظر تھا جب علی اپنے برسوں کے مصاحب اور جاں نثار کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہے تھے۔ گریہ گلو گیر ہو رہا تھا۔ آواز بمشکل نکلتی تھی پھر بھی حضرت نے اپنے آپ کو سنبھالا اور فرمایا" اے ابوذر تم ان لوگوں سے خدا کے لیے ناراض ہوئے تھے۔ پس اُسی سے معاوضہ کی امید رکھو۔ یہ لوگ تم سے اس لیے ڈرتے تھے کہ کہیں تمھاری باتوں کی وجہ سے دنیا ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے اور تم اپنے دین کے بچانے کی

ع؎ مولانا سید ابن حسن صاحب جارچوی

خاطر اُن سے خائف تھے پس تم اُس چیز کو جس کی وجہ سے یہ تم سے خائف تھے (یعنی دنیا) ان ہی کے ہاتھ میں چھوڑ دو اور اُس چیز کو لے کر بھاگ جاؤ جس کے متعلق تم ان سے ڈرتے تھے (مطلب یہ ہی کہ دنیا کو ان کے لیے چھوڑ دو اور دین لے کر یہاں سے نکل جاؤ) اگر تم بھی ان کی طرح دنیادار ہو جاتے تو وہ بھی تمھارے دوست بن جاتے اور اگر تم بھی اُن کے ساتھ اُس دنیا کے حصہ دار ہو جاتے تو وہ تم سے مطمئن ہو جاتے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ ربذہ کی ویران بستی میں ایک لاش پڑی تھی جس کے سرہانے ایک عورت اور ایک لڑکی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اشکبار بیوی کفن کی فکر میں اپنی جھونپڑی سے اٹھی اور سر راہ آکر بیٹھ گئی۔ مالک اشتر ایک قافلہ کے ہمراہ اتفاقاً اُدھر سے گزر رہے تھے، روتی ہوئی عورت کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور دریافت حال کیا۔ مصیبت زدہ عورت نے کہا "لوگو! رسول کے مظلوم صحابی ابوذر نے غربت کے عالم میں وفات کی، وہ دیکھو ان کا لاشہ بے گور و کفن پڑا ہے۔ مالک اشتر اور اُن کے ساتھی چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ اُن کی نگاہ کے سامنے ابوذر کی مظلومی کا نقشہ کھنچ گیا کفن و دفن کے بعد مالک اشتر نے یہ دعا مانگی "خدایا ابوذر تیرے رسول کا صحابی تھا، وہ تیری کتاب اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا تھا، اس نے تیری راہ میں جہاد کیا اور مرتے دم تک جادۂ اسلام نہ ہٹا۔ مدینہ سے تھوڑی دور پر ربذہ کے کھنڈرات میں اب تک ابوذر کی قبر موجود ہے جس پر حسرت و یاس نوحہ خوانی کرتی ہے اور خلوت و تنہائی پاسبانی۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر یا تھکا ماندہ زائر جب اُدھر سے آ نکلتا ہے تو بدو عربوں کے بچے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے مٹی کی اس ڈھیر کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جہاں دنیائے اسلام کا وہ مساوات پسندی اور حریت کا علمبردار آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے"

یہ حکومت دمشق کی سیاست ملوکانہ کے خلاف پہلی قربانی تھی جو رسول کے مقدس صحابی حضرت ابوذر غفاری نے پیش کی۔

ظاہر ہے کہ جب سرمایہ داری بڑھے گی تو سرمایہ دارانہ تعیش کا پیدا ہو جانا لازمی ہے چنانچہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت ہو گئی تھی اور اگر کوئی دیندار مسلمان یا رسول کا صحابی "نہی عن المنکر" کے اسلامی فرض کے ماتحت اس پر ٹوکتا تھا تو سیاست کے شکنجے میں کسا جاتا تھا چنانچہ علامہ ابن اثیر جزری اسد الغابہ (ج ۳ ص ۲۹۹) میں لکھتے ہیں کہ عبد الرحمٰن بن سہل انصاری حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے تو انھوں نے دیکھا کہ

اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جا رہی ہیں۔ عبدالرحمٰن آگے بڑھے اور اُنھوں نے اپنے نیزہ سے اُن مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر امیر معاویہ کو پہونچی تو اُنھوں نے کہا چھوڑ دو اُس بڈھے کو اُس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے شکموں میں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اصابہ (ج ۲ ص ۴۰۱) میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

یاد رکھیے کہ یہ ابوذر غفاری یا عبدالرحمٰن بن سہل انصاری اپنی فرض شناسی کی بنا پر اسلام کے قائم کردہ حدود و امتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ سیاست کے حدود میں وہ بالکل کم حقیقت اور بے وقعت ہو گئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقرر کردہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہو گئے۔

ایک مسلمان اپنی خاص عقیدت کی بنا پر اس نتیجہ کو غیر شعوری سمجھ سکتا ہے یعنی وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ سیاست وقت کا مقصد براہ راست یہی نہیں تھا کہ اسلام کو نقصان پہونچایا جائے مگر ہو یہی رہا تھا اور اس بنا پر جو شخص اس عقیدت کو نہیں رکھتا وہ اس کو دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے چنانچہ علہ اور یورپ کے مؤرخین کی شہادتیں ہیں جو صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ بنی امیہ کا برسر اقتدار ہو جانا درحقیقت اسلام کی شکست اور ایام جاہلیت کے کفر کی فتح تھی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ بنی امیہ اسلام کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ صرف اس لیے ہو گئے تھے کہ مشین کے کسی پرزے پر قابو پا کر اُسے اپنے مصرف میں لائیں گے چنانچہ امیر شام نے شہنشاہیت کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اُس شاہی نظام کی بنیاد ڈال دی جس کا جواز اسلام سے نہیں مل سکتا۔ یہ جگہ بہت پیچیدہ سوالات پیدا کرتی ہے۔ کیا شاہی نظام اُس وقت قائم کرنا درست نہ تھا؟ یہ تاریخی طاقتوں کو دیکھتے ہوئے خالص مادی نقطۂ نظر سے ترقی پسندی تھی یا رجعت پسندی؟

تاریخ کے بعض طالب علم جو مادی تضاد کو اُسکی تمام پیچیدگیوں میں نہیں دیکھتے شاید یہ کہیں کہ اسلام نے قومی اتحاد کے سانچے میں عربوں کو ڈھال کر ایک شاہی نظام کے لیے رستا کھول دیا تھا کیونکہ اُس اتحاد کی شیرازہ بندی اسی طرح ممکن تھی۔ یہ خیال حکومت اسلامی کے جمہوری نقطۂ نظر کے

علہ سید احتشام حسین صاحب ایم۔ اے

مطابق شاید صحیح ہوتا اگر بنی امیہ نے اپنے دبے ہوئے جذبات کو قومی شیرازہ بندی سے اوپر نہ رکھا ہوتا۔ اگر اُنھوں نے صحیح بنیاد پر اسلامی اصولوں کی ترویج، اسلامی مساوات کی تلقین، اسلام کی سادہ زندگی کو اپنا شعار بنالیا ہوتا۔ ایک طرح کی شاہی یقیناً اُس وقت کچھ زیادہ غلط نہ تھی لیکن شاہی کو قیصر و کسریٰ کی شاہی نہیں اسلام کی سرداری اور سروری ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات بہت زیادہ فرق پیدا کرتی ہے کیونکہ معاویہ اور یزید کی شاہی تو بڑے پیمانہ پر ایک قبیلہ کی سرداری سے ملتی جلتی ہے، اُسے اسلام کی شیرازہ بندی سے کوئی تعلق نہ تھا۔" ع۹ "دور بنی امیہ میں مذہب کے عروج و ارتقا کا نظریہ اس قدر بدل گیا کہ اموال کی فراوانی، افراد ملت کی کثرت مذہب کی ترقی و کامیابی سمجھی جانے لگی۔ چاہے افراد ملت توحید صحیح سے بھی آشنا نہ ہوں ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس نے قانون دفاع کے بجائے جنگ و غارت گری کا نام جہاد رکھ دیا۔ اس وقت سے سیاست اصل شریعت سمجھی جانے لگی۔"

کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر اسلام کے بعد پیغمبر کے گھرانے کے لوگ جنھیں برابر وہ اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنھیں اُنھوں نے اپنے مقاصد سے پورے طور پر آگاہ کر دیا تھا اور اُن کی عملی تربیت بھی اس طرح کر دی تھی کہ وہ اپنے اقوال و افعال سے اُن مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں، اسلامی انقلاب اور اُس کے خصوصیات و امتیازات کے محافظ تھے۔ دنیا میں عالی شان محل تعمیر ہو چکے تھے لیکن ان کا وہی چھوٹا سا مکان تھا جس میں انھیں پیغمبر نے رکھ دیا تھا۔ دنیا کے محلات میں ریشمی پردے دروازوں پر ہو گئے تھے مگر ان کے دروازے پر وہی پھٹا ہوا پردہ اب بھی نظر آتا تھا دنیا کے جسم پر حریر و دیبا نظر آتا تھا لیکن یہ کھدر کا ملبوس اب بھی زیب تن کرتے تھے۔ دنیا مفتوحہ ممالک کی دولت سے چین کرتی اور عیش و عشرت میں زندگی گزارتی تھی مگر یہ اب بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کھانا اور مال حلال کی تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور جو دولت بھی ملتی اُسے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی نذر کر دیتے۔ ان میں ذمہ دار ہستی حضرت علی ابن ابیطالب کی تھی۔ اروِنگ نے لکھا ہے:۔ "علی ابتدائی قابل ترین مسلمانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے کہ اپنے مذہبی تقدس کو رسول کی صحبت سے نشو و نما دی تھی اور جنھوں نے آخر وقت تک رسول کی

ع۹ مولانا نعمت امام صاحب حنفی (پھلواری ضلع پٹنہ)

سادہ زندگی کا اتباع کیا" اور اس بنا پر ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علمبرداروں میں کشمکش لازمی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت عثمان کے بعد مسلمانوں نے آپ کو خلافت کی زمام سپرد کی اور آپ کو بالاتفاق شہنشاہ اسلام تسلیم کیا تو شام کے حاکم امیر معاویہ نے آپ کی خلافت کو پسند نہیں کیا کیونکہ ۱۵۱ "جب حضرت علی رسول کے چوتھے خلیفہ ہوئے تو ہوا کا رُخ بدل گیا۔ آپ شاہانہ اقتدار کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کے وقت یہودیوں کے باغوں میں پانی دے کر اپنی روزی پیدا کرتے تھے مگر قومی خزانے میں ہاتھ نہ لگاتے تھے اب یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی فرد یا کوئی جماعت بیت المال سے بے استحقاق متمتع ہو سکے۔ چنانچہ سردارانِ عرب کو جو وظیفے بیکار مل رہے تھے وہ سب آپ نے بند کر دیے۔ حضرت علی حضرت ہاشم کے پرپوتے اور پیغمبرِ عرب یعنی حضرت محمدؐ کے چچازاد بھائی تھے۔ اولادِ ہاشم کی حکومت یوں ہی بنی امیہ کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی اُس پر حضرت علی کی سخت گیری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کی چنگاریاں دہکتے دہکتے جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی اور بنی امیہ نے حاکم شام امیر معاویہ کی سرکردگی میں حضرت علی سے بہت سی لڑائیاں لڑیں۔" "یہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ۵۲ "معاویہ بن ابی سفیان حضرت عمر کے زمانہ سے حاکم شام تھے جہاں اُنھوں نے اپنی قوت کو بہت مستحکم کر لیا تھا۔ حضرت عثمان کے بدقسمت قتل نے اُنھیں ایک اچھا موقع دیا جس سے فائدہ اُٹھانے میں اُنھوں نے دیر نہ کی۔ اُنھوں نے فوراً مقتول خلیفہ کا بدلا لینے کی غرض سے علی کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اُنھوں نے عثمان کی خون آلود قمیص اور اُن کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی اُنگلیاں دمشق کے منبر سے دکھا کر شامیوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا جو کہ اس المناک منظر کو دیکھ کر اس قدر روئے کہ اُن کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ مجمع کا یہ غم و غصّہ اور جذبۂ انتقام کشی حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن یہ بات بہت مشکوک ہے کہ معاویہ کی بغاوت بھی اسی حقیقی اور صحیح جذبۂ انتقام کے ماتحت تھی۔ اُن کا علی کو قتل میں شامل کرنا اور اُن کو باغیوں کے بھڑکانے اور پناہ دینے کا مجرم قرار دینا اس بات کو یقینی طور سے ظاہر کرتا ہے کہ معاویہ نے قتلِ عثمان کو اپنے مقاصد کے حصول کا ایک بہانہ بنایا تھا اس لیے کہ اس شورش اور بغاوت کے زمانہ میں جو کہ قتلِ خلیفہ

---

۱۵۱ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے ۵۲ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

کی صورت میں ظاہر ہوئی حضرت علی کا رویہ نہایت ممدوح اور پاک و صاف تھا۔ آپ نے ایک حد تک اس تباہی کے روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن آخر میں آپ اُس غم و غصہ کے سیلاب کو جو روز بروز خلیفہ کے خلاف قوت حاصل کرتا جاتا تھا روکنے سے مجبور ہو گئے۔ بہر حال جو صورت بھی ہو معاویہ نے اتحاد بین المسلمین کو فنا کر دیا اور اُن کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی جو اُس وقت سے آج تک پُر نہ ہو سکی۔" ع۹ "السر نے لکھا ہے:- اگر علی کو اطمینان سے حکومت کی جانے دی گئی ہوتی تو اُن کے صفات حمیدہ، اُن کا استقلال اور اُن کے کردار کی بلندی قدیم جمہوریت اور اُس کے سادہ طریقوں کو لافانی زندگی دیدیتیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت اور اس کے علاوہ جب کبھی بھی مقابلہ پڑا ہے دنیا میں آلِ رسول کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور اُس نے امتیاز صرف فرائض انسانی کی بنا پر قرار دیا تھا مشترکہ دولت جو مال غنیمت سے حاصل ہوتی ہے اُس کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اسلام کے محافظین اس کے قریب نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے آلِ رسول کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولتمند بنیں اور خصوصیت سے اُن لوگوں کو زر و جواہر سے مالامال کریں جن سے اُن کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی اُمید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علی بن ابیطالب جو کچھ بیت المال میں آتا ہے روز کا روز تقسیم کرتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے ہیں اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علی نے مسلمانوں کے مال کو پہونچانے میں مستحق لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔ (استیعاب جلد ۲ مطبوعہ حیدرآباد دکن ص۴۷) (صواعق محرقہ ص۷۷)

اصفہان سے مال آتا ہے۔ اُس وقت اتفاق سے سات آدمی صاحب استحقاق موجود ہیں آپ نے تمام مال کے برابر سے سات حصے کر دیے اور ایک روٹی بھی اُس مال میں نظر آ گئی تو اُس کے بھی سات ٹکڑے کر کے ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر مثلاً اُس روٹی کو کسی ایک حصہ میں شامل کر دیا جاتا

ع۹ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

تو شریعت کے قانون کے مطابق کوئی جرم نہیں تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیت عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت علی بن ابیطالب تو عوام کی ذہنیت مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے۔ اس لیے آپ کو ایسی چھوٹی باتوں کا بھی خیال ضروری تھا۔ ع۵ "اعتراض ہوا کہ علی سب کو ایک نظر سے کیوں دیکھتے ہیں تو علی نے ان لفظوں میں جواب دیا جو تاریخ عالم میں ہمیشہ یادگار رہیں گی لو کان المال لی لسویت بینھم فکیف وانما المال مال اللہ "میرا بھی مال ہوتا تو میں برابر ہی تقسیم کرتا اور یہ تو ہے ہی خدا کا مال"، الا وان اعطاء المال فی غیر حقہ تبذیر واسراف وھو یرفع صاحبہ فی الدنیا ویضعہ فی الاخرۃ " یہ یاد رکھو کہ بغیر استحقاق کے کسی کو مال دیدینا فضول خرچی میں داخل ہے۔ آج ممکن ہے کہ ایسا کام کرنے والا بڑا بن جائے مگر مستقبل میں وہ پست ہی رہے گا"

انتہا یہ ہے کہ اسی مساوات پسندی پر حضرت علی سے اُن کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کو تمام مسلمانوں سے زیادہ کچھ دیا جائے اور حضرت علی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنا ذاتی حصہ آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ اُنھوں نے کہا اس میں میرا کیا بھلا ہو گا۔ آپ نے کہا مجبوری ہے۔ ایک دن جب بہت اُنھوں نے اصرار کیا تو فرمایا آج آدھی رات کے بعد آئیے گا۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہوئے ہوں کہ اُس وقت آؤں گا تو علی پرائیوٹ طور پر میری کوئی خاص امداد کریں گے۔ آئے وہ اُس وقت پر، حضرت اُن کو لیے ہوئے بازار میں آئے دوکانیں بند تھیں۔ آدمیوں کی آمد و رفت موقوف ہو گئی تھی اور شہر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ حضرت علی نے کہا دیکھیے یہ وقت اچھا ہے۔ ان دوکانوں میں سے کسی ایک کا قفل توڑ لیجیے اور جو کچھ ملے لیجائیے عقیل نے کہا واہ تم مجھے چوری کی تعلیم دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا اور آپ بھی تو مجھ سے یہی چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے اموال میں سے چُرا کر آپ کو دیدوں۔ ایک روز ایسا ہوا کہ جب عقیل نے بہت پریشان کیا تو آپ نے لوہا گرم کر کے عقیل کے جسم سے ملایا۔ وہ تڑپ گئے کہ تم مجھے جلائے دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو دنیا کی آگ ہے۔ آپ تو مجھے آخرت کی آگ میں جلانا چاہتے ہیں غرض یہ باتیں تھیں کہ عقیل آپ سے جدا ہو کر امیر شام کے پاس چلے گئے۔ وہاں اُن کی بڑی

ع۵ مولانا سید ابن حسن صاحب جارچوی

آؤ بھگت ہوی اور اپنی ایک بڑی سیاسی فتح سمجھی گئی کہ علی کے بھائی اُن سے ٹوٹ کر ہمارے پاس آگئے (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۷۹) پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر۔ اس کے برخلاف دوسری طرف ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا مُنھ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اُسے مالامال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ ان کا ساتھ دیتے یا اُن کا؟!

دنیا کی تو یہ حالت ہی کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے، اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اُس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہی اور اس طرح اُس کی شان قائم ہو جاتی ہی۔ یہاں حضرت علی کی یہ کیفیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہی جو بغیر اس تلوار کے فروخت کئے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہی کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سوائے شام کے تمام عالم اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی۔ (استیعاب ج ۲ ص۴۷۸) ہر ایک حریص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اُس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہی۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی مرعوب ہوتی ہی مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیر اپنی حکومت کے زمانہ میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ میثم تمار کی دوکان پر خرید فروخت کریں۔ بازار میں قنبر کو ساتھ لے کر گئے اور دو پیراہن خرید کئے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا سات درہم کا پیراہن قنبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قنبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دیتا کہ میں مساوات کے پھیلانے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علی کا مقصد یقیناً یہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا۔ سُننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچوں کو دیا جاتا ہی۔ فرمایا قنبر! تم نوعمر ہو تمھیں وہی پیراہن اچھا معلوم ہوتا ہی۔ میرا کیا میں یہی پہن لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہل دنیا کہاں کر سکتے تھے اور ان کے دل پر ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے اُن تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس کے پہلے برسرِ اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے میں اُن میں سے ہر ایک کے اقتدارِ رفتہ کا قیام منحصر تھا۔ اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا چنانچہ ؎۵ "جب حضرت علیؑ نے مروان بن حکم، سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کو بلوایا اور اُن سے اپنی اطاعت قبول نہ کرنے کے اسباب پوچھے تو ولید نے جواب دیا کہ اے ابوالحسن ہم آپ کی بیعت کیونکر کر سکتے ہیں۔ آپ نے ہمارے پر و بال قطع کر دیے ہیں۔ اور ہمارے سینوں میں حسد کی آگ روشن کر دی ہے آپ نے میرے باپ کو جنگ بدر میں قتل کیا اور سعید بن العاص کے باپ کو بھی جنگ بدر میں قتل کیا۔"

یہ بھی ہے کہ اسلام نے اپنے اصول مساوات کی تلقین سے خود امت عربیہ کا بحیثیت امت بھی امتیاز خاص ختم کیا تھا اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے اُنھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کر دی اور موالی اور اعجام کی کو دبانے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش کا قدرۃً یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہو جائیں۔ بنی ہاشم اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری نہیں کر سکتے تھے اس لیے عرب کی جانبداری کا پہلو ان کا کمزور تھا۔ اس کی تصدیق آپ کو ہو سکیگی اس سے کہ اس کے بعد جب بنی امیہ کے خلاف ہاشمیین نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیادت و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد اور عناد تھا۔ اس لیے وہ نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا، ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی

؎۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ۔

بنا پر جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افرادِ اہل قبیلہ بھی اُن ہی کی پیروی کرتے تھے۔ کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجہ میں قید ہوتے ہیں۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ جب امیرِ شام نے حضرت علی بن ابیطالب سے مقابلہ کیا تو امیرِ شام کا لشکر تعداد میں حضرت علی کے لشکر سے نمایاں طور پر زیادہ تھا۔ مگر ع۱ "حضرت علی اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور فنونِ جنگ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ میدان ہمیشہ اُنھی کے ہاتھ رہا۔ جب تیر و شمشیر سے مقصد حاصل نہ ہوا تو عیاری اور مکاری کے حربے استعمال ہونے لگے"۔ چنانچہ قرآن نیزوں پر بلند کیے گئے اور کہا گیا کہ بس کتاب اللہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے

ع۲ "آج کل کے متعلم تاریخ کو یہ بات بےحد خلافِ قیاس معلوم ہوگی کہ حضرت علی کی جماعت میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے اس تجویز کو مان لیا اور اُس چال کو نہ دیکھا جو اس کے نیچے چھپا ہوا تھا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں ظاہر پرست "راسخ العقیدہ" حضرات کی ایک بڑی جماعت شامل تھی جو کہ خدا کے کلام پر فیصلہ کی خواہش کو رد کر دینا انتہائی بددینی اور گناہ خیال کرتے تھے۔ یہ بھی اغلب ہے کہ حضرت علی کی فوج میں کچھ ایسے غدار بھی ہوں جو کہ دشمن کے مقصد سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے ان سادہ لوح اور بھولے بھالے انسانوں پر مذہبی احساسات کا جادو چلائیں۔ علی خود اس چال کی کنہ سے پوری طرح واقف تھے اور وہ کسی طرح اس تجویز کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ لیکن اُن کے ساتھ والوں میں عمر بن العاص کی چال پر وہ مذہبی جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ انھیں لڑائی بند کر کے اپنے سردار مالک اشتر کو میدانِ جنگ سے واپس بلا لینا پڑا۔ اب یہ بات طے پائی کہ جانبین کی طرف سے ایک ایک حکم معین کر دیا جائے اور یہ دونوں حکم علی اور معاویہ کے درمیان قرآن کی رو سے فیصلہ کریں۔ تحکیم میں حضرت علی کی رائے پر عمل نہ کیا گیا اور ابوموسیٰ اشعری ان کے نمائندہ قرار دیے گئے۔ یہ معزز ضعیف العمر انسان عمر بن العاص نمائندۂ معاویہ کے پالنگ کے مقابلہ میں بھی نہ تھے جب یہ دونوں کچھ مہینے کے بعد اپنا اپنا فیصلہ دینے کیلئے کوفہ اور دمشق کے درمیان بمقام دومۃ الجندل جمع ہوئے تو ابوموسیٰ سے فریب کے ساتھ علی کے خلاف فیصلہ لے لیا گیا اور عمر عاص نے اپنا فیصلہ معاویہ کی موافقت میں دیا"۔ ٹریجڈی آف کربلا کی لفظوں میں "جنگ صفین کا نتیجہ ایک گورکھ دھندا سا

ع۱ سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ادیب　ع۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

ہوگیا۔ معاویہ کا اقتدار شام میں قائم رہا جبکہ حضرت علی حجاز اور عراق پر حکمران تھے۔"

پھر حضرت علی کا ارادہ تھا کہ دوبارہ شام پر فوج کشی کریں مگر آپ نماز صبح کے وقت مسجد کوفہ میں اپنے معبود کے سجدہ میں شہید کردیے گئے۔ آپ کی شہادت کا اثر عالم اسلام بلکہ دوسری قوموں پر بھی کیا پڑا۔ اس کے لیے ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں ع[۱] "پروفیسر ایم جی رنالڈ اپنی مشہور کتاب "روحانیت اور اسلام" کے تیسرے باب کے آخر میں لکھتے ہیں "جو مرتبہ دنیا میں علی کو ملا ہے وہ آج تک کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا حضرت علی نے روحانیت کے ساتھ دنیا پر حکومت کی اور اہل دنیا کو امن و سلامتی کے ساتھ حکومت کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ ان کی شہادت کے روز جہاں کوفہ کے کلمہ گو روئے وہاں سب سے زیادہ عیسائیوں نے بکا کی۔ علی کے مرنے پر ہزاروں یہودی اور عیسائی عورتیں اور بچے جو بے وارثی کے عالم میں محض ان کے دست فیض سے پرورش پاتے تھے محروم ہوگئے اور بھوکے پیاسے مارے مارے پھرنے لگے۔ جب بیت المقدس میں بطریق اعظم کو شہادت علی کی خبر پہونچی تو دو دو دن تک اس مبارک شہر کے گلی کوچوں میں افسوس و حسرت چھائی رہی۔ بطریق اعظم کی آنکھوں سے اس سانحہ میں آنسو نہ تھمے۔" ۱۹۱۰ء میں ریورینڈ میجران ہال نے حضرت علی کی شہادت پر تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے "حضرت علی کے اُٹھ جانے سے دنیائے روحانیت حکومت سے خالی ہوگئی حضرت علی تمام عالم کے لیے مشعل ہدایت تھے۔ ان کا وجود دوسری اقوام کے لیے بھی امن و سلامتی اور رحمت کا باعث تھا۔ افسوس ایک باغی کی تلوار نے دنیا کی امن و سلامتی کو آغوش لحد میں سُلا دیا۔ دنیا میں حضرت علی سے بڑھکر ہر دلعزیز کوئی دوسرا نہ ہوسکا۔ اگرچہ اُن کا جنازہ رات کو اُٹھا مگر اُس وقت بھی کوفہ کے تمام گلی کوچے عیسائی، یہودی اور آتش پرست سوگ نشینوں سے بھرے پڑے تھے اور وہ ہمیشہ اس طرح روتے رہے جیسے کوئی اپنے باپ کو روتا ہے۔" ع[۲] حضرت علی کی شہادت سے بنی امیہ کا راستہ کسی قدر صاف ہوگیا لیکن بنی ہاشم تقدس، روحانیت، علم اور اخلاق میں بنی امیہ سے کہیں افضل تھے اور رسول کی قرابت کا شرف انہی کو حاصل تھا۔ اس لیے روحانی سیادت کا بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو جانا اب بھی مشکل تھا چنانچہ حضرت علی کے بعد اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسن خلیفۂ رسول تسلیم کر لیے گئے۔ امیر معاویہ کا آبائی اور ذاتی تجربہ بتا چکا تھا

ع۱ ناموس اسلام   ع۲ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

کہ بنی ہاشم کے مقابلہ میں تلوار اُٹھانا بے سود ہے۔ اس لیے اُنھوں نے امام حسن کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام کچھ ایسا تھا کہ اگر آپ منظور نہ کرتے تو حبّ جاہ کی تہمت اور خونریزی کے الزام سے بچنا مشکل تھا شرائط صلح بھی بُرے نہ تھے۔ بہرحال مصلحت وقت سمجھ کر امام حسن نے صلح کرلی۔"

اس صلح کے اسباب اور بہت سے حالات کا بیان پہلے ہو چکا ہے اور اس صلح پر مزید تبصرہ ابھی آئندہ مناسب موقع پر آئے گا۔ یہاں تو ہم صرف اس صلح کے شرائط کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ انہی شرائط کی روشنی میں پھر ہم شام کی حکومت کے عمل اور اُس کی رفتار کو جانچ سکیں۔ اس صلحنامہ کے مکمّل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعۂ مصر ص ۸۱) میں درج کیے ہیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سُنت رسول اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے۔

(۲) یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علی کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں اُن کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

(۵) یہ کہ معاویہ حسن بن علی اور اُن کے بھائی حسین اور کسی کو بھی خاندان رسول میں کوئی نقصان پہونچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔" یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولی ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسن نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کیلئے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے تصادم نہیں رکھتے تھے۔ ان کی لڑائی جو کچھ بھی تھی وہ اصول شریعت و مذہب کے لیے۔ حضرت امام حسن نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیر شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سُنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپ نے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مُسلّم بنادی کہ اصول شریعت اور ہے اور آئین حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی

جس کے لیے آل محمد برابر کوشاں رہے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکام اسلام کا طرزِ عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا اور گویا فریقِ مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک جو کچھ حکومت شام کا رویہ رہا ہے وہ کتاب اور سنت کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریق میں بنائے مخاصمت ہوں۔ اگر حکومت شام کا سابقہ طرزِ عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ ان کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ امیر شام اپنی زندگی بھر کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا جو اس کے خلاف کرتا۔ اس لیے آپ نے آیندہ کے لیے جانشین بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

حضرت امام حسن کی طرح اُن کے چھوٹے بھائی امام حسین بھی اس صلح سے متفق تھے اور اُن کی رائے بھی حالات وقت کو دیکھتے ہوئے امام حسن کی رائے سے متحد تھی۔ ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو "الاخبار الطوال" مصنفہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری متوفی ۲۸۱ھ (مطبوعہ مصر ۱۳۳۰ھ) صفحہ ۲۲۲۔ وہ لکھتے ہیں کہ حجر بن عدی اور علبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسین کے پاس آئے اور کہا آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دستکشی کر لی۔ اچھا اب آپ بذات خود آج ہماری بات مان لیجیے پھر کبھی نہ مانیے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسن کو تو اس صلح کے راستے پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر جمع کیجیے اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ پس امیر شام کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ہم اچانک تلواریں مارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسین نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، ہم عہد کر چکے اور قول و قرار ہو چکا۔ اب عہد شکنی ممکن نہیں۔ اور ملاحظہ ہو۔ علی بن محمد بن بشیر ہمدانی، یہ بھی اُسی جماعت میں سے ہیں جو صلح پر معترض تھی، ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہونچا اور امام حسن کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اُس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا السلام علیک یا مذل المؤمنین "سلام ہو آپ کو اے مومنین کو ذلیل کرنے والے"! آپ نے فرمایا وعلیک السلام بیٹھو میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو اُن کی

عزّت رکھ لی اور اُن کو خونریزی سے بچالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے۔" اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اُٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسنؑ کی بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت امام حسنؑ) نے تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اُس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے۔"

سمجھے آپ امام حسینؑ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اُس وقت لے گا جب امیر معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا کہ جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آیندہ چل کر تم کو اس انسان کے تدبّر کی داد دینا پڑے گی جس نے بیس برس پہلے یعنی ۴۱ھ کے آئینہ میں ۶۱ھ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسینؑ کی پیش بینی آیندہ چل کر حرف بحرف پوری ہوئی۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی سیاسی قوت بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ اُن کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بھی بالکل دور ہو گیا تھا اور انھیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع تھا۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کے لفظوں میں "اس طرح امیر معاویہ مطلق العنان مالک ہو گئے اُس اسلامی سلطنت کے جو اب پھیلی ہوئی تھی مغرب میں بحر روم سے لے کر مشرق میں ماورا النہر تک (ٹریجڈی آف کربلا) اب طنطنۂ حکومت کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ولی نعمت حضرت عمر بن الخطاب کی عظمت شخصیت کا بھی انکار تھا اور اُن سے مقابلہ کا دعوی تھا۔ اس واقعہ کا ثبوت صحیح بخاری کتاب المغازی اور شرح علامۂ قسطلانی سے ہوتا ہے عکرمہ نے عبداللہ بن عمر کی زبانی بیان کیا ہے کہ میں اپنی بہن ام المومنین حفصہ کے پاس گیا اُس وقت وہ غسل سے فارغ ہو کر اپنے بال درست کر رہی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا آپ نے لوگوں کی حالت دیکھی؟ امر خلافت کے لیے کیا کر رہے ہیں اور ہمارا ذکر بھی نہیں کیا جاتا! (شارح بخاری لکھتے ہیں یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب معاویہ کے لیے خلافت پر بیعت ہو چکی تھی) حضرت حفصہ نے بھائی سے کہا کہ تم لوگوں سے جا کر ملو وہ تمھارے منتظر ہوں گے اور تمھارے نہ جانے اور نہ ملنے سے تفرقہ کا اندیشہ ہے۔ یہ خبر شاید امیر معاویہ کو بھی پہنچ گئی انھوں نے عبداللہ بن عمر کی موجودگی میں خطبہ پڑھا اور کہا "جو شخص میری خلافت کے

بارے میں کچھ کلام کرنا ہو وہ ذرا اپنی صورت تو دکھائے۔ ہم اُس سے اور اُس کے باپ سے زیادہ اس منصب کے حقدار ہیں۔ یہ تھا عبد اللہ بن عمر پر طنز جس میں حضرت عمر پر بھی حملہ تھا حبیب بن مسلمہ نے بعد میں عبد اللہ بن عمر سے کہا آپ نے جواب دیا! عبد اللہ نے کہا کہ میں نے جواب دینا چاہا تھا کہ اس خلافت کا تم سے زیادہ حقدار وہی تھا جس نے تم سے اور تمھارے باپ سے اسلام پر جنگ کی تھی یعنی حضرت علی مگر تم نے اُن کی خلافت تسلیم نہ کی اور اُن کا مقابلہ کیا مگر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے اس جواب سے ہنگامہ پیدا ہو جائے اور خونریزی کی نوبت آئے اس لیے میں نے صبر سے کام لیا اور خاموشی اختیار کی۔"

اس نہیب حکومت کے بعد پھر کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر معاویہ نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا معاہدہ کے مکمل ہونے اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد ہی نخیلہ میں جا کر یہ اعلان کر دیا کہ یہ سب حصول اقتدار کی ترکیبیں تھیں۔ اب کہاں کا معاہدہ اور کہاں کے شرائط چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا۔

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنت رسول پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہی اور اہلسنت کے نقطۂ نظر سے حضرت رسول اللہ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک خلافت راشدہ رہی ہے اور یہ تیس برس کی مدت ختم ہو جاتی ہے حضرت امام حسن کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت و جہانبانی اور دنیاداری ہے۔ خلافت راشدہ نہیں ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا سنت رسول اور راشدین و مہدیین خلفاء کی سیرت پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ امیر معاویہ کی حکومت خلافت راشدہ کے حدود سے خارج ہوتی عمر بن عبد العزیز تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا زمانہ خلافت راشدہ سے ملتا جلتا ہے مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر امیر معاویہ کے دور حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ "خطائے اجتہادی" اور "خطائے منکر" کی بحثیں علماء کے درمیان کی ہیں اور معتقدات و مسلمات سے متعلق ہیں۔ تاریخ کا کام واقعات کو محفوظ کرنا ہے۔ نیتوں کی بحث اس دائرہ سے خارج ہے۔ آخر دینوری، طبری، دیار بکری، ابو الفدار، ابن اثیر، ابن حجر، ابن عبد البر، ملا علی متقی، حافظ سیوطی

وغیرہ وغیرہ بھی کچھ نہ کچھ معتقدات تو رکھتے ہی تھے مگر اُن کا قلم تاریخی واقعات کے درج کرنے سے نہیں جھجکا ممکن ہے کہ ان واقعات کی کوئی تاویل اُن کے دل میں ہو مگر اس سے اصل واقعہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑ سکتا نیتوں کے ساتھ تعلق ہے تو آخرت کے جزا و سزا اور نجات یا عدم نجات کا مگر خارجی نتائج تو واقعات کی خارجی کیفیت کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اس لیے واقعات کے استنتاج اور تحلیل و تعلیل میں جو تاریخ کا مطمح نظر ہوتا ہے نیتوں کی بحث بالکل دور از کار اور خارج از مبحث ہے۔

ذیل کے واقعات جو یہاں درج کیے جاتے ہیں وہ اُن ہی سابق مورخین کی صدائے بازگشت ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ "حسن ظن" کے لیے اس کے بعد بھی گنجائش باقی رہے گی جس طرح پہلے باقی تھی،

ان میں سے ایک بات تھی سیاسی مصالح سے زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بتا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے تفصیل اس کی جیسا کہ "الاخبار الطوال" میں ہے یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک ثقفی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلدہ کی کنیز تھی حارث نے اس کو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا مغیرہ بن شعبہ جب حضرت عمر کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ جب حضرت علی بن ابیطالب خلیفہ ہوے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا جب جنگ صفین درپیش ہوئی تو معاویہ نے زیاد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوارہ کا لڑکا اور نفاق کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے؟ حالانکہ میرے اور اُس کے درمیان رسول اللہ کے چچازاد بھائی نوے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوے موجود ہیں خدا کی قسم اگر اُس نے ادھر کا رُخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوے سامنے موجود ہونگا اور بڑی شدید جنگ کرونگا معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا جب حضرت امیر شہید ہو گئے اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیاد اصطخر میں قلعہ بند ہو گیا معاویہ نے اُسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ جو کچھ تم کہو گے وہ میں تمھیں دوں گا چنانچہ زیاد معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اُس کا رُسوخ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ

معاویہ نے اُسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔ ظاہر ہی کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور ہو بھی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم حضرت شہنشاہ اسلام اور خلیفۃ المسلمین کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اُس کی عزت کیا ہو سکتی ہی۔ معاویہ نے کہا کہ یہ میرے باپ ابو سفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے دی؟ ابو مریم سلولی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا اس نے کہا کہ ابو سفیان میرے شراب خانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اُس رات اُس کی دلچسپی کی باعث ہو۔ میں نے سمیہ کو اُس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابو سفیان اور سمیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوے اور اُن تعلقات سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلۂ بنی مصطلق میں سے جس کا نام یزید تھا گواہی دی کہ میں نے ابو سفیان کو یہ کہتے سُنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہی۔ لیجیے دعویٰ ثابت ہو گیا اور زیاد حضرت خلیفہ کے برادر بہم قرار پا گئے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابۂ کرام میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش وللعاھر الحجر یعنی بچہ اصلی شوہر کی طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار کے سُننے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اُن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس ذریعہ سے اُنھوں نے زیاد کو اور اُس کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔ اسی زیاد کا نوفرزند عبید اللہ بن زیاد تھا جس کے ہاتھوں بعد میں قتل حسین کی ایسی مہم سرانجام پا سکی۔

اور سُنیے:۔ ایک شخص تھے حتات بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی۔ حضرت رسول اللہ نے ان میں اور معاویہ بن ابی سفیان میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات جیسی اسلام نے ایک مرتبہ مہاجرین میں اور ایک مرتبہ مہاجرین و انصار میں کی تھی۔ سب ہی کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا تھا، حضرت حمزہ کو زید بن حارثہ کا، حضرت ابو بکر کو حضرت عمر کا، حضرت عثمان کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا، طلحہ کو زبیر کا۔ اور حضرت علی کو پیغمبر نے خود اپنا بھائی قرار دیا تھا۔ ایسی ہی مواخات آپ نے حتات اور معاویہ میں قرار دی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نسبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عملدرآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اُس کے نسبی ورثہ تک پہنچائی جائے۔ اُس مذہبی بھائی کو نہیں

جو مواخات کے ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہے مگر اتفاق کی بات کہ یہ حتات امیر معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور اُن کا وہیں انتقال ہو گیا تو امیر معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا یہ کہکر کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں میں شور ہوا یہاں تک کہ فرزدق نے اس بارے میں شعر بھی کہے

ابوک وعمی یا معاوی اورثا — تراثا فیحتاز التراث اقاربہ

فما بال میراث الحتات اکلتہ — و میراث صخر جامد لک ذائبہ

فلو کان ھذا الامر فی جاھلیۃ — علمت من المرء القلیل خلائبہ

ولو کان فی دین سوی ذا شنئتم — لنا حقنا او غص بالماء شاربہ

(یعنی) تمہارے باپ نے اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ میراث قرابتداروں کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حتات کی میراث تو تم نے نوش جاں فرمائی اور ابو سفیان کی میراث تمہاری ہی ملکیت قرار پائی پس یہ معاملہ اگر زمانۂ جاہلیت کی رسم میں داخل ہے تو ہمیں اُس کا علم ہونا چاہیے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو ہمیں بھی ہمارا حق ملنا چاہیے نہیں تو یہ تمھیں ہضم نہیں ہو سکتا (اسد الغابہ ج ا ص ۳۷۹) مگر تاریخ نہیں بتلاتی کہ امیر معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حتات کے ورثہ کو اُس کا معاوضہ دیا گیا ہو اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلاف شریعت رواج پا رہی تھیں ع۵ ملا محمد معین اپنی کتاب دراسات اللبیب ص۲۷۷ میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے زکوٰۃ فطرہ کے متعلق کہا ہماری رائے میں زکوٰۃ فطرہ دو مد سمراء شام ہے یعنی شام کے گیہوں دو مد۔ ابو سعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مقرر کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عہد رسول میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جو یا کھجور یا زبیب اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو اُنھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مد گندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے۔ ابو سعید خدری کا قول تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کرونگا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سُن کر کہا " بئس الاسم الفسوق بعد الایمان یعنی ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت برا ہے۔ مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے "

ع۵ ناموس اسلام

"مقدام بن معدی کرب کی گفتگو جو امیر معاویہ سے ہوی ہے اس میں انھوں نے کہا تمہیں خدا کی قسم بتاؤ کیا رسول اللہ نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے پھر مقدام نے کہا کیا آنحضرت نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور اُن کا پہننا ممنوع نہیں قرار دیا تھا۔ معاویہ نے کہا ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدام نے کہا پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمھارے گھر میں دیکھتا ہوں"

"اس کے علاوہ شریعت اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت رو بقبلہ یا پشت بقبلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے حضرت ابو ایوب انصاری جب شام میں پہونچے تو تمام پیشاب اور پاخانہ کے مکانات کو رو بقبلہ پایا۔ انھوں نے استغفار پڑھ کر منھ پھیر لیا (دراسات اللبیب ص ۱۳۹)"

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک الخ ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریم اور اصحاب کبار برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو امیر معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو تلبیہ سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی آواز نہیں سنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس اپنے خیمہ سے نکلے اور پکار لبیک اللھم لبیک اور کہا اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرغم ہے ان لوگوں نے علی کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے اس طرح کی تین روایتیں ابن عباس کی کنز العمال میں صحیح ہیں جن میں ابن عباس نے بدعادی ہے اس بنا پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علی عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے

یہ ضد و ضدا حضرت علی ابن ابیطالب سے بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہوگئی چنانچہ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (ج ا صفحہ ۱۰۶) میں لکھتے ہیں کہ حضرت علی نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے اس لیے جب بنی امیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علی کے آثار باقی نہ رہیں۔

کنز العمال ملا علی متقی ج ۴ صفحہ ۲۱۰ میں ہے کہ مدینہ میں امیر معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء باجماعت پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عمداً چوری کی ہے یا بھول گئے ہو۔ بسم اللہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کی اور اُس نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

اس کے ساتھ ہی صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۶ اور صحیح مسلم ج ا ص ۶۹ سے مندرجہ ذیل روایات کو

ملاحظہ فرمائیے:- عمران بن حصین نے حضرت علی کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علی جب سجدہ سے اُٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ صحیح مسلم ج ا ص ۱۶۹ میں ہے:- مطرف کا بیان ہے کہ میں نے اور عمران بن حصین نے علی بن ابیطالب کے پیچھے نماز پڑھی پس جب علی سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اُٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اُٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ بے شک انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفےٰ والی نماز پڑھائی ہے۔ یا یہ الفاظ کہے کہ انھوں نے ہم کو حضرت رسول کی نماز یاد دلائی۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسول روتے تھے اور افسوس کرتے تھے۔ دیکھو علامہ ابن القیم اغاثۃ اللھفان صفحہ ۱۰۸ میں لکھتے ہیں:- ایک روز ابو درداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ ہم ان لوگوں میں کوئی امر بھی محمدؐ کا نہیں پاتے، سوائے اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں۔ امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے۔ انہیں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے، بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ ہم انس بن مالک کے پاس دمشق میں گئے تو ہم نے انس کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں ہم عہد رسول اللہ میں پاتے تھے، اب ان میں سے ایک بات بھی نہیں دیکھتے سب مفقود ہیں مگر یہ نماز رہ گئی ہے۔ سو وہ بھی ضایع کر دی گئی ہے (صحیح بخاری جلد ا ص ۳۹۵)

حافظ سیوطی کا ایک رسالہ ہے اوائل کے نام سے جسمیں انھوں نے تمام وہ باتیں درج کی ہیں جنھیں امیر معاویہ نے ایجاد کیا تھا اور وہ پہلے خلفاء کی سیرت سے علیحدہ تھیں منجملہ اُن کے لکھا ہے کہ معاویہ وہ اول شخص ہیں جو صفا و مروہ کے درمیان سوار ہو کر چلے۔ وہ اول شخص ہیں جنھوں نے علی الاعلان نبیذ یعنی جو کی شراب پی اور گانا سنا اور جنھوں نے مٹی کھائی اور ڈاڑھی کھانا مباح قرار دی۔" اس آغاز کا انجام اگر یزید کی شراب خواری اور رقص و سرود کے ساتھ فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبیعی رفتار کے لحاظ سے قابل تعجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (مطبوعہ لیدن صفحہ ۱۰۹) میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ

نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پہرہ دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے علامہ جرجی زیدان تمدن اسلام میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے خز و دیبا کے بیش قیمت اور شاندار لباس پہننے میں رومیوں کی پیروی کی تھی (تمدن اسلام مترجمہ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ص ۹۷)

مذکورہ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھ کر اگر عقیدت دامنگیر نہ ہو تو انسان یہ نتیجہ نکال لے گا کہ ابوسفیان کی اولاد کو بنی ہاشم سے ایک موروثی عداوت جو تھی اُس کی بنا پر وہ اُن کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے مجبوری یہ تھی کہ ان کی حکومت اسلام کی بنا پر تھی اس لیے اُنھیں پیغمبر اسلام کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے احساس اور اُس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ امیر معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے معمر آدمی سے ملاقات کا جو گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرموت میں ایک شخص ہے جس کی تین سو برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اُس کے پاس آدمی بھیجے اور اُسے بلوایا جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے۔ اُس نے کہا امد بن ابد۔ معاویہ نے اُس سے عبدالمطلب اور امیہ وغیرہ کے حالات پوچھے۔ پھر کہا تم نے محمد کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سُن کر حیرت ہوئی اور اُس نے کہا و من محمد یعنی محمد کون؟ اُنھوں نے کہا "وہی رسول اللہ" اُس نے کہا پھر تم نے پہلے ہی اُن کا نام اُس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا جس کا خدا نے اُنھیں مستحق قرار دیا ہے کیوں نہیں کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ملاحظہ ہو اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ۱ ص ۱۱۵)

اس سے زیادہ حیرت خیز وہ ہے جسے علامہ ابن تیمیہ نے "صارم مسلول" میں لکھا ہے کہ ایک روز معاویہ کے دربار میں ابن اشرف یہودی کے قتل کا ذکر ہو رہا تھا تو بنیامین یہودی نے کہا ابن اشرف کے ساتھ غداری کی گئی اور اُس کو فریب سے قتل کیا گیا۔ امیر معاویہ سُنتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ محمد بن مسلمہ انصاری کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے معاویہ تمھارے روبرو رسول اللہ کی توہین کی جا رہی ہے دغا کا الزام لگایا جاتا ہے اور تم سُن رہے ہو؟! (نصائح کافیہ ص ۹۰)

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ اسلامی دربار میں خلیفۂ وقت کو رسول اللہ کہہ کر

سلام کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کو سزا تو درکنار معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی جاتی۔ اس واقعہ کا تذکرہ مشہور مؤرخ محمد بن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں ۶۰ھ کے واقعات کے ذیل میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ عمر بن عاص اہل مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دار الخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ عمر بن عاص معاویہ سے کچھ برسرپرخاش تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اُسے خلیفہ کہکر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اُس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا اسکی وجہ سے تمھاری ہیبت اُس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ امیر معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہونچنے کی اطلاع ہوی تو وہ اپنی ذہانت سے عمر عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور دربانوں سے کہا میرا خیال ہے کہ نابغہ کے لڑکے (عمر عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہوگا۔ لہذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اُس کی جان کی خیر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب بجالایا کہ السلام علیک یا رسول اللہ بس پھر کیا تھا سب نے اس کی موافقت کی اور جو آیا اُس نے معاویہ کو رسول اللہ کہکر سلام کیا (تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۸۴ مطبوعہ مصر)

مثل مشہور ہے الناس علیٰ دین ملوکھم "لوگ بادشاہوں کے طریقہ پر چلتے ہیں" اگر حکومت کی یہ روش ہو تو عام افراد کی نظر میں رسول اور شریعت رسول کی کیا عزت باقی رہ سکتی ہے جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ حکومت کی طرف سے مذہب کا نیلام کرایا جاتا ہے اور تھوڑے سے سکوں کے عوض دین و مذہب کی خریداری ہوتی ہے تو لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ اس سے مقصود میرا اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جو استیعاب (مطبوعہ حیدر آباد دکن ج ا ص ۱۵۲) میں درج ہے کہ حتات مجاشعی اور جاریہ بن قدامہ اور احنف یہ تینوں آدمی امیر معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے جاریہ اور احنف کو روپیہ حتات سے زیادہ دیا۔ حتات نے آکر شکایت کی کہ آپ نے اُن دونوں کو مجھ پر ترجیح دی۔ امیر معاویہ نے کہا کہ ان دونوں سے میں نے اُن کا دین خرید کیا ہے حتات نے کہا پھر مجھ سے بھی میرا دین خرید لیجیے۔ (مزید تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ا ص ۳۷۹) یہ حتات وہی ہیں جنکی وراثت کا قصہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے ع۱ "علامہ مسعودی مروج الذہب

ع۱ ناموس اسلام

ج ۲ ص۲۵ پر معاویہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اہل شام کی اطاعت و فرمانبرداری معاویہ کے ساتھ اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ جب علی سے جنگ کرنے کو صفین جارہے تھے تو ان سب کو جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھا دی اور سب نے خوشی سے پڑھ لی۔"

آثار بنی ہاشم کے مٹانے کی سعی تعمیری یادگاروں تک بھی پہونچی چنانچہ جب امیر معاویہ نے حج کیا تو واپسی میں مدینہ بھی گئے اور منبر رسول کو اُس کی جگہ سے حرکت دی، چاہتے تھے کہ اُسے شام لے جائیں اُسی وقت سورج کو گرہن ہوا جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا معاویہ نے رسول اللہ کے شہر اور اُن کے دار الہجرت میں بڑا حادثہ رونما کیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے اسی سال امیر معاویہ لقوہ مین مبتلا ہوئے (کتاب البلدان مطبوعۂ لیدن (ہالینڈ) ص۴۴)

اول کی نسبت آخر کے ساتھ دیکھتے جائیے۔ مدینۂ رسول کے ساتھ اسی اقدام کی انتہا یزید کی جانب سے واقعہ حرہ میں مدینہ کی بے حرمتی پر ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ شہدائے احد کے متبرک قبور کے کھودنے کا حکم دیا گیا عہ "منہاج النبوۃ (ج ۲ ص۲۹۴) میں ہے کہ جب معاویہ نے احد میں نہر نکالنے کا حکم اپنے عامل مدینہ کے پاس بھیجا ہے تو معاویہ کو لکھا گیا کہ یہ نہر کسی طرح جاری نہیں ہوسکتی جب تک شہدائے احد کی قبروں پر سے نہ گزرے۔ معاویہ نے لکھا کہ قبریں کھود ڈالو اور شہیدوں کو دوسری جگہ لے جاؤ۔ علامہ تاج الدین سبکی نے شفاء السقام میں لکھا ہے کہ جب معاویہ نے نہر نکالی اور شہیدوں کو ان کی قبروں سے نکالنے کا حکم دیا تو ایک پھاوڑا حضرت حمزہ کے قدم میں لگا اور خون اُس سے جاری ہوا (تاریخ خمیس ج ۱ ص۴۹۵)

حضرت علی بن ابیطالب کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بنا پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصول اسلام کے علمبردار تھے اس لیے سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کی جائے۔ قتل حضرت عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی (ص۳۳ مطبوعۂ مصر) میں مروان بن الحکم کی زبانی منقول ہے اُس نے کہا کہ کوئی شخص علی سے زیادہ حضرت عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا کسی نے کہا کہ پھر تم لوگ منبروں پہ انہیں گالیاں کیوں دیتے ہو؟ اُس نے کہا بغیر اس کے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوسکتا۔

عہ ناموس اسلام

پھر جبکہ نصب العین یہ تھا اور مذہب و دیانت کی بے وقعتی کا وہ عالم تھا اور رسول اللہ کے عظمت و احترام کا نگاہوں میں وہ حال تھا اور احکام شریعت میں تراش خراش کا وہ نقشہ تھا تو کتاب اور سُنت پر عمل کی شرط کا انجام ظاہر ہے۔

دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے انجام کو ابھی رہنے دیجیے اُس وقت تک کے لیے کہ جب تک امیر معاویہ کے دور کا اختتام ہونے لگے۔ اُس وقت آپ کو اس شرط کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

تیسری شرط یہ تھی کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی، اس کا تفصیلی حال دیکھنا ہو تو عراق میں زیاد بن سمیہ کی حکومت کے واقعات کا مطالعہ کیجیے۔ یہ زیاد وہی ہے جس کے بھائی بنائے جانے کا واقعہ پہلے مذکور ہو چکا ہے عـ۵ " زیاد ۴۵ھ میں بصرہ کا گورنر معین ہوا، وہاں اس نے نہایت سختی سے حکومت کی۔ ۵۰ھ میں جب مغیرہ کا انتقال ہوا تو زیاد کو کوفہ کی بھی گورنری دیدی گئی۔ وہ چھ مہینے بصرہ میں اور چھ مہینے کوفہ میں رہتا تھا۔ اُس کی حکومت کو دہشت اور سہراس کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس پر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ بنی ہاشم کی طرف رجحان رکھتا ہے اُسے قتل کرا دیتا اور اکثر لوگوں کی آنکھیں نکلوا لیتا تھا۔ آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیتا تھا اور سولیاں دلواتا تھا ــــ ۵۳ھ میں اُس کی ایک انگلی میں زہرباد ہو گیا جس سے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

ابو حنیفہ دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۲۲۷) میں لکھا ہے کہ جب اُس کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے معاویہ کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ یہ خط میں اُس وقت لکھ رہا ہوں کہ جب میں موت اور حیات کے درمیان ہوں۔ میں نے کوفہ کا حاکم عبداللہ بن خالد بن اسید کو اور بصرہ کا سمرہ بن جندب فزاری کو بنا دیا ہے والسلام۔" بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کسی ایک جگہ کا حاکم اپنے بیٹے عبیداللہ کو کیوں نہیں بناتے؟ وہ ان دونوں آدمیوں میں سے کسی سے کم نہیں ہے۔ زیاد نے کہا کہ اگر اُس میں کچھ بہتری ہوگی تو اُس کے چچا امیر معاویہ خود ہی خیال کرینگے اس کے بعد زیاد کا انتقال ہو گیا عبیداللہ بن زیاد نے نماز جنازہ پڑھی اور وہ مقابر قریش میں دفن ہوا آٹھ مہینے تک عبیداللہ بن خالد بن اسید اور سمرہ بن جندب کوفہ اور بصرہ کے حاکم رہے۔

عـ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

پھر معاویہ نے عبیداللہ بن زیاد کو بصرہ کا اور نعمان بن بشیر انصاری کو کوفہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ جب سے نعمان کوفہ کے حاکم ہوئے تب سے اُس ظلم و جور اور خونریزی میں کمی ہوئی لیکن عبیداللہ بن زیاد اپنے باپ ہی کے طریقے پر حکومت کرتا تھا اور نہایت سختی سے رعایا کے ساتھ پیش آتا تھا۔

عے "زیاد کا اسسٹنٹ سمرہ بن جندب کو بنایا گیا تھا ان کے ہاتھوں بصرہ اور کوفہ میں آٹھ ہزار مسلمانوں کا خون بہا۔ ابو سوادہ کا بیان ہے کہ سمرہ بن جندب نے ایک دن میں میری قوم کے ۴۷ آدمی ایسے قتل کیے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے (طبری ج ۶ ص ۱۳۲۔ کامل ج ۳ ص ۲۳۳)

چوتھی شرط یہ تھی کہ حضرت علی کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

حجر بن عدی اور اُن کے پانچ ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں مگر اُن کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ محب اہلبیت تھے اس لیے اُن کے واسطے نہ حلم میں گنجائش تھی۔ نہ رحم و کرم اُن پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔

یہ حجر بن عدی کون تھے؟ استیعاب میں ہے کہ یہ صحابۂ کرام کے ممتاز افراد میں محسوب تھے۔ ان کے بارے میں زیاد نے امیر شام کو شکایت کا خط بھیجا حکم دیا گیا کہ انھیں شام کی طرف روانہ کر دو۔ یہ بارہ آدمی تھے جو لوہے میں جکڑ کر شام کی طرف بھیجدیے گئے۔ معاویہ نے چھ آدمیوں کو قتل کیا اور چھ آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ حجر بن عدی اُن میں سے تھے کہ جو قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہردلعزیزی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب زیاد کی مخبری کی اطلاع حضرت ام المومنین عائشہ کو پہونچی تو آپ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ امیر شام کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر و اصحابہ یعنی حجر اور اُن کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن اُس وقت پہونچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے عبدالرحمٰن نے معاویہ سے کہا آپ کے پاس سے کہاں چلا گیا تھا ابو سفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اُس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے اُن کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور وبائوں کا

عے ناموس اسلام

سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔ امیر شام نے طنز یہ طور پر جواب دیا کہ تمھارا ایسا کوئی مشورہ دینے والا موجود نہ تھا عبدالرحمن نے کہا اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہو گا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابل تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے "

حضرت عائشہ کو اس حادثہ کی اطلاع پہونچی تو انھوں نے فرمایا "اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرا کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جاسکتے تھے۔ لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعروں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جاسکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں اب ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو ان سے کوئی فائدہ ہے اور نہ اُن سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو ہوتی ہے۔ چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں "

جب معاویہ مدینۂ رسول میں آئے اور حضرت عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ام المومنین نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا اچھا پھر چھوڑ دیجیے مجھے اور حجر کو۔ خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ آپ بازار میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو آپ بیچین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

حضرت حسن بصری کے متعلق مذکور ہے کہ ان کے سامنے حجر کے قتل کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے کہا وائے ہو اُس پر جس نے حجر اور اُن کے اصحاب کو قتل کیا "

ایک بزرگ تھے ربیع بن زیاد حارثی جو معاویہ کی طرف سے خراسان کے حاکم تھے۔ انھیں جب حجر بن عدی کے قتل ہونے کی خبر پہونچی تو انھوں نے کہا۔ خداوندا اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح کو قبض فرمالے۔ ابھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے تھے کہ ان کی روح نے جسم سے جدائی اختیار کی۔

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ جب حجر بن عدی کو سزائے موت سُنائی گئی تو اُنھوں نے کہا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اجازت ملی۔ اُنھوں نے دو رکعت نماز اختصار کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد کہا کہ اگر تم کو یہ خیال پیدا نہ ہوتا کہ میں قتل کے خوف سے نماز میں طول دے رہا ہوں تو میں نماز اتنی جلدی ختم نہ کرتا۔ محمد بن سیرین سے سوال کیا جاتا تھا کہ مقتول کو اپنی موت سے پہلے نماز پڑھنا چاہیئے یا نہیں تو وہ جواب دیتے تھے کہ خبیب اور حجر دونوں نے اپنے قتل کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی تھی اور یہ دونوں فاضل شخص تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ اُن کا فعل ہمارے لیے سند ہے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد یحییٰ بن سلیمان سے دریافت کیا کہ کیا حجر بن عدی مستجاب الدعوۃ تھے تو اُنھوں نے کہا ہاں اور افاضل اصحاب رسول میں سے تھے۔

خود امیر معاویہ کو بعد میں حجر کے بیگناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک روز عبد اللہ بن یزید اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے دیکھا کہ آپ بہت مضطرب ہیں اُس نے (خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت ہے!! اگر مر گئے تو جنت میں پہونچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے پناہ رہے۔ امیر معاویہ نے کہا "خدا رحمت نازل کرے تمھارے والد پر وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے (اصابہ ج ۳ ص ۱۵۶) طبری نے لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات قریب پہونچا تو اُنھوں نے تین مرتبہ کہا یوم لی من ابن الادبر طویل (یعنی) حجر بن عدی کے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہے (طبری ج ۶ ص ۱۵۶) حزن و شقت کی دنیا طولانی ہوتی ہے جس طرح راحت و مسرت کی مختصر، لہٰذا مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا ہے۔

عمرو بن الحمق الخزاعی ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبر نے سلام کہلوایا تھا اور اس لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور آخر میں ان کا سر تن سے جدا کیا گیا اور تاریخ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سر جو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بلند کیا گیا وہ ان کا سر تھا۔

ان واقعات سے شیعیان علی میں تلاطم برپا ہو گیا اور حضرت امام حسین پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۲۲۶) میں لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور اُن کے اصحاب قتل

ہو گئے تو اہل کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشراف اہل کوفہ میں سے حضرت امام حسین کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا انا للہ و انا الیہ راجعون اور یہ واقعہ آپ کو بہت شاق ہوا مگر آپ جلدباز انسان نہیں تھے۔ آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آیندہ حالات کا بےچینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ حضرت امام حسین کے پاس شکایت لیکر گئے ہیں اور آپ نے بھی ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے تو انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں، اس بنا پر انھوں نے آپ کے نام ایک تہدیدی خط لکھا اس کے جواب میں اب حضرت امام حسین خاموش نہ رہ سکتے تھے آپ نے ایک ایک کرکے امیر شام کی جو خلاف ورزیاں معاہدہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا اور اس پر سخت احتجاج فرمایا اس خط و کتابت کو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ معاویہ امام حسن اور امام حسین یا کسی کو بھی خاندان رسول میں سے کوئی نقصان پہونچانے کی کوشش نہ کرینگے نہ خفیہ طور پر، نہ علانیہ اور کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہ کیا جائے گا۔ اس شرط کی خلاف ورزی کا اظہار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے ثبوت بہم پہونچانا بہت دشوار ہے۔ بہر حال یہ تو تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امام حسن زہر سے شہید کیے گئے اور یہ بات بھی سب مورخین لکھ دیتے ہیں کہ یہ زہر دمشق سے بھیجا گیا تھا۔ اختلاف بس اتنا ہے کہ یہ یزید نے بطور خود روانہ کیا تھا یا امیر معاویہ کے ایما سے تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی وفات کی خبر پر شام کے قصر میں تکبیر کی صدا بلند ہوئی اور اظہار مسرت کیا گیا ابن خلکان لکھتے ہیں کہ جب امام حسن بیمار ہوئے تو مروان نے معاویہ کو اس کی اطلاع دی۔ انھوں نے لکھا کہ روزانہ کی ان کی بیماری کی کیفیت سے مجھے اطلاع دیتے رہو۔ جب آپ کی وفات ہوگئی اور معاویہ کو خبر پہونچی تو قصر خضرا سے ان کی تکبیر کی صدا بلند ہوئی اور اس پر تمام اہل شام نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا جب امیر معاویہ محل میں گئے تو فاختہ بنت قرظیہ نے کہا خدا حضور کو خوش رکھے۔ یہ کس لیے آج تکبیر کہی تھی۔ انھوں نے کہا حسن نے انتقال کیا۔ فاختہ نے کہا افسوس فاطمہ کا بیٹا دنیا سے اٹھے اور آپ تکبیر کہیں! امیر معاویہ نے کہا میں نے کچھ طعن و تشنیع یا کسی کی دل آزاری کے لیے تکبیر نہیں کہی بلکہ میرے دل کو

ایک بڑے خطرہ سے اطمینان حاصل ہوا۔ اس لیے میں نے تکبیر کہی (حیٰوۃ الحیوان ج ۱ صلہ)

اتفاق سے ابن عباس اس زمانہ میں شام میں تھے۔ امیر معاویہ نے انھیں بلوا بھیجا اور اس سانحہ کی اطلاع دی اور کچھ طعن وتشنیع کے الفاظ کہے ابن عباس نے کہا اُن کی وفات کے طعنے نہ دیجیے۔ آپ بھی اب کچھ زیادہ دنیا میں رہنے والے نہیں ہیں (الاخبار الطوال ص۲۲۴) ع۱ "تیسیر الباری میں ہے کہ خبر وفات امام سُن کر معاویہ نے سجدہ کیا اور اظہار مسرت کر کے یہ بھی کہا کہ حسن ایک انگارہ تھے جس کو خدا نے بجھا دیا۔" دراسات اللبیب میں اس کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ ع۲ "مقدام بن معدی کرب جو رسول کے اصحاب میں سے تھے اور عمرو بن ابی سفیان دونوں امیر معاویہ کے پاس موجود تھے کہ معاویہ نے مقدام سے کہا آپ کو معلوم ہوا کہ حسن بن علی کی وفات ہوگئی؟ مقدام نے افسوس کے ساتھ کہا انا للہ وانا الیہ راجعون معاویہ نے کہا مقدام! کیا تم حسن کی وفات کو مصیبت خیال کرتے ہو؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں! حسن وہ ہیں جس کو رسول اللہ اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حسن مجھ سے ہے اور حسین علی سے ہے یہ سُن کر معاویہ نے کہا حسن کا وجود ایک آگ کی چنگاری تھا جس کو خدا نے بجھا دیا۔"

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ خبریں صدیوں کی مسافت طے کرتی ہوئی ہم تک پہونچ گئیں تو کیا مدینہ میں حضرت امام حسین تک نہ پہونچتی ہونگی۔ آپ کے دل پر ان خبروں سے جو کچھ گزری ہوگی اُس کا اندازہ ہر حساس دل کر سکتا ہے مگر وہ با اصول، متحمّل اور ضبط و برداشت کے خوگر انسان تھے جنھیں اس پر بھی کوئی جوش نہ پیدا ہوا اور اُن کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیجان پیدا بھی ہوا۔ اس کا تذکرہ شیخ مفید اپنی کتاب ارشاد (مطبوعہ ایران ص۲۲۰) میں ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ جب حضرت امام حسن کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسین کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت کو توڑ کر آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ جو ہو چکا ہے اُس کا توڑنا میری طرف سے صحیح نہیں ہے جب تک کہ پورا موقع گزر نہ جائے۔ بے شک جب معاویہ کا انتقال ہوگا تو پھر میں اس معاملہ میں دوبارہ غور کروں گا۔

ع۱ مولانا علی نقی شاہ صاحب نظامی (حیدر آباد دکن) ع۲ ناموس اسلام

دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۲۲۲) میں لکھا ہے کہ اہل کوفہ کو امام حسن کی وفات کی اطلاع ہوئی تو بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے امام حسین کو خط تعزیت لکھا اور جعدہ بن ہبیرہ مخزومی نے جو بڑے ہی اہلبیت کے مخلص اور دوست تھے آپ کو لکھا کہ یہاں کے شیعہ سر اٹھائے ہوئے آپ کی طرف نگراں ہیں اور آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے آپ نے تحریر فرمایا کہ تم لوگ سب زمین سے چپاں ہو جاؤ اور گھروں میں چھپ کر بیٹھے رہو اور حکومت کی بدگمانی سے بچتے رہو جب تک کہ معاویہ قید حیات میں ہیں اس کے بعد اگر میں زندہ ہوا تو پھر تمھیں اپنی رائے سے اطلاع دوں گا۔ والسلام

دیکھ رہے ہیں آپ اس انسان کی رائے کی پختگی کو؟! جو بات دس برس پہلے آپ نے امام حسن کی صلح کے وقت فرمائی تھی وہی اس وقت امام حسن کی وفات کے بعد کہہ رہے ہیں اور وہی اب اس وقت سے دس برس کے بعد جب امیر معاویہ کی وفات ہوگی تو آپ کے طرز عمل سے ظاہر ہوگی۔ اس کے بعد بھی کیا کہا جاسکے گا کہ آپ کا طرز عمل جو آئندہ ہونے والا ہے وہ ہنگامی حالات یا کسی وقتی جوش کا نتیجہ ہے جبکہ بیس برس پہلے سے آپ اس کا پتہ دے رہے ہیں اور درمیان میں بھی اسی رائے پر سختی کے ساتھ قائم معلوم ہوتے ہیں اور آپ کے بعد کا طرز عمل اس کے مطابق ہے — ہرگز نہیں، صاف ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل اسباب علل کی رفتار کے صحیح اندازہ کا نتیجہ اور حکمت و تدبر اور انتہائی غور و خوض کا قطعی تقاضا تھا۔ آپ برابر امیر معاویہ کی وفات کا حوالہ صرف اس شرط کے انجام کی تکمیل کے لیے دیتے تھے جس میں یہ تھا کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد دوسرے شخص کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اسی شرط کی خلاف ورزی پر معاہدہ کی ہمیشہ کے لیے موت ہوتی ہے اور اسی کے بعد اصولاً حضرت امام حسین معاہدہ کی پابندی سے آزاد اور صورت حال میں انقلاب پیدا کرنے کے حقدار تھے۔

یہ چیز کہ خوف و دہشت نہ پیدا کی جائے گی۔ حضرت امام حسین کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ حکومت کی بدگمانی سے ڈرتے رہو۔ معلوم ہوتا ہے جاسوسوں اور مخبروں کی سرگرمیاں اور حکومت کی ان خبروں کے مطابق تشدد کی پالیسی کس شدت و قوت کے ساتھ جاری تھی اس کا اندازہ امیر معاویہ کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے امام حسین کو لکھا ہے

اور جس کا جواب آپ نے بڑی بے نظیر اخلاقی جرأت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ نیز اس سے کہ اُس زمانہ میں راویان احادیث روایت تک حضرت علی بن ابیطالب سے نہ کر سکتے تھے چنانچہ حضرت حسن بصری سے دریافت کیا گیا کہ آپ اکثر احادیث رسول اللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں حالانکہ اُس زمانہ میں آپ کا سن اتنا نہ تھا کہ آپ خود حضرت کی زبانی احادیث کی سماعت کرتے۔ حسن بصری نے سائل سے جس کا نام یونس بن عبید تھا کہا کہ تم نے مجھ سے وہ بات پوچھی ہے جو آج تک کسی نے دریافت نہ کی تھی اور اگر تمھیں مجھ سے اتنی خصوصیت حاصل نہ ہوتی تو میں تمھیں اس کا جواب دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسے زمانہ میں ہوں جب تم دیکھ رہے ہو جو حدیث تم مجھ سے سنو کہ میں کہتا ہوں۔ رسول اللہ نے فرمایا، وہ اصل میں میں نے حضرت علی بن ابیطالب سے سُنی ہے مگر میں ایسے زمانہ میں ہوں کہ علی کا نام لینا میرے لیے ممکن نہیں (لمعات فریدہ فی المسائل المفیدہ۔ سید ابراہیم راوی رفاعی مطبوعہ بغداد ص۸۳)

اس فضا اور ماحول اور کیفیت سے ظاہر ہے کہ حکومت وقت کا رویہ کیا تھا اور وہ معاہدہ کے شرائط کی کہاں تک پابندی کر رہی تھی۔

حضرت امام حسین ان حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے اور ان سے شدت کے ساتھ متاثر تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا مگر وقت کا انتظار تھا ان باتوں کا ظہور آپ کے اُسی خط سے ہوتا ہے جو امیر معاویہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط درج ذیل ہے:-

"آپ کا خط ملا جس میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی آپ کو امید نہ تھی۔ آپ کو جو خبریں پہونچی ہیں وہ آپ کے خوشامدی لوگوں اور چغلخوروں کی پہونچائی ہوئی ہیں جو افترا و بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت آپ سے مخاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور خاموش ہوں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو اور یہ میری خاموشی آپ کے لیے اور آپ کے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ صاحب کیا آپ ہی نہیں ہیں وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا آپ ہی وہ نہیں ہیں جس نے ایسے نماز گزاروں اور پرہیز گاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے اور دین کے

معاملہ میں کسی شخص کی ملامت اور سرزنش کی پرواہ نہ کرتے تھے حالانکہ آپ اُن کے ساتھ بڑی سخت قسمیں کھا کر پختہ عہدے کر چکے تھے اور اُنھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ آپ کی مخالفت کی تھی مگر آپ نے اُن کو قتل کیے بغیر چھوڑا۔ کیا آپ ہی وہ شخص نہیں ہیں کہ جس نے عمرو بن الحمق الخزاعی صحابی رسول کو قتل کیا جو ایسے صالح اور عبادت گزار بندہ تھا کہ کثرت عبادت سے اُس کا جسم گھل گیا تھا - بدن ڈھل گیا تھا، قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی چھا گئی تھی - آپ نے پہلے ان کو امان دیدی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جاتا تو وہ بھی پہاڑ کی چوٹی سے اُتر کر پاس آجائے - پھر آپ نے کمال جرأت سے اس عہد خدا کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا اُس کو مار ڈالا - کیا آپ ہی وہ شخص نہیں ہیں جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے ایک غلام عبید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابو سفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اُس کا سمجھا جائیگا جو عورت کا اصلی شوہر ہو اور زناکار کیلئے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں، مگر آپ نے اپنی مصلحت کی بنا پر حکم رسول کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پیر قطع کرے اور اُن کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے اور درخت کی شاخوں میں لٹکا کر مار دے - کیا آپ ہی وہ نہیں ہیں جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضرمیین علی کے دین پر ہیں - آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ علی کے دین پر ہیں اُن میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو - اُس نے سب کو مار ڈالا اور مُثلہ بھی کیا - اور یہ جو آپ نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا - اپنے دین کا، اور اُمت محمدی کا خیال کروں اور اُن کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت کی تفریق سے پرہیز کروں تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس اُمت میں آپ کی خلافت حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور اُمت محمدی کیلئے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں اِن امور میں آپ کی مزاحمت کروں، اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربت الٰہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کروں اور خاموش رہوں تو اس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اُس سے طلب رشد و صلاحیت کا طالب ہوں گا - "

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کیلئے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے - لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اُس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم سمجھی جا سکتی تھی مگر آخر میں وہ وقت آگیا کہ امیر معاویہ نے اپنے بعد اپنے فرزند یزید کو امت مسلمہ کی قسمت کا واحد مالک بنا دیا یعنی اُس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا اور حضرت امام حسینؑ سے بھی یزید کی بیعت طلب کی گئی یہ تھا وہ موقع کہ اب امام حسینؑ کو اپنی مدتوں پہلے سے سوچی سمجھی مہم کیلئے قدم آگے بڑھا دینا تھا جسے آپ اپنا اہم ترین فرض سمجھتے تھے آپ نے قدم آگے بڑھا دیا اور اس طرح اس کی تکمیل کی جو ہمیشہ کیلئے یادگار رہے - ان واقعات کی تفصیل کیلئے آئندہ ابواب کا مطالعہ فرمائیے -

---

پہلا باب

(یزید کی ولیعہدی)

امیر معاویہ کے لیے اُن کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں اُنھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے اور دنیا کی جاہ و حشمت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اُٹھا چکے تھے جس کا اعتراف اُنھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور فرمایا "خدا کی رحمت ہو حضرت ابوبکر پر، اُنھوں نے نہ دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے اُن کی طرف رُخ کیا اور حضرت عمر، اُن کی طرف دنیا آئی مگر وہ دنیا کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور حضرت عثمان، اُنھوں نے دنیا میں سے کچھ حصّہ لیا۔ اور دنیا نے اُن سے کچھ حصّہ حاصل کیا لیکن ہم! ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اُس میں رہے۔ (طبری ج ۶ ص ۱۸۶)

مگر انسانی خواہش خود اُس کے مفاد پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی اولاد بھی اُن فوائد سے اُسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ امیر معاویہ بھی اس عام تقاضائے نفس سے مستثنیٰ نہ تھے اگرچہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا مگر وہ اس امر کے لیے بہت فکرمند تھے کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد اس اقتدار کا مالک بنا سکیں جو خود اُنھیں اپنی زندگی میں حاصل ہے۔ پھر بھی وہ یزید کے افعال و عادات کی وجہ سے اس خیال کو زبان تک لانے میں بڑا پس و پیش کرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہے۔

دل کی بات زبان پر نہ بھی آئے تب بھی آثار و علامات سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ امیر معاویہ کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ امیر معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے مگر اُنھیں بھی اسکے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔

سب سے پہلے جس نے اس تعطل اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والی کوفہ تھے۔ یہ شخص بڑا ہی مدبر تھا اور عرب کے انتہائی چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ کسی بات پر امیر معاویہ مغیرہ سے ناراض ہوئے جس کی بنا پر مغیرہ کو کوفہ کی حکومت سے دستبردار ہونا پڑا۔ مغیرہ نے دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ وہ یزید کے پاس گئے اور اُسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے پدر بزرگوار سے اپنی ولی عہدی کا اعلان کیوں نہیں کراتے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں بے چین نہیں تھا اور اگر اُسے شباب و کباب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اُس کی دیوانہ طبیعت کے لیے "ہوئے بس بات" سے کم نہ تھا۔ وہ پہونچا امیر معاویہ کے پاس اور ایک لاڈ پیار سے پلے ہوئے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے مصر ہو کر اپنی ولی عہدی کے لیے خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات جو اس بارے میں تھے بیان کئے۔ امیر معاویہ کو تو کبھی اسکی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لئے یزید کا نام پیش کریگا اُنھوں نے جو مغیرہ کی یہ گفتگو سُنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا اُنھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اُن سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ تبلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیاد اس کام کو پورا کر دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کرے معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سُنا اور اُنھیں کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہونچے اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اُنھیں اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے امیر معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکہ جمانا تھا اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے جو خاص بنی امیہ کے ہواخواہ تھے اُن کو بلا کر اپنے اس مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ حضرت خلیفۃ المسلمین اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفہ کے لوگ اس ولی عہدی کو تسلیم کر سکیں گے اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد اُن کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولیعہد قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں

شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی جیب خاص یا خزانۂ سرکاری سے ۳۰ ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اور اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں امیر معاویہ کے پاس روانہ کیا۔ وفد نے جیسا سبق اُسے پڑھایا گیا تھا۔ اُسی کے مطابق امیر معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ امیر معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے اُنھوں نے وفد کو مناسب جواب دے کر علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تمھارے باپ نے ان لوگوں کے دین وایمان کو خریدا ہے؟ موسیٰ نے کہا تیس ہزار درہم کو (ملاحظہ ہو تاریخ کامل ابن اثیر جزری)

امیر معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ انھیں جمہور کی نفرت وبیزاری کا خوف دامنگیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب اُنھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس بارے میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ بہت عرصہ سے ہوگا۔ اب اس خط سے اس خواہش کا اظہار بھی ہو گیا اور یہ ظاہر ہے کہ اب ایک وفادار گورنر کا کیا فرض ہونا چاہیئے خصوصاً جبکہ معاملہ اُس کے "بھتیجے" کا ہو۔ مگر معاملہ کی نزاکت اور اُس کے تمام پہلو زیاد کو لرزہ بر اندام بنا رہے تھے چنانچہ اُس نے اپنے خاص محرم راز عبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا کہ "حضرت خلیفۃ المسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ اُنھوں نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے مگر انھیں لوگوں کی نفرت و بیزاری کا خوف ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح جمہور مسلمین متفق کئے جا سکیں اور اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے۔ اور یزید ایک آوارہ اور مطلق العنان شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم میری طرف سے سرکار کے پاس جا کر یزید کے افعال و حالات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کام کو کیجئے۔ تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے بہتر ہے کہ جلد بازی سے کام لیا جائے۔ جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔ (طبری ج ۶ ص ۱۶۹)

ع۵ "زیاد کی اس صاف اور بے دھڑک رائے کی وجہ سے جو یزید کے متعلق

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

امیر معاویہ کے توقعات کے خلاف تھی امیر معاویہ کو گونہ مایوسی ہوئی اور انھوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنی اسکیم کو ایک زیادہ سازگار موقع تک کے لیے ملتوی کردیں اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے غالباً زیاد کی صاف گوئی کا حوالہ دیتے ہوے یزید کو حکم دیا کہ وہ اپنی بری عادتوں کو چھوڑ دے تاکہ کوئی شخص برے چال چلن کی وجہ سے اُس کی ولی عہدی کی مخالفت نہ کرے ''

عله ''ابن مغازلی اور ابن الانباری نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے یزید کو شراب پینے سے روکا اور خفیہ طور پر کہا کہ کم از کم وہ دن کو ایسا نہ کرے تاکہ لوگوں کی نظر میں بالکل حقیر نہ ہو جائے (روض الجنان مولانا اشرف علی مطبوعہ ۱۲۷۷ھ) ''

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کینہ یزید کے دل میں زیاد کی طرف سے پیدا ہو گیا بلکہ شاید یہی کی رقابت کی وجہ سے اُس کا خیال یہ ہوا کہ زیاد نے یہ مخالفت اپنے بیٹے عبید اللہ کے اشارہ سے کی ہے اس لیے وہ عبید اللہ بن زیاد سے بھی بدظن تھا اگر بعد میں قتل حسین کی ایسی مہم کا در پیش ہونا اُسے عبید اللہ کے ملانے پر مجبور نہ کرتا۔

ادھر مغیرہ کا انتقال ہو گیا اور ادھر بصرہ میں زیاد کی وفات ہوئی اور اب شاید اس اندیشہ میں کہ رہے سہے اعلیٰ دماغ والے خاص خاص خیر خواہ بھی کہیں راہی ملک عدم نہ ہو جائیں تو اس بڑی مہم کا سرانجام پانا مشکل ہو جائے گا۔ اب امیر معاویہ نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنی تجویز کو پھیلانا شروع کر دیا۔ کوئی شک نہیں کہ مغیرہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کر چکے تھے اور کم از کم ہوا خواہان بنی امیہ کو انھوں نے اسکے لیے تیار کر لیا تھا۔ بصرہ میں بہر حال عبید اللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اُس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہو اور وہاں کی خلقت اس کے باپ سے اور خود اُس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا مگر عله '' وہاں کم از کم دو مخالف موجود تھے۔ ایک سعید بن عثمان اور دوسرے عبد الرحمن بن خالد بن ولید ان دونوں کا وجود معاویہ کے لیے باعث تشویش و تفکر تھا '' سعید تو مقتول خلیفہ حضرت عثمان کی یادگار تھے جن کے دردناک واقعہ قتل سے متاثر بنا کر اور

عله ناموس اسلام عله سید امتیاز حسین صاحب

اُن کے ساتھ ہمدردیاں پیدا کر کے امیر شام نے اپنی سیاست کے قصر کو بلند کیا تھا اور اہل شام کو حضرت علی کے مقابلہ میں صف آرا کیا تھا۔ آج اگر ذرا بھی اہل شام کو اشارہ مل جاتا کہ سعید بن عثمان خلافت کے طالب ہیں تو سب کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہو جاتیں اور امیر شام اکیلے رہ جاتے اور عبدالرحمٰن وہ فاتح شام خالد بن ولید کے چشم و چراغ تھے مفتوحہ ممالک سب ہی میں خالد بحیثیت فاتح کے ہر دل پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہوتے ہوئے مشکل تھا کہ اہل شام دوسرے کی جانب متوجہ ہوتے۔ امیر شام ان دونوں کی موجودگی میں اگر اپنے بیٹے کو خود نامزد کر دیتے تو شام کے جاہل مسلمان بھی سب یہ کہنے لگتے کہ دیکھیے اپنے بیٹے کی خاطر ایسے قابل اور لائق آدمیوں کو نظر انداز کر دیا۔

امیر معاویہ مدینہ کے لوگوں کی مخالفت یا موافقت پر غور کر ہی نہیں سکتے تھے جب تک کہ شام میں اُن کے لیے راستہ بالکل صاف نہ ہو جاتا اس لیے عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید اور سعید بن عثمان کا سوال اُن کے لیے وقت کا سب سے بڑا سوال بن گیا۔ ع۱ "ان دونوں کا وجود معاویہ کے لیے باعث تشویش و فکر تھا مگر عبدالرحمٰن کو اُنھوں نے یوں ختم کرایا کہ ایک دفعہ وہ بیمار پڑے معاویہ نے ابن اثال عیسائی طبیب سے مل کر جس کے زیر علاج عبدالرحمٰن تھے دوا میں زہر ملوا دیا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کے دعاوی خلافت ہمیشہ کے واسطے خاک میں دفن ہو گئے" ع۲ "اس خدمت کے صلے میں علاقہ حمص کا خراج انعام میں بخشا جاتا ہے (کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۲۲۹)

سعید بن عثمان بڑے عقلمند تھے، اُنھوں نے معاملہ کر لیا۔ یزید کی اطاعت کے قبول کرنے پر خراسان کے گورنر بنا دیے گئے۔ تفصیل کے لیے ع۲ "دیکھو کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ دینوری جلد اول صفحہ ۱۳۰) اس میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے بیٹے سعید جو قریش میں بڑے ہی چلتا پرزہ اور زبان آور آدمی تھے معاویہ کے پاس آئے اور کہا اے امیر المومنین آپ نے کس بنا پر یزید کے لیے بیعت لی اور مجھکو چھوڑ دیا۔ قسم ہے خدا کی آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اُس کے باپ سے بہتر ہیں اور میری ماں اُس کی ماں سے اچھی ہیں اور میں خود اُس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے ہی باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سُنکر امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ اے بھتیجے

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ع۲ ناموس اسلام

تمھارا یہ کہنا کہ تمھارے باپ یزید کے باپ سے بہتر ہیں، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان کی عمر کا ایک دن بھی معاویہ سے بہتر ہے اور تمھارا یہ بیان کہ تمھاری ماں اُس کی ماں سے بہتر اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قرشیہ کی بزرگی کلبیہ پر ظاہر ہے مگر تمھارا یہ کہنا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے تمھارے باپ کا صدقہ ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھ لو کہ یہ تو ایک بادشاہت ہے جس کو اللہ چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ تمھارے باپ قتل ہو گئے تو بنی عاص نے اس حکومت کو آپس میں کھانا چاہا اس وقت اولاد ابو سفیان کھڑی ہو گئی۔ اس بارے میں ہمیں تم پر فضیلت حاصل ہے لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے میرا گھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔ خیر اسے جانے دو تم کو جو کچھ مانگنا ہو مانگو۔ میں تمھیں دے دوں گا۔ سعید نے کہا یہ سمجھ لیجیے کہ جب تک میں یزید کا حامی و مددگار رہوں گا تو یزید کے لیے میرا ایسا خیر خواہ حاصل رہے گا اور یہ بھی یاد رکھیے کہ میں تھوڑا سا لے کر راضی ہونے والا نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے خلافت کے لیے پسند نہیں کرتے تو اتنا ہی سہی کہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اُس میں کچھ تو حصہ میرا بھی رکھیے۔ امیر معاویہ نے کہا اچھا خراسان تم لے لو سعید نے کہا اس کا کیا مطلب ہے کہ میں خراسان لے لوں۔ معاویہ نے کہا یہ تمھارے لیے بطور وظیفہ و صلہ رحم ہے۔ یہ سُنکر وہ معاویہ کی تعریف کے شعر پڑھتے ہوئے باہر چلے گئے اور راضی ہو گئے۔ جب معاویہ نے یہ شعر سُنے اور اُن کی رضامندی دیکھی تو یزید کو حکم دیا کہ اُن کے سفر کے لیے زاد راہ کا انتظام کرو اور اُن کو خلعت دیا گیا اور تین میل تک اُن کی مشایعت کی گئی اور رخصت کیا گیا۔"

شام اور عراق کو ہموار کرنے کے بعد معاویہ نے مکہ اور مدینہ کا خیال کیا ع۵" علامہ مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ مروان مدینہ کے حاکم اور گورنر تھے امیر معاویہ نے اُن کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہدی کی بیعت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بیعت کرو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے جب امیر معاویہ کا حکم پڑھا تو غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر میں گئے۔ گھر والوں اور اپنے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج و غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق

ع۵ ناموس اسلام

امیر معاویہ سے خود بات چیت کرنے کو روانہ ہو گئے۔ وہاں پہونچ کر امیر معاویہ سے ملے اس انداز سے چلتے تھے جس طرح دو برابر کے ہم پلہ عزیز رشتہ دار ہوتے ہیں۔ امیر معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوکروں کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آئیے یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں، ایسے لوگ جو آپ کے مشوروں میں اور آپ کے کاموں میں آپ کے وزیر و مددگار ہیں۔ امیر معاویہ نے کہا مروان خفا نہ ہو، تم بیشک امیر المومنین کی نظیر ہو اور ہر مشکل میں اُس کے پشت پناہ اور مددگار رہو۔ اس لیے یزید کے بعد تم کو ہی یزید کا ولی عہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیال خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوئے۔ مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی کے متعلق ذکر کیا اور کہا امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کا اُسی طرح حکم دیا ہے جس طرح حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کے لیے بیعت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبد الرحمٰن بن ابی بکر بگڑ گئے اور کہا ابو بکر نے اپنے بیٹے کی بیعت نہیں لی یہ تو کسریٰ و قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی وزانی کی بیعت نہ کرینگے۔ عبد الرحمٰن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسین، عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اُس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ ع۵ در پردہ اُن کا منشا یہی تھا کہ ان متبرک شہروں میں جن سربرآوردہ مسلمانوں نے ابھی تک اُن کی کوششوں کا مقابلہ کیا تھا اُن کو ہموار کر لیا جائے۔ اُن کا مشن قطعاً ناکامیاب بھی نہ ہوا۔ اس لیے کہ بہت سے لوگوں کو یزید کی جانشینی تسلیم کرنے کے لیے خوشامد اور دھمکی سے تیار کر لیا گیا لیکن اب بھی چند ایسے نفوس رہ گئے تھے جو کسی صورت سے تیار نہ کئے جا سکے۔ امیر معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو دنیائے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطۂ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا ورثہ پہونچتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے ملاحظہ کیجیے:۔

عبد الرحمٰن ——— ابن ابی بکر

ع۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

عائشہ ——— بنت ابی بکر
عبداللہ ——— ابن عمر
حسین ——— ابن علی
عبداللہ ——— ابن عباس
عبداللہ ——— ابن زبیر

ان ناموں ہی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولی عہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی ولی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی نمایندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا اپنا ثبات قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب حضرات کا متفق ہونا خود ایک بڑی مذہبی حقیقت ہے۔

امیر شام نے ان لوگوں کو خوف دلا کر بھی دبانا چاہا اور لالچ دلا کر بھی مائل کرنا چاہا چنانچہ سب سے پہلے عہ "جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو حسین بن علی سے ملاقات ہوئی حسین کو دیکھ کر امیر معاویہ نے کہا نہ تمھارے لیے خوشی ہو اور نہ مبارکی۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسین نے فرمایا چپ رہو ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں معاویہ نے کہا اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو اُن سے بھی یہی کہا کہ تو ایک چھپے ہوئے مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہے جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دم ہلاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اُس کی دم پکڑ لی جائیگی دور کرو اس کو اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر ملے۔ اُن کو کہا کہ یہ بڈھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے پھر حکم دیا کہ ان کی سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارو اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا (کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۵۴)

عہ ناموس اسلام

اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافت یزید کے لیے ان بزرگان دین کو ڈرانے دھمکانے قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔ تاریخ روضۃ الصفا کے الفاظ یہ ہیں " اگر امام حسین و عبداللہ بن زبیر و عبدالرحمٰن بن ابی بکر و عبداللہ بن عمر را توفیق رفیق گردد و با یزید بیعت کنند فبہا و الا با ایشاں بحکم آنچہ باید کرد و ازیں نوع کلمات بسیار گفت و تہدید بے اندازہ بر زبان آورد"

حضرت عائشہ نے جو یہ سُنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش اُن کی آگ میں جلائی۔ آج مدینہ میں آ کر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہونچاتے ہو اور اُن کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو۔ اور فرزند رسول اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم اُن لوگوں میں سے ہو جنھیں رسول نے رحم کھا کر فتح مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں"

طبری نے امیر معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے حسب ذیل ہے:-
امیر معاویہ نے کہا اے عبدالرحمٰن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی جراُت کرتے ہو۔ عبدالرحمٰن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ امیر معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمھارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کہا اگر تم ایسا کرو گے تو لعنت خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہو گے (طبری ص ۱۷۷)

یہ تو خوف دلانے کی ترکیبیں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختیار کی گئی چنانچہ استیعاب میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے حالات میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے بیعت یزید کے لیے ایک لاکھ روپیہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے پاس بھیجا مگر اُنھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور فرمایا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ ایسا ہی عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے مگر اُنھوں نے بھی یہی فرمایا کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ امام حسین کو بھی بہت کچھ تحفہ تحائف اور زر و مال پیش کیا گیا تھا مگر حسین نے قبول نہیں فرمایا اور واپس کر دیا۔ اس کا تذکرہ طبری نے اپنی تاریخ میں پھر

ابن صباغ مالکی نے فصول مہمہ میں اور مولانا محمد مبین فرنگی محلی نے وسیلۃ النجاۃ میں بھی کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے اس مخالفت میں بڑا نمایاں حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبر رسول پر بیٹھے یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ حضرت عائشہ نے اپنے حجرہ سے پکار کر فرمایا کہ خاموش ہو جاؤ کیا کر رہے ہو کیا تم سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ امیر معاویہ نے کہا کہ نہیں، تو ام المومنین عائشہ نے فرمایا کہ پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟ معاویہ یہ سن کر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اتر آئے ۔"

یہ بات بالکل پر اسرار ہے کہ اسی کے بعد حضرت عائشہ کی وفات ہو گئی ۔ کہنے والوں نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے اور ذمہ داری اس کی امیر معاویہ پر عائد کی ہے جس کو حکیم سنائی نے بھی اپنی مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ میں نظم کیا ہے۔ مگر تاریخی قلم کے لیے اس بارے میں کچھ لکھنا ذمہ داری کے خلاف ہے۔

ع۵ "عام مسلمانوں کے لبوں پر مہر خاموشی لگی ہوئی تھی اور جیسی پُر زور مخالفت کی اُمید تھی وہ ان سے عمل میں نہ آئی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو معاویہ نے اس پر زور پروپیگنڈے کے لیے خزانوں کے مُنھ کھول دیے تھے اور اپنے ہواخواہوں کو امید سے زیادہ انعام و اکرام اور جاہ و منصب دے رہے تھے۔ دنیا طلبوں کو حصول مقصد کے لیے اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ وہ ایمان کو بالائے طاق رکھکر معاویہ کی موافقت کے گیت گانے لگے۔ اب رہا وہ گروہ جو دل سے اس تجویز کا مخالف تھا اور معاویہ کے اس عمل کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان کی زباں بندی کے لیے سیاسی تازیانوں سے کام لیا گیا بہت سے بے گناہ ہلاک کیے گئے۔ کچھ زہر سے۔ کچھ تلوار سے، بہت سے قید ہوئے۔ بہت سے ذلیل و رسوا کر کے جلا وطن کر دیے گئے۔ زبردست حکمران کے مقابل میں جب ان بے چاروں کی پیش نہ گئی تو مجبوراً خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔"

مگر یہ صورت حال اس امر کو مشکوک نہیں بنا سکتی کہ یزید کی ولی عہدی اصول شریعت اور آئین اسلام کے خلاف تھی۔ مسلمانوں میں خلافت کے بارے میں تین نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خداوند تعالیٰ کی جانب سے ہے اور نص یعنی پیغمبر کی نامزدگی پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس لحاظ

ع۵ مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی

سے یزید کے لیے کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خلافت کے لیے جمہوری اصول پر انتخاب ہونا چاہیے۔ مگر یزید کے لیے یہ صورت نہ تھی۔ یہاں تو شاہانِ خود مختار کی طرح وراثت کے اصول پر عمل ہو رہا تھا۔ اور باپ اپنے بیٹے کو صرف بیٹا ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے سر پر مسلط کر رہا تھا۔ اس کو جمہوریت کے اصول سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ خلیفہ وہ ہو سکتا ہے جو تلوار لے کر کھڑا ہو اور بزور بازو اپنا تسلط قائم کرے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں بھی ولیعہدی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہ اُس صورت میں ہے کہ جب ہم اس ولی عہدی کے واقعہ کو خود اُسی کی انفرادی حیثیت میں دیکھیں لیکن جب ہم اس کے ساتھ حضرت امام حسن کی صلح اور اُس کے شرائط کو پیش نظر رکھ لیتے ہیں تو پھر تو اس ولیعہدی میں جواز کا کوئی شائبہ باقی ہی نہیں رہتا۔ حضرت امام حسن کے ساتھ شرائطِ صلح نامہ میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بجائے کیا ہوگا؟ اس میں تھوڑا سا اختلاف سہی۔ بعض کہتے ہیں یہ شرط ہوئی تھی کہ اس کے بعد خلافت اہلبیت کی طرف راجع ہوگی اور بعض کہتے ہیں یہ شرط ہوئی تھی کہ اس کے بعد عام انتخاب ہوگا اور مسلمان مل کر جس کو منتخب کر لیں گے وہ خلیفہ قرار پائے گا۔ اس اختلاف سے بہرحال یہ امر تو متفقہ ہی رہتا ہے کہ چاہے جو کچھ بعد میں ہو مگر امیر معاویہ کا اپنے بیٹے کو خود نامزد کرنا تو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ اُس صورت میں ہے کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی ہوتا چہ جائیکہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی مسلمان کے بھی لائق شان نہیں ہیں چہ جائیکہ خلافت کے لیے جو بہرحال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب فرماتے ہیں

"اسلام کے شروع سے حاکم اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا رہا تھا۔ مذہب اور ریاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔ اسی لیے

جتنے سمجھدار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو نازیبا سمجھ رہے تھے اور اُسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

عـ۱ " یہاں صرف حسن بصری کا قول درج کیا جاتا ہی جو تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲ صـ۴۵ اور ابو الفدا ج ا صـ۱۹۶ میں درج ہی۔ وہ کہتے تھے کہ معاویہ میں چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہی۔ اوّل اُنھوں نے بزورِ شمشیر خلافت کو حاصل کیا درانحالیکہ اُس وقت اصحاب رسول جو اُن سے افضل تھے باقی تھے۔ دوسرے اپنے بعد اپنے بیٹے کو جو شرابخوار نشہ باز تھا اور خلاف شریعت محمدی ریشم پہنتا اور طنبور بجایا کرتا تھا مسلمانوں کا خلیفہ بنایا تیسرے زیاد کو اپنا بھائی ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا ہی کہ بیٹا اُسی کا ہو سکتا ہی جو اصلی شوہر ہو اور زناکار کے لیے پتھر ہیں۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا" دوسرا قول اُن کا یہ بھی تھا عـ۲ "کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار دو شخص ہیں۔ ایک تو عمر بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کی رائے دی تھی چنانچہ وہ بلند بھی کیے گئے اور دوسرے مغیرہ جس نے کہ معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر مغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب و مشورہ کا اصول قائم رہتا۔ معاویہ کے بعد جو تخت نشین ہوئے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال سے اپنے بیٹوں کی بیعت کراتے رہے" ڈاکٹر وحید مرزا صاحب "ٹریجڈی آف کربلا" میں لکھتے ہیں "یزید کی مطلق العنانی اور مذہبی تعلیمات سے کھلی ہوئی بے اعتنائی اُس کے باپ کو خوب معلوم تھی اُسی طرح جس طرح اُن کے درباریوں کو معلوم تھی۔ اسی سبب سے جب امیر معاویہ نے اُس کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کرنے کا خیال کیا تو بہت سے اُن کے خاندان کے ہواخواہوں نے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن معاویہ اپنی ضد پر برقرار رہے اُنھوں نے ایک بدکار شخص کو بحیثیت اپنے ولیعہد اور خلیفہ کے تسلیم کرانے پر مسلمانوں کو مجبور کرنے اور اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کے مرتکب ہونے اور تمام سچے مسلمانوں کی نفرت و دشمنی کے مستوجب ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ باوجود احتجاجات و اعتراضات کے اور باوجود اُس صلحنامہ کی شرطوں سے نمایاں مخالفت کے جو حسن اور معاویہ کے درمیان طے پایا تھا جس کی رو سے

عـ۱ ناموس اسلام عـ۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

خلافت کو معاویہ کے بعد علی کے خاندان کی طرف عود کرنا چاہیے تھا یزید کو اُنھوں نے رسماً اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس لالچ اور باپ کی اپنے بیٹے کے ساتھ اندھی محبت نے وحدت اسلامیہ کو بہت بڑا دھچکا پہونچایا اور ایک ایسا گھاؤ ڈالا جو کبھی اچھا نہیں ہوا"

مُسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمائندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج نظر آرہے ہیں۔

امیر معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے زیادہ نمایاں ہستی حسین کی ہے اور اس بنا پر اُنھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ حسین بن علی کو بلوا کر کہا کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہموار ہو چکے ہیں سوائے پانچ آدمیوں کے قریش میں سے جن کی سرکردگی تم کر رہے ہو۔ حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا "میں اُن کی سرکردگی کرتا ہوں؟" امیر معاویہ نے کہا "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں" یہ سُن کر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر اُن سے بیعت کا مطالبہ کیجیے۔ اگر ان سب نے بیعت کر لی تو تنہا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں امیر معاویہ کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ آخر ؏۵ "حجاز کی قسمت کا فیصلہ اپنی آیندہ نسلوں پر چھوڑ کر معاویہ شام واپس آئے چونکہ نہ حیلہ و تدبر سے حصول قوت کے قائل تھے اس لیے اُنھوں نے اس بات پر غور بھی نہ کیا کہ حسین کا یزید کی بیعت نہ کرنا ایک ایسے اہم تاریخی واقعہ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا جو اولاد ابوسفیان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے گا" اگرچہ امیر معاویہ کی حیات میں کسی ایک نے بھی اُن اشخاص میں سے بیعت کی ہامی نہیں بھری مگر حسین میں اور دوسرے بیعت نہ کرنے والوں میں ایک بنیادی فرق موجود تھا وہ جسے ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ٹریجڈی آف کربلا میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "امیر معاویہ نے اپنے ولیعہد کی فرمانبرداری کا مطالبہ اپنے قلمرو کے تمام خاص خاص اشخاص سے جاری کر دیا اور ان سب نے بخوشی یا دوسری طرح اپنے بادشاہ کی برتر خواہش کے سامنے سر جھکا دیے۔ سوائے تین آدمیوں کے حسین، ابن زبیر، ابن عباس لیکن جبکہ موخر الذکر دونوں آدمیوں کے متعلق یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ معاویہ کا کم و بیش شخصی اغراض کی بنا پر مقابلہ کر رہے ہیں

؏۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ۔

حسین کا امتناعی قیام معاویہ کی بدعت کے خلاف بہت ہی شریف تر مقاصد کے باعث تھا۔ ابن زبیر اور ابن عباس حجاز میں خود مختار حکمران بننے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اس توقع میں کہ معاویہ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں۔ اُن شورش کے دنوں میں تخت سلطنت کے حصول کی پیش بندی کر رہے تھے لیکن حسین کا معاملہ اس سے مختلف تھا وہ اس وقت خاندان رسول کے بزرگ مرتبہ سردار اور تسلیم شدہ سچے مذہب کے مجاہد تھے۔ رسول کے مقدس مشن کی حفاظت اور عزت کا لحاظ کون اُتنا رکھ سکتا تھا جتنا کہ خود اُن کا نواسا؟ وہ اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے اور اس لیے اُنھوں نے ایک لمحہ بھی اپنے فرض سے جی نہیں چرایا۔ اُنھوں نے صاف صاف یزید کی جانشینی کی تجویز پر منظوری دینے سے انکار کر دیا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس انکار کے نتائج خود اُن کے لیے کیا ہوں گے؟" یہ سلطنت کے اقتدار کو بڑی سخت ٹھوکر تھی جسے امیر معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسین بن علی کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سلبی حدود تک محدود رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت و شورش کا الزام عائد کیا جا سکے۔ دوسری طرف ع۔۵ معاویہ خود چونکہ ایک تجربہ کار اور مدبر سیاست داں تھے، اس لیے اُنھوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ معاملہ میں ہاتھ ڈالا تھا اور حسین کو ہموار کرنے میں دو چار دفعہ ناکامیاب ہونے کے بعد اُنھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ حسین کو اُن کی رائے کے خلاف مجبور نہ کیا جائے۔ حسین کے نسب، کردار اور تربیت سے واقفیت کی وجہ سے معاویہ بخوبی جانتے تھے کہ اُن کے لیے جان دے دینا ایک فاسق و فاجر کی بیعت سے آسان ہوگا اور ایسی صورت میں اُن کو قتل کر کے اسی منزل پر تمام اسکیم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ معاویہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر حسین سے مداخلت نہ کی جائے تو وقتی طور پر اُن سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُن کی وہی تربیت، کردار اور نسبی شرافت

ع۔۵ سید خورشید حسین صاحب نقوی (کانپور)

جو اُن کو یزید کی بیعت کرنے سے مانع ہوئی، وہی اُن کو حکومت کے خلاف سازش و بغاوت کرنے سے بھی مانع رہے گی اور اس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لیے وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی کو ممدوح نہ سمجھیں گے جیسا کہ اُن کے باپ حضرت علی نے مدت العمر دنیاوی اعزاز کو نظر حقارت سے دیکھا اور اپنے ذاتی حق کے سلب ہونے پر کبھی اعلان جنگ نہیں کیا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ محمد، علی، حسن اور حسین کسی نے ذاتی اغراض کی بنا پر کبھی شمشیر کشی نہیں کی" پھر بھی امیر معاویہ تدبیروں سے غافل نہ تھے اور نہ حسین مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسین چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسین جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں جو بغاوت کی ذمہ داری اُن پر عائد کر دے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کربلا کی جنگ شروع یہیں سے ہوگئی مگر یہ اس وقت ایک صبر آزما نفسیاتی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر امیر معاویہ کا رشتۂ عمر قطع نہ ہوتا اور نو عمر ناتجربہ کار، غرور سلطنت سے بدمست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

(دوسرا باب)

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ اور آپ کا قطعی انکار

دنیا عالم اسباب ہے۔ موت اور بیماری کے لیے بھی ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔

عـ۵ "مدینہ سے روانہ ہو کر معاویہ شام جا رہے تھے کہ راستے میں اُنھوں نے ایک کنویں سے پانی پیا۔ کہا جاتا ہے کہ پانی کی سمیت نے اُنھیں علیل کر دیا۔ شام تک اُن کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔"

اس وقت اُن کی عمر ۷۵ برس کی تھی۔ دمشق پہونچنے کے بعد اسی مرض کا سلسلہ قائم رہا اور وہی اُن کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔

اُنھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اُس وقت جبکہ صحت سے مایوسی ہو گئی تھی شدید احساس تھا کہ اُنھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت صرف کی ہے اور کس قدر اپنے راحت و آرام اور روپیہ کی قربانی کی ہے اور سب سے بڑی قربانی ضمیر کی قربانی جو روحانی تکلیف کی باعث ہوتی ہے جس کا اظہار اُنھوں نے بصیغۂ راز مروان سے کیا۔ ملاحظہ ہو علامہ ابن حجر مکی کی کتاب "تطہیر الجنان واللسان" جو اُنھوں نے امیر معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ رونے لگے۔ مروان نے کہا کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا کیا سبب ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اُٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست

عـ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کو حاصل کر لینا (حاشیۂ صواعق محرقہ مطبوعۂ مصر ص۵۶)

علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے اُن کو ہدایت کے رستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرطِ محبت نے مسلمانوں کو اُن کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جس نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا (حاشیہ صواعق محرقہ ص۵۸)

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار کیا ہو اور کد و کاوش کی ہو اُتنی ہی اُسے اپنے اُس مقصد کی کامیابی کی فکر زیادہ ہوتی ہے اور اُس میں کسی خلل کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ امیر معاویہ نے یزید کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں اُن کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا تھا، اس کا تذکرہ اُنھوں نے خود یزید سے کیا اپنے مرض الموت کی ابتدا میں جبکہ اُنھوں نے اُسے بُلا کر کہا:۔ بیٹا میں نے تجھ کو کوچ اور مقام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تیرے لیے تمام سامان مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تیرے لیے خم کرا دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تیرے لیے جھکا دیا اور سب کو تیرے اوپر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمھارے لیے مکمل ہو چکا ہے بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے حسین بن علی اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر (طبری ج ۶ ص۱۷۹)

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا امیر معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اُتنا اُتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا اُن کی موت کا وقت زیادہ قریب آتا جاتا تھا۔

افسوس ہے کہ وہ یزید جس کے لیے اُنھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا اور دمشق کے باہر مقام "حوارین" پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا امیر معاویہ نے اپنی حالت دگرگوں پا کر اُس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اُس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو اُنھوں نے اپنے پولیس افسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید آئے تو میری وصیت اُس تک پہنچا دینا اور اُسے بتلانا کہ میرا حکم اُس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے، جو لوگ

وہاں سے دارالسلطنت میں آئیں اُن کا اکرام و احترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دور ہیں اُن کی بھی وقتاً فوقتاً خبر گیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دست و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ اُن میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ بتلا دیا کہ مجھے اُس کے خلاف صرف چار آدمیوں سے خوف ہے ایک حسین بن علی دوسرے عبد اللہ بن عمر تیسرے عبد الرحمن بن ابی بکر اور چوتھے عبد اللہ بن زبیر (الاخبار الطوال ۲۲۷)

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ امیر معاویہ بستر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ اُن کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا۔ نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور۔ نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ اُنھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پتھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو چار جو یزید کے لیے اُن کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر حسینؑ کی تھی۔

رجب ۶۰ھ میں امیر معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ اٹھتیس برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے اور ۷۸ برس کی عمر میں اب اُن کی وفات ہوئی (کتاب البلدان ابن فقیہ مطبوعہ لیدن ص ۱۰۹)

یزید کو اُس کی شکار گاہ میں اس واقعہ کی اطلاع دی گئی جس کو سُنکر وہ دمشق پہونچا ایسے وقت جب امیر معاویہ دفن بھی ہو چکے تھے باپ کی بچھائی ہوئی مسند اُس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اُس کی بیعت کر لی۔

اب ضرورت ہے کہ ہم آپ کے سامنے یزید کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک کی زندگی کا ایک خاکہ اور اُس کے اوصاف و سیرت کا ایک خلاصہ پیش کر دیں تاکہ آپ کو مسلمانوں کی قسمتوں کے اس تازہ مالک اور حکومت اسلامی کے جہاز کے اس نئے ناخدا سے تعارف ہو جائے اور آپ مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں۔

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ٹریجڈی آف کربلا میں تحریر فرماتے ہیں:۔

یزید کی ماں میسون تھی۔ ایک صحرائی عورت جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی اور

اپنی آزادی اور خانہ بدوشی والے گھر کی سادگی کی مشتاق تھی۔ فطری طور پر اُس نے اپنے لڑکے کو کمسنی ہی میں اپنی ہم قوموں کے پاس بھیجدیا کہ بدو عربوں کے درمیان کُھلے ہوئے علاقہ میں اُس کی تربیت کی جائے۔ یزید بڑھا خانہ بدوشی کے نمایاں علامات رکھتا ہوا اور ایک نمونہ ہو کر کافر عربی حکومت کا۔ اُس کے اوصاف یہ تھے کہ وہ خوش دل اور ہشاش بشاش رہتا تھا اور شکار کی تفریحوں اور جام شراب کا دلدادہ، متکبر اور مدمغ شخص تھا۔ وہ برائے نام مسلمان تھا۔ اور اُن ضروری اوصاف سے خالی تھا جن کے موجود ہونے کی اسلامی حکومت کے دنیوی اور روحانی سردار میں امید کی جاسکتی ہے۔"

علامہ دمیری نے اس سلسلہ میں ایک عجیب قصہ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میسون بنت بحدل کلبیہ جو یزید کی ماں تھی اپنے حسن و جمال کی بدولت امیر معاویہ کی بہت منظور نظر ہوگئی تھی اور اُنھوں نے اُس کے لیے غوطہ کے مقابل میں ایک قصر کا انتظام کیا تھا جہاں سے اس پر نزہت جگہ کی سیر دور تک ہوسکتی تھی اور اُس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن اور دیبائے رومی کے رنگا رنگ اور منقش فرش فروش مہیا کیے تھے اور بہت سی حسین و جمیل کنیزیں خدمت کے لیے دی تھیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اتارا گیا مگر یہ سب کچھ اُس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا اس لیے کہ اُسے تو اپنا جنگل اور اُس میں چرتی ہوئی بھیڑ بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن کا اتفاق کہ امیر معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون نے ایک بہترین پوشاک پہنی اور قیمتی زیورات زیب جسم کیے اور خوشبوئیں لگائیں اور اس طرح بن ٹھن کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اُس کھڑکی کے سامنے بیٹھی جو کہ غوطہ کے مرغزاروں کی طرف تھی۔ اُس کو وہاں کے درخت نظر آئے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آئی۔ اُس وقت اُسے اپنا نجد کا بادیہ یاد آیا اور اپنی ہمجولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں جس سے وہ بے ساختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے کہا کہ نصیب دشمناں آپ کے رونے کا سبب؟ حالانکہ آپ اس تخت سلطنت پر بیٹھی ہوئی ہیں جو سلطنت بلقیس کا جواب ہے۔ میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھنے لگی جن کا مضمون یہ ہے:- "یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں چوبائی ہوا کے جھونکے آتے رہتے تھے مجھے اس عالی شان

محل سے زیادہ محبوب ہی اور وہ بالوں کی عبا جو میرے جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے مجھے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درّہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپیڑے کی صدا مجھے طبلوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتّا جو مہمانوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین ولجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا اور میرے قوم قبیلہ کا ایک دُبلا پتلا حقیر آدمی مجھے ایک سخت بدخو مسٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔"

جب امیر معاویہ آئے تو اُس خواص نے یہ قصّہ امیر معاویہ سے بتایا یا امیر معاویہ نے یہ اشعار پڑھتے خود سُن لیے۔ اُن کو بڑا غصہ آیا اور کہا سب تو سب اس نے مجھکو سخت بدخو مسٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اُس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں سازوسامان ہو سب کچھ لے لے اور چلی جائے چنانچہ اُسے نجد میں اُس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا اس حالت میں کہ یزید اُس کے پیٹ میں تھا چنانچہ یزید کی پیدائش وہیں بادیہ میں ہوئی۔ دو برس کے بعد جب امیر معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے اُس کو وہاں سے بلوالیا (حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷) ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (ص ۲۳۵) میں ان اشعار کا ذکر کیا ہے مگر نظم کرنے والے کا نام درج نہیں کیا۔ ع ۱ "بدو عربوں سے یزید نے وہ تمام خصوصیات و عادات حاصل کئے جو کہ ایام جاہلیت کے عربوں سے مخصوص تھے۔ وہ شکار اور شطرنج کا شوقین تھا، خوبصورت عورتوں کا دلدادہ تھا اور شراب جائز رکھتا تھا خود شاعر تھا اور ایسے شاعروں کو دوست رکھتا تھا جو اُسی کی طرح مذہب اور اخلاق سے بیگانہ ہوں۔ اُس کے لیے مذہب کا نام صرف زبان خلق سے بچنے کا ایک وسیلہ تھا اور ایک نقاب تھا جو اُس کے گناہوں کو پوشیدہ رکھے۔" وہ اپنے عیش و عشرت میں کسی اصول مذہب کو مخل نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے لیے دنیا سب کچھ تھی اور دین کچھ نہ تھا۔ یزید کا یہ طریقہ صرف اُسی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ ایک بڑی جماعت کا نمائندہ تھا جو ہر طرح سے اسلام کی بیخکنی کے لیے تیار تھی یعنی اُن ہی منافقین اور مخالفین اسلام کا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اُس کے دورِ حکومت

ع ۱ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب

میں کفر و الحاد، فسق و فجور کے لیے کوئی مانع نہ رہا تھا اور یہ خرابی تمام حکومت اسلامی میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔" عا "یزید کے حاشیہ نشین اور مشیر کار وہی لوگ تھے جو کسی مذہبی و اخلاقی نظام کے قائل نہ تھے۔ وحشی خصائل کو صرف زندہ نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ انہیں اور زیادہ مستحکم اور منظم شکل دی جا رہی تھی۔ حکومت اور اُس کے ارکان سے نیکی و بدی کا شعور مفقود ہو گیا تھا۔ جو فعل اُن کی شہوت کو زیادہ سیراب کرے وہی نیک تھا دوسرے انسانوں کو طفیلیوں کی طرح جینے کی اجازت تھی۔ ہر ممکن تدبیر اختیار کی جا رہی تھی کہ بنی آدم کی قوت تمیز کو مفلوج کر دیا جائے تاکہ حکومت اپنے ناکردنی افعال کی باز پرس سے مطمئن ہو جائے۔ نسلی و ملکی و لسانی امتیازات بنی امیہ کے نقطۂ نظر سے قائم کر لیے گئے تھے۔ سرمایہ داری کا بھوت یزید کے سر پر سوار تھا۔ وہ ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، بیٹی بیوی اور "دلنواز محبوبہ" میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا۔"

ایڈورڈ براؤن نے بھی لٹریری ہسٹری آف پرشیا (ص ۲۲۶) میں یزید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ ایک بدویہ ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ صحرا کی کھلی ہوئی ہوا میں اس نے پرورش پائی شکار کا بڑا ماہر و شیفتہ، ایک بلیغ شاعر اور عاشق جانباز، شراب اور دیگر لہو و لعب کی باتوں کا شیدا اور رقص و سرود کا دلدادہ، مذہب کوسوں دور تھا۔"

اُس کے اخلاق و عادات کا بیان تقریباً تمام مؤرخین نے اسی قسم کے الفاظ میں کیا ہے۔

عا۲ "آہبرن نے لکھا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل ہی یزید نے مومنین کی بڑی تذلیل کی تھی وہ علانیہ شراب پیتا تھا، کتوں سے بےحد شوق رکھتا تھا اور اسی طرح باز اور دوسرے اس طرح کے جانوروں کا بہت شوقین تھا۔" (ص ۱۲۳)

اروِنگ نے لکھا ہے کہ خوبیوں کے اعتبار سے وہ بہت ناقص تھا۔ اُس میں شعریت کا خداداد مادہ موجود تھا۔ شام کے عیش و تنعم میں رہنے کا اثر اُس کے ریشمی لباس اور رقص و سرود کے اشتیاق سے ظاہر تھا لیکن وہ بہت ذلیل تھا اس لیے کہ اس میں پست خیالی، کمینہ پن اور لالچ موجود تھا وہ انتہا سے زیادہ شہوت پرست اور شراب و فسق و فجور کا اُس حد تک عادی تھا جو انسان کو انتہائی ذلت کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔"

عا۱ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری عا۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

جسٹس امیر علی لکھتے ہیں "یزید ظالم اور غدار دونوں تھا۔ اُس کی خبیث طبیعت رحم و انصاف جانتی ہی نہ تھی۔ اُس کی دلچسپیاں ویسی ہی پست تھیں جیسا کہ اُس کے ساتھی پست بداخلاق اور اوباش تھے۔ وہ مذہبی پیشواؤں کی یوں تذلیل کرتا تھا کہ وہ بندر کو پکڑ کر اُسے علماء و فقہاء کا لباس پہنا کر خوبصورت اور سجے ہوئے گدھے پر بٹھا کر جہاں خود جاتا تھا وہاں اُسے لے جاتا (۴۳)"

علامہ دمیری نے بھی لغت "فہد" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے (حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص۱۸۶) دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بندر کو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ میں اُس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا گیا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس بارے میں شعر کہے جن کا مضمون یہ ہے کہ کون میری طرف سے کہدے اس بندر سے کہ جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابوقیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی (حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص۲۰۱)

ابن الفوطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابوقیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اُسے پلایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اُسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے:۔ اے ابوقیس اس کی مہار سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔ اس گدھی نے یہ کارنمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی۔ (اعیان الشیعہ ج ۴ ص۲۹۰)

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شراب خواری اُس کی ضرب المثل تھی چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اُس کا "سکران" یعنی بدمست رکھ لیا تھا (الاخبار الطوال ص۲۶۱)

وہ کسی موقع پر مصلحتہً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا چنانچہ حرب ولیعہدی کے دور میں امیر معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے حج کو گیا تو مدینۂ رسول میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جمگھٹے میں شراب کا دور ضرور چلا (کامل ج ۴ ص۲۳)

واقدی نے عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا (صواعق محرقہ ص۱۳۵ مطبوعہ مصر)

اس کی جرأت و جسارت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اس بارے میں حرمت رسول تک کا پاس نہ کرتا تھا چنانچہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ یزید نے حضرت عائشہ کے حسن و جمال کو سن کر آپ کے بارے میں ہوس کی۔ لوگوں نے جب منع کیا تو وہ باز رہا (مدارج النبوۃ ۱۴۵)

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص ہو بلکہ اس کے خیالات بھی ایسے تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اس کے دیوان کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔ جن میں اس نے احکام شریعت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں غیر واقعی بھی نظم ہو جاتی ہیں اور ان کے بیانات اکثر تخئیلی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراوش کرتے ہیں جیسا انسان کا مذاق طبیعت ہے۔ ایک دیندار، متقی اور پرہیز گار شخص سے ممکن نہیں کہ وہ اشعار میں خدا یا رسول یا ائمہ دین کے ساتھ اس طرح کی جسارتیں کرے جو انتہائی حقارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی یہی رکھتا تھا۔ دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو۔ خیام سے پہلے یزید کے ذہن میں تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

اقول لصحب ضمت الکأس شملهم　　وداعی صبابات الهوی یترنّم

خذوا بنصیب من نعیم ولذّة　　فکلّ وان طال المدی یتصرّم

"ان ساتھیوں سے جنھیں ساغر شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق و محبت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا یہ قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش و لذت سے بہرہ ور ہو لو

کیونکہ کتنی ہی مدت طولانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہونا ہے"۔ (صواعق محرقہ ص۱۳۲)

ع۱ "نماز اور شرابخواری کا موازنہ کرتے ہوئے اُس نے ایک شعر میں کہا:-

ماقال ربک ویل للاُلٰے شربوا ۔۔۔ بل قال ربک ویل للمصلّین

(یعنی) خدا نے شرابخواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے ویل للشاربین کہیں نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو ویل للمصلّین کہا ہے"، ع۲ ایک جگہ اُس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے:-

فان حرّمت یوماعلیٰ دین احمد ۔۔۔ فخذھا علیٰ دین المسیح ابن مریم

یعنی اگر دین احمد میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دین مسیح پر ہو کر پی لو"

اُس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نغمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے:-

معشر النّدمان قوموا ۔۔۔ واسمعوا صوت الاغانی

واشربوا کأس مدام ۔۔۔ واترکوا ذکر المعانی

شغلتنی نغمۃ العید ۔۔۔ ان من صوت الاذان

وتعوّضت عن الحور ۔۔۔ رعجوزا فی الدّنان

"اے حریفان شراب اُٹھو اور گانوں کی صدا سنو، ساغر شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھکو ستار و سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی پری کو پسند کر لیا ہے"

یوں تو یہ اشعار تفریح طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں حور و قصور کی خبروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے اپنے ان اشعار میں:-

علّیۃ ھاتی واعلنی وترنّمی ۔۔۔ بذلک انی لا احب التناجیا

حدیث ابی سفیان قدما سما بھا ۔۔۔ الیٰ احد حتیٰ اقام البوا کیا

الا ھات سقینی علیٰ ذاک قھوۃ ۔۔۔ تخیّرھا العنسی کرماشامیا"

ع۱ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری ۔۔۔ ع۲ ناموس اسلام

اذا ما نظرنا فی امور قدیمۃ — وجدنا حلالا شربھا متوالیا
وان مت یا ام الاحیمر فانکحی — ولا تاملی بعد الفراق تلاقیا
فان الذی حدثت عن یوم بعثنا — احادیث طسم تجعل القلب ساھیا
ولا بد لی من ان ازور محمدا — بمشمولۃ صفراء تروی عظامیا

"اے نازنین محبوبہ مجھے سُنا اور بلند آواز سے سُنا اور گا کر پڑھ۔ مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سُنا ابوسفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اُس کا کارنامہ جہاں اُس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کردیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے جام شراب پلاتی جا۔ وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگوروں سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی عملدرآمد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا ہمیشہ حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مرجاؤں اے نازنین محبوبہ تو تو کسی اور سے نکاح کرلینا اور یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی ملاقات بھی ہوگی۔ یہ جو دوسری زندگی کے متعلق تو نے قصے سنے ہوں گے یہ پارینہ قصے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہونچ گیا ہو۔"

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اُس کے دل میں جاہلیت کے خیالات اور بدر و احد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفٰےؐ سے ایک ضد اور کد کا خیال موجود تھا۔ ان کے ساتھ آپ کے سامنے وہ اشعار بھی آئیں گے جو اُس نے قتل حسینؑ کے بعد اور اہلبیت کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس کے بعد یہ سیاست دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشین رسول اور امیر المومنین بھی بن کر بیٹھ گیا تھا۔ اور مسلمانوں کی اکثریت اُس کی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے مزاج اخلاقی پر کیا پڑ سکتا ہے سوائے اس کے کہ اُن میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہ حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اور وہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ع۵ "علامہ مسعودی مروج الذہب (ج ۲ ص ۹۴) میں لکھتے ہیں کہ یزید کے اہل دربار اور اُس کے گورنروں پر اُسی فسق و فجور کا غلبہ ہو گیا

ع۵ ناموس اسلام

جس کا یزید ارتکاب کیا کرتا تھا یہاں تک کہ اس دور میں مکّہ اور مدینہ میں بھی گانے کا رواج ہو گیا اور آلاتِ لہو کا استعمال ہونے لگا اور لوگ شراب کھلّم کھلا پینے لگے۔ علامہ بدخشی نے نزل الابرار ص۹ میں بھی یہ عبارت درج کی ہے۔" اسبرن لکھتا ہے کہ دمشق کے لوگ علانیہ سڑکوں پر شراب پیتے تھے اور اس طرح اپنے پیرِ طریقت کا اتباع کرتے تھے وہ بھی یزید کی طرح مغنّی لڑکیوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے اور مطربوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ساز اور باجے کی آواز برابر سڑکوں پر سُنائی دیتی تھی اور کوئی اپنے کان بند نہ کرتا تھا۔"

جسٹس امیر علی نے لکھا ہے کہ شراب نوشی کے مظاہرے عام ہو گئے اور یہ فعلِ زشت لوگ دارالخلافت کی سڑکوں پر بھی علانیہ کرنے لگے۔"

تختِ خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ اُس کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اُس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، حشم و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کے ساتھ مہیا لیکن ایک خیال تھا جو اُس کے دل و دماغ کو پریشان کئے ہوئے اُس کی نظروں میں اس تمام جاہ و حشم کو خاکِ سیاہ بنائے ہوئے تھا اور وہ اُن چند آدمیوں کا بیعت سے انکار کہ جن میں اوّل درجہ کی شخصیت حسین بن علی کی تھی۔ یزید کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک تو جوانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ۔ بے زحمت و مشقت کی حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے بااقتدار باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمنڈ اور تمام ملک عرب کے سر اطاعت خم ہو جانے کا غرّہ۔ پھر نو کاری ناعاقبت اندیشی، سیاسیاتِ حکومت کی ناشناسی اور نظم سلطنت سے بے خبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کو یاد کرنا، اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا ہونا، یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو ہی جانا چاہئے تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کی اور بالخصوص امام حسین کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی امیر معاویہ کو بھی اُتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو، مگر امیر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر امیر معاویہ ہی کی زندگی اور طولانی ہوتی تو اُن کی طرف سے

ایسا غیر مدبرانہ طرزِ عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا کہ یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ چاہے غیر شعوری طور پر ہو لیکن امیر معاویہ کا رویّہ یزید کی آیندہ اقدامات میں ہمت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر امیر معاویہ کا مدینہ میں پہونچنے کے وقت حضرت امام حسین کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ "تم ایک قربانی کا دُنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا"

بہت ممکن ہے بلکہ یقین کر لیجیے کہ یہ ایک سیاسی دھمکی ہی کی حیثیت رکھتا تھا جس کا نتیجہ عالمِ وجود میں آنے والا نہیں تھا مگر اس کے سمجھنے کے لیے تو سیاسی دماغ ہی کی ضرورت ہے۔ یزید تو اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمن سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جیسے اُنھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا پھر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"، خصوصاً جبکہ آخر وقت تک امیر معاویہ اپنے بعد والے کو ان ہی چند دشمنوں کے خطرہ پر متوجہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ یقینی گزشتہ دھمکی سے جو غلط فہمی یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکی تھی اُس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں یہی اثر پیدا کر سکتی ہیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصد زندگی ہی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ ان چند اشخاص کے خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا اُنھیں موقع نہ ملا وہ اب جواں عزم کی طاقت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے۔ کوئی شبہ نہیں کہ؏ یزید میں اپنے باپ کی سی قوت برداشت، رواداری اور سیاست نہ تھی۔ اُس نے یہ چاہا کہ حسین اور دوسرے لوگوں سے جو اپنے انکار پر قائم ہیں بجبر بیعت لی جائے۔ ان تینوں اشخاص یعنی حسین، ابن عباس اور ابن زبیر میں ابن زبیر بیجد حوصلہ مند تھے وہ مکّہ اور مدینہ میں ایک خلافت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے اور ایک موزوں موقع کے منتظر تھے اور بعد میں اُنھوں نے خلافت قائم بھی کی۔ ابن عباس بھی اپنے اغراض رکھتے تھے لیکن مقابلتہً وہ زیادہ دور اندیش اور محتاط تھے حسین ان دونوں شخصوں کے برخلاف ذاتی مفاد کی کوئی تمنّا نہ رکھتے تھے۔ اُن کا یزید کی بیعت نہ کرنا بالکل خالص مذہبی نقطۂ نظر سے تھا

؏ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

اُن کی عمر کافی آچکی تھی اور وہ سکون و گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی طبیعت جو بار پنیر خصائل کی عادی اور انزواپسند ہو چکی تھی دنیاوی شان و شوکت کی خواہاں نہ تھی۔ باپ کے معاملہ میں خلافت کے تجربہ نے اُن کے حوصلوں کو اور بھی سرد کر دیا تھا اور چاہے اسلام کو یزید ایسے حکمرانوں سے بچانے کی اشد ضرورت محسوس کرتے تاہم وہ ملت اسلامی کو کسی خانہ جنگی میں ڈالنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ مذہب کو سدھارنے اور فائدہ پہونچانے کے لیے صرف خاموش تعلیمات اور ذاتی عمل کو اپنا طریقۂ کار سمجھتے تھے لیکن یزید معاملات کو اپنی حالت پر رہنے کب دیتا۔ حسین حجاز میں اپنے مرتبہ اور راثر کی وجہ سے یزید کے لیے گویا ایک نہایت خطرناک مضبوط حریف تھے۔ وہ حسین کے مستقل اور مصرا نکار سے بھنایا ہوا بھی ہوگا، اس لیے اُس نے بیعت کے لیے اور بھی سخت احکام نافذ کئے۔"

اگر وہ اپنے باپ کے آخر وقت موجود ہوتا تو عــ۵ "ممکن ہے کہ مرتے وقت معاویہ اُس سے کہہ جاتے کہ ان چار دشمنوں کے مسئلہ کو کیونکر ہاتھ لگایا جائے۔ مگر اب وقت جا چکا تھا یزید اپنے باپ کے خوف دہراس سے واقعہ کی نزاکت اور عظمت سے واقف ہو گیا تھا لیکن حسین کو نہ مجبور کرنے والی حکمت عملی پر عمل نہ کر سکا اور نہ اسے بہت اہمیت ہی دے سکا۔ یزید کے دماغ میں بس ایک بات گونج رہی تھی اور وہ یہ کہ اب میں ایک پرشکوہ بادشاہ ہوں جس کے تابع ہزاروں ایسے غلام ہیں کہ اگر وہ حکم دے دے اور انعام مقرر کر دے تو حسین تو حسین، خود رسول کو بھی بے بسی کے عالم میں قتل کرنے میں پرہیز نہ کریں۔ حسین کا تو ذکر ہی کیا اس لیے کہ وہ تو عزلت نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے جن کے پیرووں کی تعداد خلافت کے زمانہ میں اُن کے باپ علی کی عظمت کے خلاف بغاوت کرا کے کم ہی کی جا چکی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ معاویہ کے پوشیدہ عمال کے تدبر اور نظام نے علی کے وقار کو کافی صدمہ پہونچایا تھا! یقیناً یہ خطرناک اسکیم تقریباً ایک ربع صدی سے کچھ زیادہ زمانہ تک کامیاب بنائی جا چکی تھی۔ اس طرح یزید نے اپنے کو مطمئن کر کے"۔ تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہوئے سب سے پہلے جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچا زاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مروان کی معزولی کے بعد اس زمانہ

عــ۵ سید خورشید حسین صاحب نقوی

میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کہ "امیرالمومنین یزید کی طرف سے ولید بن عقبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بندے تھے جنھیں اُس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالامال کیا وہ جب تک مقدر میں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہوگئی تو دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خدا اُن پر رحمت نازل کرے کہ اُنھوں نے قابل تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکوکاری کے ساتھ عالم آخرت کو سدھارے۔ والسلام۔

اس خط میں تو صرف امیر معاویہ کے وفات کی اطلاع ہی ایسے رسمی الفاظ میں جو عموماً خبر وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی ع‌‌۵۱ جس کو آج کل کی اصطلاح میں ڈیمی اوفیشیل یا کانفی ڈنشیل حکم کہا جا سکتا ہی ولید کو بھیجا گیا" اُس کا مضمون یہ تھا کہ "حسین اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوے اُنھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو والسلام"

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہی اور معلوم ہوتا ہی کہ اب صورت حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی یعنی حضرت امام حسین کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریک ظلم نہ ہوں اور موجودہ خلیفہ کی خلافت کو تسلیم کر کے افعال و اعمال کی ذمہ داری نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہونچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منفی طرز عمل اب نبھنا ناممکن ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہی۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

تاریخ حبیب السیر میں تو یزید کے خط کا مضمون صاف یہ لکھا ہے کہ حسین بن علی اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سے بیعت لو اور اگر وہ منظور نہ کریں تو اُن کے سر قلم کر کے شام کی طرف روانہ کرو۔" (حبیب السیر مطبوعہ بمبئی حصۂ اول جلد دوم ص ۲۲)

یزید کا خط ولید کو پہونچا۔ ع‌۵۲ "ولید باوجود اس کے کہ اسی خاندان کا ایک فرد تھا لیکن وہ یزید کے اس طرز عمل کو ممدوح نہ سمجھتا تھا وہ حسین کے تقدس اور اخلاقی بلندی کے سبب اُنکی عزت کرتا تھا۔ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ اس کام کو کیونکر شروع کیا جائے اس وجہ سے اُس نے مروان بن حکم

ع‌۵۱ ناموس اسلام   ع‌۵۲ سید خورشید حسین صاحب نقوی

سے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا۔" حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اُس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی پیدا ہوگئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی تھی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے۔ شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرزِ عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اموی سیاست کے خلاف نہ ہو اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلخوری کا کام انجام نہ دے۔ ع۱ "مروان چونکہ خاندان محمدی کا جانی دشمن تھا اس لیے اُس نے صلاح دی کہ تم ابھی ان لوگوں کو بلوا بھیجو اور اُن کو بیعت و اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ابھی اُن کے سر قلم کرا دو۔ اس لیے کہ اگر انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی تو پھر ہر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائیگا۔ اور مدعی خلافت ہوکر ایک بڑی بغاوت برپا کر دے گا۔" ع۲ "اوپر کے واقعات صاف بیان کرتے ہیں کہ یزید کے خط میں خونیں اقدام کا ذکر ضرور موجود تھا۔ ورنہ ولید کی پریشانی اور مروان کا مشورہ بالکل بے محل ہوتا۔ اگر یزید نے ولید کو محض بیعت کے لیے لکھا تھا تو اُس کو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ بس وہ حسین کے قطعی انکار کو یزید کے پاس لکھ بھیجتا۔ اس کے علاوہ مروان خط کے مضمون کے خلاف کاہے کو کوئی دوسری تجویز پیش کرتا۔ ولید کی پریشانی کا سبب محض یہ تھا کہ وہ حسین کے خون سے اپنے ہاتھ کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

بہر حال اُس نے مروان کے مشورہ پر اتنا عمل کیا کہ اُسی وقت عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت حسین بن علی اور عبداللہ بن زبیر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں بزرگوار اُس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہونچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے اور وہ وقت ایسا تھا کہ اُس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا اور لوگوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا سبب کیا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے یہ کیا بات ہے؟

ع۱ سید خورشید حسین صاحب نقوی ع۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی اڈیڈوکیٹ

امام حسین نے فرمایا میرا خیال ہی کہ معاویہ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کیلئے بلایا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم لوگ پابند کرلیے جائیں عبداللہ بن زبیر نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہی۔ پھر اب کیا ہونا چاہیے ؟ امام نے فرمایا میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوانمردوں کو جمع کرتا ہوں اور اُن سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں اُن لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کروں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا مجھے اس صورت میں آپ کی جان کا اندیشہ ہی۔ کہیں آپ قتل نہ کردیے جائیں۔ آپ نے فرمایا میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا، اتنا سامان کروں گا کہ مجھے خطرہ نہ باقی رہے۔

حضرت امام حسین مکان سے تشریف لے گئے اور اپنے اعزا اور مخصوصین کو جمع کرکے اُن کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہونچے۔ اصحاب سے فرمایا کہ تم دروازہ پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمہیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوی تو سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ حضرت اندر تشریف لیگئے۔ ولید اور مروان آج خلاف معمول پاس پاس بیٹھے ہوے تھے اور ایک خاموشی تھی کہ جو چھائی ہوی تھی۔ امام حسین نے اسے دیکھ کر سادگی کے ساتھ فرمایا "اتفاق و اتحاد بہ نسبت نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائے"۔ اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سُنایا۔ غالبًا وہی حصہ جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا اور اس کے بعد بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام حسین نے فرمایا انّا للّٰہ وانا الیہ راجعون (یہ فقرہ ہے جو ہر مصیبت کے موقع پر کہا جاتا ہی) خدا کا رحم و کرم شامل حال ہو اور تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا ہو۔ رہ گیا یہ امر کہ میں بیعت کروں تو ظاہر ہے کہ مجھ ایسے شخص کی بیعت مخفی طور سے تو ہو نہیں سکتی اور نہ غالبًا تم اس کو کافی سمجھو گے جب تک کہ اس کا عام طور سے علانیہ اظہار نہ ہو۔ ولید نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا تو پھر جب تم معاویہ کی وفات کا اعلان کرنا اور تمام لوگوں کو بیعت یزید کی دعوت دینا تو سب کے ساتھ ہم سے بھی یزید کی بیعت کا مطالبہ کرنا تاکہ معاملہ یکساں رہے اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔"

ولید اپنے مقام پر سمجھا ہوا ہوگا کہ امام حسین یزید کی بیعت کا سوال سُنتے ہی فوراً مخالفت پر تیار ہو جائیں گے اور بہت سختی کے ساتھ جواب دینگے اور اس صورت میں اُسے فکر ہوگی کہ مجھے یزید کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ اب اُس نے جو امام سے اس طرح کا دفع الوقتی کا جواب سُنا تو وہ اُسے غنیمت سمجھا اور خوش ہو کر اُس نے کہا کہ بہتر آپ واپس جائیے اور سب کے ساتھ پھر آئیے گا۔ مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورت حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اُس نے ولید کا یہ روادارانہ طرزِ عمل دیکھا تو بے اختیار بول اُٹھا "ولید یہ کیا غضب کرتا ہے۔ اگر حسین اس وقت تیرے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہوں بہتر ہے کہ ابھی ان کو گرفتار کرے اور تیرے گھر سے جانے نہ پائیں جب تک کہ بیعت نہ کریں یا قتل کیے جائیں"

یہ سُن کر امام کو غصہ آگیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا مجال ہے تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے بخدا اور گنہگار ہوا۔" یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیت میں گھر واپس تشریف لائے۔ مروان نے ولید سے کہا "تم نے میرا کہا نہ مانا اب ایسا موقع نہ ملے گا۔" ولید نے کہا مروان یہ کسی اور سے کہو۔ تم نے مجھے وہ صورت بتائی تھی جس میں میرے مذہب کی موت تھی۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں ہو اور میں حسین کو قتل کروں۔ سبحان اللہ میں حسین کو قتل کروں صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں میں بیعت نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسین کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں روزِ قیامت میزانِ عمل میں انتہائی سُبک ثابت ہوگا۔

ع۵ "یہ بات بالکل ظاہر کر دیتی ہے کہ مدینہ کا گورنر بھی جہاں کہ حسین رہتے تھے اُن کی نقل و حرکت میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض چیز نہ پا سکا جسے کہ وہ اُن کے قتل کا بہانہ بنا سکتا۔ اس کے علاوہ جب مروان سے بھی ولید نے حسین کی بے گناہی کا ذکر کیا تو وہ بھی کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور نہ اُنھیں سازش و بغاوت ہی کا ملزم قرار دے سکا بلکہ اُس نے ولید کو یہ جواب دیا کہ جب تمھارے خیالات حسین کی نسبت ایسے ہیں تو مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے

ع۵ سید خورشید حسین صاحب نقوی

کہ تم نے انھیں کیوں جانے دیا ۔ یقیناً مروان ایسا جانی دشمن اتنی آسانی سے خاموش نہ ہوتا اگر حسین کی ظاہری و باطنی زندگی صاف نہ ہوتی ۔"

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بعد ولید مدینہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور عمر بن سعید الاشدق کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا گیا ۔

ع۵ "یہ بھی اس دعوے کی ایک بین دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کے بعد حسین کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا ۔" کوئی شک نہیں کہ حضرت امام حسین اس وقت اگرچہ ولید کے پاس سے صحیح سلامت واپس آگئے لیکن آپ کو صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس ہو گیا اور یقیناً اس وقت آپ نے تمام نتائج پر غور کر لیا اور جو کچھ طے کیا وہ پورے نتائج سوچ لینے کے بعد ۔

حسین نے اُس وقت چاہے زبان سے نہ کہا ہو مگر یہ طے ضرور کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا ۔ ابھی تک دنیا اس نفی کے معنی نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ انکار بیعت کی صورت میں اُن تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسین کے سامنے آئے لیکن حسین جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا ۔ اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوت برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہنچ گیا مگر حسین کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے، اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو اُنھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا ۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پر صاف ہو جانا چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کون سا ایسا ناقابل برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسین کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے ۔ اس کے لیے آپ کو ایک نظر حسین کی اُن ذمہ داریوں پر کر لینا ہو گی جو خاندان رسول کے نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اُن پر عائد تھیں ـــ اور اُن قدیم روایات کو دیکھنا ہو گا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسین کے آباؤ اجداد کی وراثت بنی ہوئی تھیں اور جن کے اس وقت حسین حامل تھے اور پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ اس وقت حسین اپنے فرض

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے ــــ یہ بھی آپ کو دیکھنا ہوگا کہ یزید کو حضرت امام حسین سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کد وکاوش کی ضرورت کیا تھی جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اُس کے مُسلّم ہو جانے کے لیے کافی ہے اقلیت کی رائے ناقابل اعتبار ہے لیکن یہ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور سے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جائے جبکہ اُس کی طرف سے عملی طور پر کوئی شورش انگیزی نہ کی جا رہی ہو خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی ۔ خود حضرت علی بن ابی طالب کے زمانہ خلافت میں سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور کئی آدمی ایسے تھے جنھیں آپ کی بیعت سے کنارہ کشی تھی مگر کبھی صرف بیعت نہ کرنا کوئی قابل سزا جرم نہیں سمجھا گیا ۔ یہ بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امیر معاویہ نے مکہ اور مدینہ میں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کیلئے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکہ اور مدینہ کی مردم شماری میں سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جو گھروں میں بیٹھے ہوں گے اور جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہو گی ۔ کسی کے لیے بیعت کی ضد نہیں کی گئی اور سلطنت کو اُن سے کاوش پیدا نہیں ہوئی ۔ پھر ایک حسین میں کیا بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آ جائے اور شاہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے ۔ ماننا پڑیگا کہ حسین سے بیعت بحیثیت ملک عرب کی ایک فرد کے نہیں طلب کی جا رہی تھی ۔ کوئی شبہ نہیں کہ ایک فرد ایک جماعت یا قوم بن جاتی ہے نمائندگی کے اعتبار سے ۔ حقیقت یہ تھی کہ حسین فقط حسین نہ تھے بلکہ وہ اُس وقت خاندان رسول میں سب سے بزرگ ہونے کے لحاظ سے اُس ورثہ کے حامل تھے جو اسلامی حفاظت کا پیغمبر کے بعد اُن کی اولاد میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو رہا تھا ۔ اور اسی لیے خاندان رسول یا خاندان علی بن ابی طالب میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے، عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے، حضرت عباس بن علی اور اُن کے بھائی بھی تو تھے کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں تبلا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو ۔ صرف اس لیے کہ اُن میں سے کسی کو حسین کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسین کو حاصل تھی ۔

یزید کو حسین سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اگر وہ صرف دنیوی قسم کی ایک سلطنت کا مالک ہوتا مگر وہ جس قسم کی سلطنت کا مالک بن رہا تھا وہ تو خلافت اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول کی جانشینی کی حیثیت رکھتی ہے عــہ "اُس کا یہ نظریہ تھا کہ روحانی و مذہبی پیشوائی پر سیاسی رہبری مقدم ہو یا دوسری لفظوں میں بادشاہوں کو ہمیشہ مذہبی اختیارات ہونا چاہیے اس کا مطلب کھلے الفاظ میں یہ ہے کہ مذہبی قوانین بادشاہ کی خواہشوں کے پابند کر دیے جائیں لیکن اب سوال یہ تھا کہ مذہب کی سچی پیشوائی پر مہر تصدیق کون ثبت کرے ؟ کیا یہ فرض شامی و عراقی، مکی اور مدنی انجام دے سکتے تھے ؟ نہیں۔ ضرورت تھی کہ وہ اُس خاندان کے افراد سے اُس حکومت کو تسلیم کرائے جو مسلمانوں میں رسول کی دینی وراثت کا حامل سمجھا جاتا ہے اور اُس خاندان میں اس وقت سب سے بزرگ حسین کی ذات تھی، یہ فرض محض حسین سے وابستہ تھا اور وہی اس کو مصدق کر سکتے تھے یزید اسے بخوبی جانتا تھا۔ اُس کا مقصد یہ نہ تھا کہ حسین بحیثیت حسین یزید کی اطاعت قبول کر لیں بلکہ حسین بحیثیت مذہبی پیشوا کے اُس کے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے حسین کا بیعت قبول کر لینا اس کا ایک بین ثبوت ہوتا کہ یزید حق پر تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ یزید بادشاہت بیں "خدائی اختیار" کا مالک ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو بس یہی ہوتا کہ خلیفہ کے ایک لفظ، ایک حرکت اور ایک قدم پر مذہب کا انحصار ہو جاتا۔ چاہے وہ اُسے باقی رکھتا یا فنا کر دیتا۔ یہ وقت حسین کے لیے آزمائش کا تھا!!

حسین سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسن زندہ ہوتے تو بیعت کی خواہش اُن سے کی جاتی، مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علی ہوتے تو جھگڑا اُن سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جد بزرگوار رسول اللہ ہوتے تو اپنی حکومت کے جواز کا جو سارٹیفکٹ بھی حاصل کرنا ہوتا وہ اُن سے مانگا جاتا۔ مجھ سے نہ مانگا جاتا مگر اب تو وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا رسول اللہ نہیں ہیں۔ میرے بابا علی مرتضیٰ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسن مجتبیٰ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسن نے ہوتے

عــہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

اور وہ بیعت کر لیتے۔ میرے بابا علی ہوتے اور وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے اور میرے نانا رسول اللہ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ اُنھوں نے اس سخت احساس ذمّہ داری کی بنا پر تمام مشکلات کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

اس مقام پر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسن نے بھی تو یزید کے باپ امیر معاویہ سے مصالحت کر لی تھی، اسی طرح اگر امام حسین صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرزِ عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنت بنی امیّہ کے ہوا خواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلافِ طبیعت اور اختلافِ رائے کی حکایتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات اور اُس کی رفتار کا مطالعہ اس سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور اُن حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ابنائے زمانہ زیادہ تر جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاق انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ اُنھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ ابنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالف اس لیے اُن کا طرزِ عمل اکثر عام افرادِ انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر اُن پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں، کبھی اُن پر اقدام پسند طبائع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں اعتراض کرتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اس لیے کہ وہی اُن کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے یہی صورت ہم کو پیغمبرِ اسلام کے طرزِ عمل میں ملتی ہے۔ یہی علی مرتضیٰ کی سیرت میں اور یہی اُن کے بعد حسن اور حسین کے طرزِ عمل میں۔ عہ چونکہ حضرات سبطین کنارِ رسول کے تربیت یافتہ ہیں اس لیے کہیں ان کی صلح میں صلح حدیبیہ کی سی دور اندیشی پائی جائے گی تو کہیں جنگ میں جنگِ بدر کا سا غازیانہ استقلال اور مجاہدانہ عزم موجود ہو گا۔

تاریخ کے صفحات شہادت دے رہے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام بدر میں بدر اسلام کو غروب ہوتا

عہ الحاج نواب سید محمد عباس صاحب طالب صفوی۔ شمس آباد

دیکھ کر آغاز و انجام سے بے پروا ہو کر اللھمّ ان تھلک ھٰذہٖ العصابۃ لا تعبد فی الارض (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد سوم مترجمہ حکیم احمد حسین مطبوعہ الہ آباد ص۱۸) پڑھتے ہوئے ایک ہزار سواروں کے مقابلہ میں صرف تین سو بارہ پیادوں اور ایک سوار کو لے کر مقابلہ کے لیے آگئے اور کچھ اس طرح داد شجاعت دی کہ بڑے بڑے بہادروں کو کہنا پڑا کہ اس روز نہ آپ سے زیادہ کسی سے شجاعت و جرأت ظاہر ہوئی اور نہ ہم میں سے کوئی آپ سے زیادہ دشمن کے قریب رہا (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ترجمہ مولوی محمد ابراہیم مطبوعہ حیدر آباد دکن ص۱۶۹)

لیکن ایک موقع وہ بھی آتا ہے جب یہ رسول چودہ سو مجاہدین کے ساتھ مکۂ معظمہ کا قصد فرماتے ہیں۔ عکرمہ بن ابو جہل پانچ سو سواروں کی قلیل تعداد کے ساتھ آپ کا مزاحم ہوتا ہے اور پے درپے تین مرتبہ شکست کھاتا ہے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص۳۵۸)

پھر بھی آنحضرتؐ نہ جنگ جاری رکھتے ہیں۔ نہ حج ایسے اہم فریضہ کے لیے جبراً مکۂ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں "اگر وہ پسند کریں تو ہم ایک مدت تک کے لیے ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور وہ دوسروں کے مقابلہ میں مزاحمت سے باز آئیں اور مجھے اوروں سے نپٹ لینے دیں اگر مجھے کامیابی ہو تو پھر ان کا اگر جی چاہے وہ بھی اوروں کی طرح ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں اور اگر نہ چاہیں تو اس اثنا میں اُن کو ذرا پنپنے کا موقع تو مل جائے گا (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص۳۶۲) چنانچہ آپ نے خراش بن امیہ کو ان کے پاس صلح کا پیام دے کر بھیجا لیکن نہ صرف قاصد کا اونٹ ذبح کر دیا گیا۔ بلکہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی تیروں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس پر بھی پیغمبر مشرکین مکہ پر فوج کشی نہیں کرتے اور دنیا کو دکھا دیتے ہیں کہ جارحانہ اقدام کرنا سچے نبی کی شان نہیں ہے۔ آخر کار مشرکین مکہ کے پتھر دل پر بھی اس صلح و آشتی کا اثر ہوتا ہے اور اُن کے نمائندے صلح نامہ لکھنے کے لیے آتے ہیں۔ رسول کے برادر عم زاد (حضرت علی) صلح نامہ کی عبارت تحریر فرماتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق محمد رسول اللہ زیب قرطاس فرماتے ہیں۔ مشرکین کہتے ہیں کہ ہم محمدؐ کو خدا کا رسول مانتے تو مخالفت کیوں کرتے بہتر یہ ہے کہ "محمد رسول اللہ" کے

بجائے "محمد بن عبد اللہ" تحریر کیا جائے۔ رسول اللہ حضرت علی کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ مابہ النزاع لفظ کو محو کر دیں لیکن اُن کو جرأت نہیں کہ وہ اس لفظ کو مٹا دیں جس پر ان کے ایمان کا دارومدار ہے اور بالآخر خود پیغمبر اسلام اس لفظ کو محو فرما کر محمد بن عبد اللہ تحریر فرماتے ہیں (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۳) اس طرح دنیا کو دکھا دیتے ہیں کہ رسالت اور امامت کی بنیاد لوگوں کے اقرار یا انکار پر نہیں ہے۔ (صلح حدیبیہ کے شرائط کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے) ان شرائط میں سے یہ بھی تھا کہ جو شخص کفار سے مسلمانوں میں چلا جائے وہ اپنی قوم کی طرف واپس کر دیا جائے اور جو شخص مسلمانوں کا کفار میں آ جائے تو وہ مسلمانوں کی طرف نہ واپس کیا جائے۔ یہ شرط مسلمانوں کو شاق گزری اور بعضوں نے اس میں بحث بھی کی لیکن رسول اللہ سمجھتے تھے کہ یہ صلح لوگوں کے امن اور ظہور اسلام کی باعث ہوگی۔ (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد سوم ص ۱۵۰-۱۴۹) رسول اللہ اور سہیل بن عمر اس عہد نامہ کے لکھوانے میں مصروف تھے کہ اتنے میں ابو جندل بن سہیل بن عمر بیڑیاں پہنے ہوئے وہاں آ گئے۔ ابو جندل کے مشرک باپ سہیل بن عمر نے بڑھ کر ایک تھپڑ مارا اور گردن پکڑ کر اپنے مسلمان لڑکے کو کشاں کشاں لے چلے۔ ابو جندل نے انتہائی بلند آواز سے چیخنا شروع کیا کہ مجھے میرے ایمان کی وجہ سے اس مصیبت میں ڈالا جا رہا ہے اور خواہ مخواہ مشرکین کے پاس واپس کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر بھی اس فریاد کو سُنکر بیتاب ہو گئے وہ ابو جندل کے پاس جا کر اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور اُن سے کہنے لگے تم صبر کرو۔ یہ قریش مشرک ہیں اور ان کی جان کتے کے برابر ہے اسی کے ساتھ وہ اپنی تلوار کا قبضہ اُن کے نزدیک کرتے رہے خود حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ تلوار لے لیں اور اس سے اپنے باپ کا خاتمہ کر دیں مگر اُنھوں نے اسے گوارا نہیں کیا کہ اپنے باپ کو خود ماریں۔" (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۳-۳۷۲)

مُسلمانوں کے اضطراب کا اندازہ ہو گیا۔ اب دیکھیے کہ صدق مجسّم رسول کا رویّہ کیا تھا؟ رسول اللہ یہی فرماتے رہے کہ چونکہ ہم نے اہل مکّہ سے صلح کر کے معاہدہ کر لیا ہے اس لیے اب ہم اُن کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۲)

ایفائے عہد کی یہی تعلیم تھی جس نے امام حسن ایسے بہادر اور شجاع کو صلح کے بعد اپنے نانا کی طرح صبر کا دامن پکڑے رہنے پر مجبور کر دیا اور باوجودیکہ کوفہ یا قادسیہ کے کچھ لوگوں نے آپ کو مذل الاسلام "اسلام کو ذلت دینے والے" کہکر آپ کو صلح کے توڑنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر امام حسن کا قدم وفائے عہد کے راستے پر مضبوطی سے جما رہا۔

صلح حدیبیہ کا بیان ختم ہوا۔ آخر میں اس کے نتائج کے متعلق راس المحدثین امام زہری کی قابل قدر رائے بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ اپنے مفید نتائج کے اعتبار سے اس سے قبل اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۷۵)

آئیے صلح حدیبیہ کی روشنی میں عقل و نقل کی عینک سے صلح امام حسن کو غور سے دیکھیں۔ (اس ذیل میں واقعات اور اس وقت کی صورت حالات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے) آپ کو جب یہ خبر ملی کہ معاویہ اہل شام کو ہمراہ لے کر اُن پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ اپنے لشکر کے ساتھ تیار ہو کر مقابلہ کے لیے فوراً روانہ ہوئے کہنے کو آپ کے ساتھ چالیس ہزار آدمی تھے مگر حقیقت امر یہ تھی کہ چند کامل الایمان ہستیوں کے علاوہ سب کے سب جنگ سے گریزاں تھے۔ اگر مشرکین فارس و روم سے جنگ ہوتی اور آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیاوی بہبود کی امید اور لونڈی غلاموں کی توقع ہوتی تو ایک کثیر تعداد آتش جدال و قتال میں کود پڑتی لیکن لوگ دیکھ چکے تھے کہ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی نے کلمہ گویوں کو لونڈی غلام نہیں بننے دیا تھا۔ پھر کوفی امیر معاویہ سے بادگر کس امید پر جنگ کرتے؟ اس صورت حال کے ساتھ یہ ہوا کہ امیر معاویہ نے خود صلح کا پیغام بھیجا۔ پھر بھی آخری جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ اور ان پر زور الفاظ میں حق و صداقت کی دعوت دی "آگاہ رہو کہ تم میں دو خونریز لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں بہت لوگ قتل ہو گئے۔ کچھ مقتول صفین میں ہوئے جن کے لیے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ امداد پر تیار نہیں ہیں اور کچھ رو رہے ہیں جو خون کے بدلے کے طالب ہیں۔ اب اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ سے بھروسے پر تلواروں سے محاکمہ کریں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول

کرلیں اور تمھاری خوشنودی حاصل کریں (ترجمہ تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد چہارم ص۴۰۳)
جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ ہم حیات چاہتے ہیں۔ ہم حیات چاہتے
ہیں آپ صلح کر لیجیے (تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم ص۲۰۳)

پیمان صلح مستحکم ہونے کے بعد امام حسن نے پھر ایک تقریر فرمائی اور ارشاد فرمایا: "اے لوگو ہم تمھارے امراء ہیں اور تمھارے مہمان ہیں۔ ہم لوگ تمھارے نبی کے وہ اہلبیت ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے اُن سے ہر آلودگی و نجاست کو دُور فرما کر اُن کو پاک کر دیا ہے۔ امام صاحب نے اس فقرہ کو بار بار دُہرایا حتیٰ کہ مجلس میں کوئی شخص ایسا نہ رہا جو رو نہ رہا ہو اور روتے روتے ہچکی نہ لگ گئی ہو۔" (تاریخ کامل جلد سوم ص۲۰۴)

لیکن ظاہر ہے کہ اعلائے کلمۂ حق کے لیے آہ سرد و اشک گرم کے بجائے خون گرم کی ضرورت تھی اور اپنا خون بہانے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر امام حسن نے امیر معاویہ سے صلح کرنے کے بعد امارت ظاہری سے کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ امید ہے کہ ان واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد ہی صاحب انصاف یہ امر تسلیم کرلے گا کہ امام حسن حق و صداقت کے لیے جنگ کرنے سے گریزاں نہیں تھے۔ مگر چونکہ آپ کے لشکر والوں پر حب دنیا غالب تھی اس لیے آپ کے لیے صرف دو۲ طریقے باقی رہ گئے تھے۔ پہلا۱ طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ آپ قلت انصار کا خیال کئے بغیر بنی ہاشم کی مختصر جماعت کے ساتھ معاویہ سے جدال و قتال فرماتے مگر یہ طریقہ نامناسب تھا۔ چونکہ امیر معاویہ کے ابتدائی عہد تک احکام اسلام کی علانیہ مخالفت نہیں کی جاتی تھی اس لیے آپ کے جدال و قتال کو حفاظت اسلام کے جذبہ کے بجائے طلب ریاست پر محمول کیا جاتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ امیر معاویہ خود پیام صلح روانہ کرچکے تھے اس کے بالکل برعکس یزید کے عہد میں احکام اسلام کی یہ وقعت رہ گئی تھی کہ خلیفۂ وقت علی الاعلان شراب پیتا تھا، محرمات ابدی کی طرف نگاہ ڈالتا تھا اور اس کا جرنل مسلم بن عقبہ لوگوں کو صرف اس جرم پر قتل کردیتا تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول پر کیوں بیعت کرنے کو کہا (تاریخ طبری جلد دوم حصہ اول ص۲۲۳) یعنی ایسی صورت میں حضرت سید الشہداء کی جنگ کو کوئی ذی ہوش بھی طلب جاہ و ثروت پر محمول نہیں کرسکتا تھا۔ دوسرا۲ طریقہ یہی تھا کہ وہ امیر معاویہ کے پیغام صلح کو مسترد

فرمائیں اور جس طرح اُن کے نانا نے مصلحتہً مشرکوں سے صلح کی تھی اسی طرح وہ کلمہ گویوں سے صلح کرلیں اور یہی طریقہ کار امام نے اختیار فرمایا پھر بھی حضرت امام حسین کا یہ کمال تدبر تھا کہ آپ نے لشکر آرائی کے بعد صلح کی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ آپ جنگ سے خائف نہیں تھے۔ نہ کسی قسم کا شک یا ندامت اہل شام پر حملہ کرنے سے مانع تھا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یار و اغیار سب کو معلوم ہو گیا کہ کون برسر حق تھا اور کون برسر ناحق تھا چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے امیر معاویہ کو بادشاہ کے لفظ سے مخاطب کیا ہے اور امیر معاویہ نے امیرالمؤمنین کہنے کی فرمائش کی ہے تو سعد نے صاف صاف الفاظ میں کہا تھا " خدا کی قسم جس طرح آپ نے خلافت حاصل کی میں کبھی اس کو پسند نہ کرتا ——————"

اس کے علاوہ یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام حسنؑ نے اس صلحنامہ کے شرائط کے ذریعہ سے وہ مقصد پورے طور پر حاصل کر لیا تھا جس کے لیے اُن سے اور امیر شام سے جنگ تھی اور جہاں تک آئینی حدود کا تعلق ہے آپ نے اس طرح مکمل فتح حاصل کر لی تھی۔ یقیناً اگر حضرت امام حسن کی جگہ پر امام حسین ہوتے تو آپ کے بھی تدبر کا اقتضا رہی ہوتا جو امام حسن نے اختیار کیا تھا۔

حقیقت امر یہ ہے اور واقعات سے ثابت ہے کہ حسن مجتبیٰ کی صلح ہی مجاہدۂ کربلا کی تمہید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجتہً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور اُن کا طریقہ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر زخم رسیدہ پکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، چاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہے تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہو اور اُس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اُسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہو گا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ

یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کیے جانے پر ممدوح مستحسن سمجھا جا رہا تھا۔

دشوار گذار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب در مؤثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اُسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک مؤثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آگئی تو جلد بازی، غیر موقع شناسی اور نا عاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اُس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اسی کے ساتھ اُس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج واستغاثہ، مصالحت اور معاہدۂ مودت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔ بے شک جب یہ سب ذرائع اختیار کیے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مثل من جرب المجرب حلت بہ الندامتہ اور فارسی مثل "آزمودہ را آزمودن جہل است"، کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکیگا اور اُس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر دوسرے اقدام تک پہونچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغلوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع واسباب سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری وجاں نثاری اور مؤثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال واعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرماں بردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبر کا پابند ہی تو اُسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا۔ اور حق و راستی پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پر امن اور صلح پرور وسائل و ذرائع کے پہلے صرف کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اگر امام حسین ایکایکی بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان وانصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ

آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحاد عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آ کر اپنے تئیں معرض خطر میں کس لئے ڈالا؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب مگر اب یہاں صورت حال یہ تھی کہ امام حسین کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ ۶۰ھ سے لے کر ۶۱ھ تک میں اُس کا وقت آ گیا۔

شروع شروع میں امام حسن کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسین کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا رو باصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسین کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو اُنھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

حسین کے سامنے اب صلح کا کوئی سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ صلح کی منزل کو امام حسن طے کر چکے تھے اور اب شرائط صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسین کے سامنے تھی حالانکہ امیر معاویہ اپنے کردار کے لحاظ سے بہ نسبت یزید کے کہیں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟

پھر امام حسن نے جو صلح کی اُس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسن مسند خلافت پر متمکن تھے، صلح کے ذریعہ سے آپ نے مسند خلافت کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ماتحت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے تمدن اسلامی کے بارے میں اپنے مسلک اور معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدۂ عدم تعرض کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے علیحدہ ہو گیا تھا اور بس۔ اسی لیے حضرت امام حسن کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنت شام امام حسین سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلب بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عدم تعرض تو ان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضا مند نہیں تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ رہے ـــ امیر معاویہ کا معاہدہ وقتی طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا، بغیر اس کے حضرت امام حسن کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں باعتبار خلافت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی اس کے بعد اُن کو خود اور اُن کے بعد یزید کو شدت کے ساتھ اس کا احساس تھا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیر ممالک اور تسخیر قلوب مختلف چیزیں ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتح ممالک کو فاتح قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔

عـ۵ "طاقت حق ہے"، کا اصول محض جسمانی حیثیت سے صحیح ہو سکتا ہے۔ طاقتور کمزور کو فنا کر سکتا ہے، اُسے زنجیر پہنا سکتا ہے قید کر سکتا ہے اور قتل کر سکتا ہے لیکن وہ اُس کے دل و دماغ کی مملکت پر حکومت نہیں کر سکتا۔ جسمانی قوت سے دل و دماغ پر حکومت ناممکن ہے، لوگوں کو خاندان رسالت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ رسول کی طرح اُن کے خاندان والوں کی حکومت بھی عوام کے دل و دماغ پر تھی۔ باوجود اس کے کہ اُن کے پاس فوج نہ تھی، اُن کے محافظ نہ تھے، رہنے کے لیے اُن کے پاس قصر نہ تھے اور نہ کوئی دولت ہی تھی۔ یقیناً اگر کوئی اس بات کے کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اُس نے خدائی طاقت سے حکومت کی تو وہ خاندان رسالت ہی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ وہ بغیر کسی ذریعہ و وسیلہ کے بھی

عـ۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈووکیٹ

قوت کے مالک تھے۔ خاندان رسالت کی طرف سے یہی خوف ایسا تھا جس کا تجربہ امیر معاویہ اور اُن کے خاندان والوں ہی کو نہیں ہوا تھا بلکہ بعد میں خاندان عباس کو بھی اس کا تجربہ ہوا فاطمہ کی معزز اولاد لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی اور اس کے برخلاف سلاطین وقت لوگوں کو جسمانی حیثیت سے غلام بناتے تھے " یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے اہلبیت رسول سلطنت دمشق کی نظر میں بہر حال قابل مزاحمت تھے۔ خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔

اس سے آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام حسین کے لیے اُس طرح کی صلح کا کوئی امکان نہ تھا جیسی صلح امام حسن کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اُس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسین کی ہوتی تب آپ بھی اُس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مسلمانوں میں امن قائم کر دیتے اور حسین کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اُس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسین ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی تھے اُس تمدن اور نظام سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطین دمشق نے قائم کیا تھا — یہ ایسی چیز تھی جو آل محمد کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسین ہوتے یا ان کے بجائے اس وقت امام حسن ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سُنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سُنت پر عمل ہوگا مگر یزید کے دور میں سلطنت کی مطلق العنانی اور خود سری اس درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ بیعت میں کتاب اور سنت کی شرط پیش کرنے پر گردنیں قلم کی جاتی تھیں اور بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں وہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے مدینہ میں یزید بن عبد اللہ بن ربیعہ بن اسود اسی جرم پر قتل کیے گئے کہ وہ کتاب اور سُنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہ تھے (الاخبار الطوال ص ۲۶۱)

ان ہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ آپ کو بعد میں معلوم ہوگا کہ امام حسین کو آپکے اس اقدام کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے مشورے دیے گئے ہیں۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔ یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے یہ کہا گیا کہ کوہ اجا میں چل کر پناہ لیجیے مگر یہ کسی عزیز یا دوست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید

کی بیعت کر لیجیے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یزید کی بیعت امام حسین کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

عــ۵ در یزید نے اپنے عقائد اور خیالات کو اس قدر عریاں کر رکھا تھا کہ حسین خدا کے نزدیک اور رسول کی بارگاہ میں اپنے نفس کے لیے کوئی تاویل یزیدی اعمال کی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے حسین نے خیال کیا کہ پیغمبر نے میری تربیت میں جن مقاصد کو ملحوظ رکھا تھا اب وقت آ گیا ہے کہ پیغمبر کی اس تربیت کا نتیجہ ظاہر کروں۔ کس کو نہیں معلوم کہ پیغمبر نے اخلاق فاضلہ کی اشاعت کن کن قربانیوں سے کی تھی۔ اسلامی عمارت کی تعمیر میں بنو ہاشم کے خون کام آئے۔ اسلام نے جن اخلاق فاضلہ کی اشاعت کی ان کی اشاعت میں اسلام کو بہت مصارف ادا کرنا پڑے جعفر طیار، سید الشہدا حمزہ، عبیدہ بن حارث ابو سلمہ سب اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں شہید ہوئے۔ جب اسلام کی اشاعت میں ایسے گرانقدر نفوس قربان کیے جا سکتے ہیں تو اسلام کی حفاظت کے لیے اُس سے زیادہ اہم قربانیاں پیش کی جا سکتی ہیں حسین اپنے نانا رسول اللہ کے خدمات کی اہمیت جانتے تھے۔ اُن کے سامنے ان قربانیوں کی فہرست بھی تھی جو ان کے خاندان نے اس سلسلہ میں پیش کی تھیں۔ کیا یزید شراب خواری اور زناکاری کو عام طور پر روا نہیں رکھتا تھا؟ کیا وہ آئین اخلاق کی علانیہ ہنسی نہیں اُڑا رہا تھا؟ اس وقت حسین کی خاموشی کو صرف وہ شخص جائز سمجھ سکتا ہے جو اسلام کی قربانیوں سے واقف نہو حسین ایسے آوارہ اور بدطوار کو خلیفۂ رسول کیسے تسلیم کر لیتے؟! اگر حسین ایسا کر لیتے تو وہ حسین نہ رہتے۔

یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ حسین ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالتے۔ حسین کے لیے محال تھا کہ حسین فضیلت اور رذیلت کو ایک درجہ میں رکھتے۔

سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی حسین کے علاوہ یزید کی خلافت کو پسند نہیں کیا۔ ان لوگوں نے معاویہ کے سامنے ہی

عــ۵ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری دکتور جامعہ ازہر مصر

یہ کہدیا تھا کہ اُن کا یہ طریق عمل کسی طرح مناسب نہیں ہے حسین، سعد بن ابی وقاص اور ابن زبیر وغیرہ سے زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔

حسین زیادہ حق رکھتے تھے کہ وہ یزید کے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور ہر قسم کی قربانی اپنے مقاصد کی حمایت میں پیش کریں۔

حسین کو یہ بھی یقین تھا کہ بعیت کا قصہ اس وقت برائے نام ہے۔ وہ خواہ بعیت کریں یا نہ کریں یزید ان کو زیادہ دنوں تک زندگی کی سانس نہیں لینے دے گا۔ لیکن اگر وہ یزید کی بعیت کر لیں گے تو صرف خود قتل نہ ہوں گے بلکہ ان کے ساتھ ان کے نانا کے عظیم الشان کارنامے بھی قتل ہو جائیں گے اور بعیت نہ کرنے سے حیند جانیں تو ضرور برباد ہونگی لیکن تمت زندہ ہو جائیگی، خیالات وعقائد کو دائمی حیات مل جائے گی۔"

سر سلطان احمد صاحب لکھتے ہیں "۶۰ھ میں عربوں کا سیاسی اور سماجی زاویۂ نگاہ اس حد تک بدل چکا تھا کہ وہ خلافت کی جانشینی کے موروثی اصول کو بھی تسلیم کر لینے کے لیے آمادہ ہو چکے تھے یزید استعماریت کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر رسول کی مسند پر بیٹھ چکا تھا لیکن جب تک کہ امام حسین کی ذات امت محمدیہ میں موجود تھی اور جب تک ان کے دست حق پرست نے اُس کی بعیت نہ کی تھی، اس وقت تک اُس کو کوئی شرعی استحقاق حاصل نہ تھا کہ وہ ملت اسلامی کی روحی قیادت کا مدعی ہوتا۔ اس نے حسین کو بعیت کی دعوت دی لیکن بعیت کا مسئلہ حسین کی شخصیت کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بعیت حسین سے بحیثیت حسین کے مانگی نہیں جارہی تھی بلکہ اسلام کی مقدس امانت کے حامل اور امین کی حیثیت سے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے عمل اور اپنی زبان سے یزید کے خلاف شرع طرز عمل کی تصدیق کر کے اسلام کی موت کے پروانے پر اپنی مہر ثبت کردیں۔

سر محمد سلیمان گولڈن ڈیڈس آف حسین میں فرماتے ہیں "یہ ایک انتہائی آزمائش و ابتلا کا وقت تھا جبکہ اسلام کی قسمت امام حسین کے فیصلہ پر منحصر تھی۔ یزید کا چیلنج تمام مادی طاقتوں کے ساتھ سامنے تھا۔ حسین نے اپنے مقصد کے لیے آخر تک لڑتے رہنے کا آہنی عزم کر لیا اور واقعات اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ حسینؑ اپنے فرض کو اسی شدت عزم کے ساتھ

ادا کیا جو ان کے شایان شان تھا" کوئی شبہ نہیں کہ عا؎ "اسلام کے لیے اس سے پہلے کوئی ایسا نازک زمانہ نہ آیا تھا۔ سچے مسلمان حیران اور خائف تھے کہ اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کریں اور کس طرح اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکیں۔ وہ اپنے ایمان کو بچائے ہوئے اپنے مامن میں بیٹھے تھے لیکن یہ ان کی طاقت سے باہر تھا کہ وہ عوام کو اس فتنہ سے بچا سکیں اور ان کی جائے پناہ بھی یزید اور اس کے ہواخواہوں کی دستبرد سے محفوظ نہ تھی بلکہ ظالم حکومت کا ہاتھ انھیں فرداً فرداً لے جاتا تھا۔ اگر یہی صورت کچھ عرصہ جاری رہتی تو یہ سچے مسلمان یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو جاتے اور پھر اسلام سوائے قرآن کے نسخوں کے دنیا میں کہیں نظر نہ آتا۔ مگر خدا کو اسلام کا بچانا منظور تھا اس لیے اس نازک وقت میں اس نے ایک ایسے شخص کو چن لیا جو ہر لحاظ سے اسلام کا یاور و مددگار بننے کا مستحق تھا۔ وہ شخص حضرت امام حسین تھے آپ اور مخلص مسلمانوں کی طرح اب تک کفر و الحاد کے فروغ کو دور سے دیکھتے رہے تھے لیکن دل میں یہ تہیہ ضرور کر چکے تھے کہ وہ اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنے نانا کے عزیز مذہب کو تباہی سے بچانے کے لیے ہر ممکن قربانی کریں گے۔ وہ موقع کے منتظر تھے اور یہ موقع انھیں جلدی مل گیا کیونکہ یزید یہ بھی گوارا نہ کر سکا کہ وہ الگ تھلگ مدینہ میں اپنا دامن اس سیلاب سے بچا کر بیٹھے رہیں بلکہ اس پر مصر ہوا کہ آپ اس کی بیعت کریں یا اسے خلیفہ برحق تسلیم کریں۔ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا اور وقت آ گیا تھا کہ حضرت امام حسین اپنے سکوت کو توڑیں اور اپنی جائے پناہ کو چھوڑ کر میدان جہاد میں اتر آئیں"

عا؎ "یہ کہنا کہ حسین نے ایک سلطنت کے خلاف بغاوت کی اس سے زیادہ دنی الطبعی ہے جیسے یہ صلاح کہ حسین نے جان بچانے اور انعامات کے لیے بیعت کیوں نہ کر لی۔

بغاوت کیا ہے؟ یہ کہ کسی حکومت کے خلاف جو انصاف اور قانون پر مبنی ہو، جو رفاہ عامہ اور آسودگی و امن خلق کی کوشاں ہو اس کو کسی کوشش سے منقلب کرنا اور خود صاحب اختیار بننے کی سعی کرنا۔ یزید کی حکومت ان باتوں کا ایک معکوس نظام تھا۔ ہر طرح کی سیاسی تدبیریں ایسے اموی مدبرین نے اختیار کی تھیں جنھیں ان باتوں کا نہیں بلکہ محض اس کا خیال تھا کہ کس طرح نظام حکومت بنی امیہ کے قبضہ میں رہے اور یزید

عا؎ ڈاکٹر محمود حید مرزا صاحب عا؎ جناب ریاض بنارسی

برسرِ اختیار ہو جائے۔ ان نتائج کے حصول کیلئے بہترین لوگ زہر اور فولاد سے سلا دیے گئے یا بیت المال کا ناجائز مصرف ہوا یا بچے بچپا ہکا بکا ہو کر رہ گئے اور اُن میں کچھ بولنے کی ہمت نہ رہی۔ پھر یزید نے جیسے نمونے پیش کئے تھے اس سے عام اخلاق کی پیشانی شرم سے عرق آلود ہو گئی تھی اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہی کہ یزید کا برسرِ حکومت ہونا اُس عہدنامہ کے ساتھ صریحی بدعہدی تھی جس کے ایک فریق خود حسین تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اہلِ کوفہ کی فریاد کسی کی اٹھائی ہوئی تھی یا ہمارے زمانہ کی طرح فن پروپیگنڈا تھا یا انتخابی چالیں تھیں؟ نہیں بلکہ خلق اللہ کی صدا تھی صاف اور صریح جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ہم کس حالت میں ہیں۔ باوجود اس کے بھی ایسے نظام کے خلاف آواز بلند کرنے اور اُس کے منقلب کرنے کی کوشش کو اِس مفہوم میں بغاوت کہنا کہ نیرو۔ چنگیز اور اٹھیل اور یزید کی حکومت بھی حق متجانب اللہی کے لحاظ سے ہر باز پرس سے بالا ہے پست طبعی ہے۔ بلند آہنگی اور عالی ہمتی یہی جواب دے گی کہ ہمیں نہیں معلوم کہ یزید کی سی حکومت کے خلاف باغی کہے جانے سے زیادہ بہتر کوئی اخلاقی سند عطا کی جا سکتی ہو۔ اگر عالی ہمتی اور خلق اللہ کی صدا پست نہ کی جاتی تو ممکن نہ تھا کہ یزید، مروان بن حکم اور ولید بن عبدالملک کے ایسے لوگ تاریخ اسلام کی پیشانی کے لیے ابدی سیاہی کا ٹیکہ بنتے اور اگر صدائے خلق میں قوت رہتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ اور حالت وہ نہ ہوتی جو ہے کیونکہ بادشاہ اور حکومتیں اپنا ایک زبردست نگراں سر پر موجود سمجھتیں۔ اس گورستانی خاموشی، اس کچلی ہوئی ہمت، اس دم خفا کرنے والی تاریکی میں ایک آواز، صدائے صور، ایک ہمت جس پر عالی ہمتی کو فخر ہو، ایک روشنی جو رہنما بن جائے آغوش پروردۂ خاتم النبیین کی تھی۔" عا۱ "اگر حسین یزید کے ساتھی بن جاتے تو اسلام کا ساتھی کون رہتا۔ حقیقی اسلام دنیا سے رخصت ہو جاتا، حق ناحق سے شرمندہ رہتا۔ پھر حسین کے واسطے چارہ کار کیا تھا؟" عا۲ "حسین کے لیے جو اسلامی عقائد کی عظمت اور اُن کی اعلیٰ قدر و قیمت کے بڑے حامی تھے ممکن نہ تھا کہ وہ اس فاسق و فاجر کو خلیفۂ رسول تسلیم کر لیں۔"

عا۱ علامۂ ہندی مولانا سید احمد صاحب   عا۲ خواجہ غلام السیدین صاحب

دوسری کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی تھی نہیں۔ پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟ جنگ، اگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال آپ کے سامنے پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علی ابن ابیطالب کی وفات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علی ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ حضرت علی کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکر لے سکی اور حضرت امام حسن کو اُس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپ نے صلح کرنا بہتر سمجھا۔ حالانکہ اُس وقت "شیعیان علی" کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس برس کی طولانی مدت گزرنے پر وہ جتھا پراگندہ ہوچکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خریدے جاچکے تھے، بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کئے جاچکے تھے اور ہزاروں کو جیلوں میں بھرا جاچکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بددلی سے ادھر اُدھر پریشان و پاشان ہوگئے تھے۔ ایسی صورت میں دمشق کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا تھا؟! اس کے علاوہ آپ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہوسکتا تھا اس کی تشریح آئندہ کی جائے گی۔

بہرحال ہمارے گزشتہ تبصرہ سے آپ کو حضرت امام حسین کے سامنے موقع کی نزاکت کا اندازہ تو ضرور ہو گیا ہوگا۔ یعنی جتنی صورتیں بظاہر کسی انسان کے سامنے آسکتی ہیں وہ سب ہی غیر ممکن ثابت ہو رہی ہیں۔ بیعت کرنا کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں۔ صلح کا کوئی امکان نہیں۔ جنگ کی کوئی صورت نہیں پھر اب جو حضرت امام حسین بیعت سے انکار کر رہے ہیں تو کیا کریں گے؟ میں سچ کہتا ہوں کہ اسے اگر حسین کر کے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسین نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ کریں گے مگر جنگ کا طریقہ بدل دیا۔ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں اُن میں طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہوتا ہے۔ حسین نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ وہ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے، اُنھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقہ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس کے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

حسین کا مقصد بھی اسی طریقۂ جنگ سے حاصل ہو سکتا تھا اور اسی مقصد کا حصول اُن کی حقیقی فتح تھی ع[1] "حسین کو یزید سے کوئی ذاتی یا خاندانی عداوت نہ تھی یہ ایک اتفاق تھا کہ آل ابو سفیان سامنے آ گئی۔ اگر کوئی دوسرا قبیلہ خواہ وہ بنی ہاشم ہی کی کوئی شاخ کیوں نہ ہوتی سامنے آ جاتی اور اُن مقاصد کے اجرا و شیوع میں مانع ہوتی جن کی ترویج حسین اپنا فرض اولین سمجھتے تھے تو حسین اُس قبیلہ کے مقابلہ میں ویسا ہی ٹھہرتے جس طرح آپ یزید کے مقابلہ میں نظر آ رہے ہیں" ع[2] "انھیں دنیاوی کوئی لالچ بھی نہیں تھی۔ اگرچہ خلافت کے وہ ہر طرح حقدار تھے لیکن انھیں اس کا بھی ملال نہ تھا کہ وہ انھیں نہ ملی وہ نام و نمود کے خواہاں نہ تھے۔ رسول اللہ کے نواسے کو نام و نمود کی کیا خواہش ہو سکتی تھی؟ وہ عیش و عشرت کے جویانہ تھے۔ جن کی والدۂ محترمہ نے تمام عمر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی انھیں آرام و عیش کی کیا خواہش ہو سکتی تھی اور اب آپ کی وہ عمر بھی نہ رہی تھی جس میں ان چیزوں کی لالچ انسان کو ہو سکتی ہے"

یاد رکھنا چاہیے کہ حسین اگر یزید سے صرف عداوت کی بنا پر مقابلہ کرنا چاہتے یا وقتی طور پر اپنی سلطنت قائم کرنا منظور ہوتی تو چاہے مکمل فتح حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا تب بھی آپ سلطنت شام کو ایک عرصہ تک پریشان کر سکتے تھے اور اگر اس کے ساتھ وہ ع[3] "موقع بینی اور "جان ہے تو جہان ہے" کی وضع کے مدبر ہوتے تو اُن کے لیے یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ مدینہ اور مکہ کے تقدس میں پناہ لیتے اور لوگوں کو اپنی مدد کی دعوت دیتے رہتے۔ ممکن وسائل سے لڑتے اور جب یہ سامان ناکافی ہوتا تو پسپا ہوتے، پھر مہیا کرتے اور علیٰ ہذا القیاس یا اگر ان دونوں مقامات سے نکل ہی چکے تھے تو طرماح بن عدی کے کوہ اجا میں پناہ لیتے جہاں بیس ہزار سواران طے کی حمایت کا وعدہ تھا لیکن حسین اس سے کہیں بڑے تھے کہ وہ اپنے موافق نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے۔ اُنھوں نے ایسی ترکیبیں اختیار نہیں کیں جو غرضمندوں کی تاریخ کا ایک ورق ہوتا اور جس سے ارضیت کی بو آتی۔ انھیں اپنے اقدامات کو آب باراں کی طرح صاف اور اپنے احوال کو صداقت کی طرح یقین خیز

ع[1] سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ع[2] ڈاکٹر محمد وحید مرزا گیا ع[3] ریاض صاحب بنارسی

رکھنا تھا ۔۔۔،، کیا حسین عبداللہ بن زبیر سے کم ملک عرب اور مسلمانوں میں اثر رکھتے تھے پھر جب ابن زبیر کئی برس تک سلطنت دمشق کا مقابلہ کر سکے تو حسین کیوں نہ کر سکتے تھے؟ ،، جنگ دو سر دارد ،، نتیجہ میں چاہے جو کچھ ہوتا مگر کہنے کو ہوتا کہ "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا" مگر حسین اس طرح کے مقابلہ کا خیال اُس وقت کرتے جب صرف مادی طور پر انھیں اپنے دشمن کو نقصان پہونچانا ہوتا - اگر ایسا ہوتا تو پھر تیاریاں بھی اُس کی دوسری طرح ہوتیں ۔۔ لشکر فراہم کیا جاتا - اسلحہ جمع کیے جاتے اور سب سے پہلا اقدام آپ کی طرف سے یہ ہوتا کہ اُسی موقع پر جب ولید کی ملاقات کو گئے تھے اور معاویہ کی وفات کی اطلاع ملی تھی تو فوراً ولید اور مروان پر حملہ کر دیتے اور اُن دونوں کو قتل کر کے اُسی وقت دارالحکومت مدینہ پر قبضہ کرتے - کیونکہ یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ امام اپنے ساتھ اس وقت اتنی جمعیت لیے گئے تھے جو وقتی طور پر آپ کی حمایت کے لیے کافی تھی یہ بھی ظاہر ہے کہ مدینہ میں اس وقت سلطنت شام کی طرف سے کوئی فوجی انتظام نہ تھا سیاست کے ماہر اور ملکی انقلاب کے واقفکار جانتے ہیں کہ ایک بادشاہ کے دنیا سے جانے کے بعد حکومت کی بنیادیں کس طرح متزلزل ہوتی ہیں اگر اس وقت حضرت امام حسین اس طرح کا اقدام کر دیتے تو کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر مدینہ اور اُس کے اطراف میں آپ کی سلطنت و حکومت مسلم ہو جاتی - پھر مکہ، طائف، یمن اور عراق بلکہ ایران کا آپ کی سلطنت میں داخل ہو جانا کوئی دشوار امر نہ تھا مگر آپ نے ایسا نہیں کیا - وہ طاقتور جماعت جسے اپنے ساتھ لے گئے اُس سے بھی صرف اپنی جان کی حفاظت اور مدافعت کا کام لینا منظور تھا اسی لیے باوجود سخت کلامی تک نوبت آ جانے کے تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو اندر نہیں بلایا اور نہ کسی عملی اقدام کی اجازت دی - اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ سلطنت دمشق پر براہ راست کوئی مادی ضرب لگانا نہیں چاہتے تھے اور نہ خود اس طرح کی حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے جب آپ کا یہ مقصد نہیں تھا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فتح و شکست کا معیار بھی آپ کی نظر میں بالکل جداگانہ تھا - فتح کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اُس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے یہ معنی

نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی قتل ہو جائیں ۔ بیشک عام طور پر فتح وہی ہے اور شکست اسی کا نام ہے ۔ مگر یہ اُن کے لیے جن کا مقصد مادی اقتدار حاصل کرنا یا اُس کو ترقی دینا یا دشمن کی مادی زندگی کو ختم کرنا ہو ۔ حضرت امام حسین کا جب مقصد یہ نہ تھا تو اُن کے نزدیک شکست و فتح کا معیار بھی یہ نہیں ہو سکتا ۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ میرے نانا کے تعلیمات اور انسانیت کے اصول جنھیں بہت سی قربانیاں برداشت کر کے رائج کیا گیا تھا اب بالکل فراموش ہو گئے ہیں اور شہنشاہی اقتدار اور سلطنت کے جاہ و حشم نے نگاہوں کو اس طرح ہٹا دیا ہے کہ اب اُن تعلیمات کی چمک دنیا کو نظر نہیں آتی ۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیمات اسلام پر ایسا غلاف چڑھ گیا ہے جس سے آئندہ صدیوں کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقتہً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظام زندگی کیا تھا جسے پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نگاہ اُٹھا کر سامنے نظر کریں تو اونچی عمارتیں، بلند مینار اور بڑے بڑے عالیشان پھاٹک آنکھوں کے سامنے جلد آ جائیں گے لیکن زمین سے ملے ہوئے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر، وہ چھوٹے دروازے جہاں آدمی بغیر سر جھکائے ہوئے جا بھی نہیں سکتا مشکل سے دکھائی دینگے ۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ تاریخ ہو سکتی ہے ۔ یہی تاریخ کی دوربین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے ۔ اسلامی دنیا میں سلاطین اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالب تحقیق نیک نیتی کے ساتھ تاریخ کی دوربین سے نظر ڈالتا تو اُس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے، وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں، وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زر و جواہر کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے

اندر باریابی ہو جاتی تو زر و جواہر سے مرصع تخت نظر آتا اور زریں کمر غلام صف باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صدا اور ساز و طرب کے نغموں کی گونج ۔ "پیشوائے اسلام کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہی تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہی۔ موذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی ۔ بتایئے! اگر وہ یہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن یہی ہی اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ اُن کے افعال مسلمانوں کے افعال بتائے جاتے اور اُن کا کردار ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی ۔کہاں نظر آتے محلہ بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جن میں کچھ بوڑھے، کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب، محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود فاقہ سے دن گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے مساوایا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسا بھائی بھائی کے ساتھ کرتا ہے ۔ کہاں نظر آتے وہ چہرے جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھا گئی ہے! وہ ہونٹ جو ذکر الٰہی سے خشک ہو گئے ہیں، وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہی کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کسی کمزور کی مدد کرو اور کسی محتاج و بیکس کی دستگیری کرو۔

بس حسین بن علی کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے ہوئے اسی پر کمر بستہ ہو گئے تھے کہ تو سہی انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں، ان قصروں اور میناروں سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کی برق تجلی کو عمل کی اس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اُٹھتے ہی سب سے پہلے اُسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے ۔ اُنھوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں ستارے کی طرح چمک اُٹھے ۔ سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے ۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اس نقار خانۂ ساز و نغمہ سے بہرا بنا دیں اور حقانیت اسلام کی اُس سریلی اور دلکش آواز سے آشنا کر دیں جو

موجودہ حالات میں سنائی نہیں دیتی۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے حسین کمربستہ ہوئے تھے۔ دوسری لفظوں میں اُن کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کردیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تمدن و تہذیب اور اُس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسین جس مشن کو لے کر اُٹھ رہے تھے وہ مشن اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی مشن تھا جسے تمام انبیاء لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے مگر اُس مشن کو جس صورت سے آپ نے کامیاب بنایا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیاتِ امم کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افرادِ انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور اُن تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ عوام سے قوتِ احساس کو سلب کیا جائے۔ دوسرے جرأتِ اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی طاقت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پر پوری طاقت صرف کردی تھی۔ ورنہ مسلمان جن کو پیغمبر نے اُس محنت و مشقت سے اصول انسانیت کی تلقین کی ہو اور جس مسلم جماعت نے دیکھا ہو کہ پیغمبر کس طرح مادی ساز و سامان کو ہیچ و پوچ سمجھتے ہیں، جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبر کے دروازے پر پھٹا ہوا پردہ پڑا ہے جنھوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبر کے گھر سے دھواں نہیں اُٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا ہے وہ جماعت کیسے اس کو برداشت کرسکتی کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس چوس کر روپیہ جمع ہو اور اُس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ اسلام کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب و کباب کے مشغلے رہیں مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوا تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب ہے مسلمانوں کی طبیعت میں یہ انقلاب کس طرح پیدا ہوسکتا تھا؟ اُن ہی دو باتوں سے، قوتِ احساس کا ختم ہونا اور جرأتِ اظہار کا سلب ہونا۔

قوتِ احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے اُن کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے ممتاز افراد اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے تو جدھر یہ لیڈر لے جانا چاہیں، عوام نیک نیتی کے ساتھ اُسی طرف چلے جائیں گے۔ خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اور اسی طرح عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے کبھی حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا۔ کس طرح؟ جس کو ذرا مخالفانہ رجحان رکھتے ہوئے پایا، اس کی جیب میں اشرفیوں کی ایک تھیلی پہونچادی گئی۔ اگر اُس نے قبول کرلی تو سمجھ لیجئے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن ہوا اتنا ہی اُس کی مخالفت کا سر جھک گیا۔ پھر "چھٹتی نہیں ہے مُنھ سے یہ کافر لگی ہوئی"، جہاں خیال ہوا کہ اب کی دفعہ دَہ توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دو کے چار ملیں گے وہیں قوتِ احساس ختم ہوگئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے جاہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا ضمیر خرید لیا گیا اور بہت سے منچلے جن کے سر اُٹھے ہی رہے اُن کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کردی گئی اور اگر یہ حربہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام جو لب تک پہونچتے ہی موت کی میٹھی نیند سُلادے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کردیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو اُن لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس سے پہلے کچھ سوچ کر اختلاف کا اظہار کرچکے تھے کہ آج صفحۂ ہستی اُن کے نقش وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جرأت اظہار ختم ہوئی۔

یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کو ازسرِ نو پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھاکر حضرت امام حسین میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوتِ احساس کیسے پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مُسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مُسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو مانتے ہیں اور اپنے کو مُسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ان کے احساساتِ اسلامی پر غشی چھاگئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہوجائے تو اس میں نفس کی آمد و شد قائم ہوتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثارِ زندگی

مفقود ہوتے ہیں۔ احساس اور حرکت دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں اسی طرح اس وقت جامعۂ اسلامیہ میں کلمۂ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساسات اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ جب کسی کو غش آجاتا ہے تو اُس کے چہرے پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جتنی گہری بے ہوشی ہو اُتنا ہی تیز چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسین نے بس یہ چاہا کہ مُسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز چھینٹا دے دیں جس کے بعد وہ پھریری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ حضرت امام حسین نے یہ بھی سوچا کہ اس بیہوشی کا کیا سبب ہے؟ آپ نے سمجھا اور بالکل صحیح سمجھا کہ وہ جماعت جو تعلیمات اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مُسلم جماعت ہوتی تو مُسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیمات اسلام کو برباد کر رہی ہے۔ اپنے چہرہ پر اسمی و رسمی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے ہے۔ اور مُسلمانوں کی جماعت ہے اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے حضرت امام حسین نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت کے چہروں سے اسلام کی اس نقاب کو اُتار کر پھینک دیں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور یہ کہ انکو اسلام سے حقیقتہً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائینگے اور انکے خلاف انقلاب پیدا کرنیکے لیے تیار ہو جائینگے دوسرے بعد میں مسلمانوں کیلیے انکے افعال سند نہ رہینگے جب مسلمانوں کو ان کے اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائیگی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ تیسرے غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی امیہ کے اوصاف و اخلاق کو اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مُسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسین بن علی کا کردار مُسلمانوں کے سر کو بلند کریگا کہ اگر یزید کے افعال کا اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو پیغمبر اسلام کا نواسا اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈال دیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام و کمال مادی جنگ سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اُس سے افراد و اشخاص قتل ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افراد جامعہ کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا حسین بن علی اشخاص کو قتل کرنے نہیں اُٹھے تھے۔ یزید کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید ختم ہو جاتا

اور اُس کے تمام عمال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ یزیدیت ختم ہو گئی اور یزیدی مسلک فنا ہو گیا۔ ذہنیت دنیا کی جب مئوف تھی تو اگر آپ عسکری طاقت لے کر جنگ کرتے تو جو اُس کی واقعی حیثیت تھی اُس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت و سلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور حسین کا پلہ سبک ہوتا اس بنا پر کہ سیاسی طور پر وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے ہوتے۔ اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بنا پر غیر ممکن تھی تو اُس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیرپا نہیں رہتا اور بنی امیہ پر ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اُسی طرح پڑا رہتا جس طرح اس کے پہلے تھا اور اگر کچھ لوگ حسین کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطار اجتہادی کا سارٹیفکٹ دیدیتے جیسا کہ اس کے پہلے صفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو اُن سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک اُن سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اُس وقت تک ان امتیازات واقدار کو مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسین طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا میں جنہوں نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں یا حسین بن علی کی فتح ویسی ہی فتح سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کرتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی۔ اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی حالانکہ تاریخی حالات بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی یعنی اُس صورت میں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو امیرالمومنین کو وقت سے مجبور ہو کر گوارا کرنا پڑا تھا یعنی عراق و حجاز وغیرہ کی

حکومت امام حسین کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی دونوں طرف کی حکومتوں میں مقابلہ ہوا کرتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں مگر امام حسین جو کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے وہ ایسی تھی جو نہ باعتبار حدود مملکت محدود تھی اور نہ باعتبار حدود زمانہ محدود۔

ممکن ہے یہ سوال اُٹھایا جائے کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوئے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن و اصُول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیئے دُور ہو گیا ہے کہ انہی کو اسلام کا مستقل اصُول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ حسین نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا ہے۔

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسین بن علی کے لیے اپنے مقصد کے حصُول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ وہی جسے اُنھوں نے اختیار کیا اور اسکے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا عــه حسین کا سن اس وقت چھپن برس سے کم نہ تھا اور یقیناً اس عمر میں انھوں نے ایک ایسے اقدام کو جس میں کہ پورے خاندان کے بقا و فنا کا سوال درپیش تھا بغیر پورے طور سے غور کیے شروع نہیں کیا تھا چونکہ وہ ایک عدیم المثال کارنامہ صفحۂ عالم پر مرتسم کرنا چاہتے تھے اسلیے اُنھوں نے پورا الیقین کر لیا ہوگا کہ جس مقصد کے لیے وہ اپنی اور عزیزوں کی جان دینا چاہتے ہیں وہ یقیناً اُن کی موت کے بعد فنا نہیں ہوگا"

اس طریقہ کار کی پوری تشریح و تفصیل آئندہ کے ابواب میں ہوگی اور اس داستان کی آخری سطریں وہی ہوں گی جہاں قلم کی نوک سے روشنائی کے بدلے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی دینے لگیں مگر ابھی تو حسین کا طرز عمل صرف ایک منفی ہی فقرہ سے ادا ہو سکتا ہے یعنی "بیعت نہ کرنا"۔ اگر ہم آگے کے حالات کا مطالعہ نہ کریں تو ہم اس سے کچھ

عــه سید خورشید حسن صاحب نقوی

بھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ جب کہہ رہے تھے کہ "بیعت نہ کروں گا" تب ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کرنے والے ہیں مگر وہ جلد باز اور جذباتی انسان ہوتے اگر اپنے عمل کو اسباب کی رفتار سے آگے بڑھا دیتے۔ بے شک اسکے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہے اور بڑی قوت برداشت درکار ہے جس نے مناظر کر لیا ہو اُس کے لیے پھر آج اور چھ مہینے بعد میں فرق ہی کیا مگر وہی بات جو چھ مہینے بعد ایک عظیم قربانی سمجھی گئی آج "خود کشی" قرار پا سکتی تھی۔ انھیں لازم تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کی بھی کوشش کریں مگر اس حد تک کہ اُن کے اصُول اور مقصد پر آنچ نہ آئے اور اگر مقصد کا تحفظ جان دینے پر موقوف ہو تو پھر جان دینے کیلیے بھی تیار ہو جائیں

بس یہی ہے حسین کے رفتار عمل کی تشریح شروع سے لے کر آخر تک اور اس کی ابتدا ہو گئی تھی یہیں سے کہ انھوں نے ولید کے مطالبۂ بیعت کو پورا نہیں کیا مگر اس طرح کہ اُن کے خلاف فوراً کوئی اقدام عمل میں نہ آ سکے۔

اصُولاً آپ کے جواب نے ولید کو خاموش کر دیا تھا اور اُسے تقبل کے ساتھ توقع وابستہ کرنے کا موقع تھا۔ عـ۵ "رہے ابن زبیر تو انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آتا ہوں مگر گھرا کر چھپ رہے۔ ولید نے قاصد بھیجا تو اُس نے یہ دیکھا کہ ابن زبیر اپنے احباب کے جتھے میں ہیں اور اس کی وجہ سے بیعت سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں مجبوراً ولید کو پے در پے قاصد روانہ کرنا پڑے اور اُن سے مُسلسل مطالبہ شروع کر دیا۔ ابن زبیر نے مہلت مانگی مگر وہ لوگ تمام رات اڑے رہے یہاں تک کہ ولید نے چند غلام بھیجے جنھوں نے آ کر ابن زبیر کو سخت سُست کہا اور پکارے امیر کے پاس چلو، نہیں تو ہم تمھیں قتل کر دینگے۔ اس حالت میں تمام دن اور ثلث اول شب ابن زبیر نے کاٹا اور یہی کہتے رہے کہ "ابھی آیا"، جب زیادہ مجبور کیا گیا تو کہنے لگے کہ ان پیادوں کی پیہم آمد سے گھبرا گیا ہوں، اک ذرا تھم جاؤ کہ ولید کے پاس ہم اپنا آدمی بھیج کر اُسکی رائے دریافت کر لیں چنانچہ اپنے بھائی جعفر کو ولید کے پاس بھیجا۔ جعفر نے جا کر کہا کہ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ ابن زبیر تم سے کل ملیں گے۔ انھیں تو تمھارے مُسلسل پیادوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ اپنے پیادوں کو

عـ۵ مولانا نعمت امام صاحب حنفی (پھلواری ضلع پٹنہ)

حکم دو کہ وہ لوٹ آئیں۔ خیر ولید نے بات مان لی اور اپنے پیادوں کو لوٹنے کا حکم دے دیا ابن زبیر کو موقع غنیمت مل گیا۔ اُنھوں نے اسی رات کو مکہ کا رُخ کیا۔ شارع عام سے کترا گئے۔ صبح ہوئی تو ولید نے قاصد بھیجے تو معلوم ہوا کہ وہ تو شب ہی کو مدینہ سے نکل گئے۔ وہ ہیں اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی جعفر ہیں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مروان کے مشورہ سے مکہ کی راہ پر سوار تعاقب کے لیے روانہ کیے گئے مگر وہاں تو راستہ ہی بدل دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوار تھک کر لوٹ آئے۔

واضح رہے کہ ابن زبیر اُسی دن کی رات کو مکہ کی طرف چلے گئے اور جناب امام علیہ السلام نے یہ کہدیا تھا کہ اُسی دن بلانا جب مجمع عام ہو۔ اس کے بعد عقلاً امام سے تعرض ہو ہی نہیں سکتا تھا تا آنکہ مجمع عام ہی نہ ہو۔ اسی لیے امام کو موقع ملا۔ آپ گھر تشریف لائے اور روضۂ رسول پر حاضر ہوئے۔ اور پہلی شب ہیں گزاری۔ دوسرے دن مجمع عام ہو سکتا تھا مگر عبداللہ بن زبیر کی غیبت اور اُن کے تعاقب کی وجہ سے دن بھر فرصت ہی نہیں ہوئی کہ امام سے تعرض ہو سکے۔

کوئی شک نہیں کہ عہ "مدینہ میں ولید کی ملاقات کے بعد سے جو قدم حسین اُٹھاتے تھے وہ نہایت سنجیدہ اور واضح ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان چیزوں کی اہمیت اُس وقت نہ سمجھی گئی ہو لیکن بعد کے واقعات نے اُن ضرورتوں کو اور حسین کے کمال تدبر و سکون دماغ کو ثابت کر دیا۔"

عہ سید خورشید حسن صاحب نقوی

(تیسرا باب)

مدینہ سے کربلا تک

ع۱ "حسین کا پوزیشن مدینہ میں بہت نازک تھا۔ وہ وہاں ایک اکیلے خاص آدمی رہ گئے تھے جنھوں نے یزید سے اختلاف کیا تھا اور فطرۃً اپنے مخالف کے شدید غضب کا مرکز بن گئے تھے۔ یزید چاہتا تھا کہ اُن کو ذلیل کرے اور نہ صرف اُن کو بلکہ چونکہ اُس کی نظر میں رسول اور اُن کے مذہب کی بہت کم عزت تھی اس لیے وہ اس کے ضمن میں تمام خاندان بنی ہاشم کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ پُرانا بُت پرستی کے زمانہ کا جذبۂ رقابت تھا جو اس وقت یزید پر مسلط تھا اور اُس نے اپنے ملازموں کو جو مدینہ میں تھے سخت احکام نافذ کیے کہ وہ جس قیمت پر بھی ہو حسین سے بیعت حاصل کریں۔"

ع۲ "اب مدینۂ رسول جو حقانیت و صداقت کا گہوارہ تھا اُس کی زبوں حالی کا یہ نقشہ ہے کہ مجسمۂ فسق و فجور کی عہد غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کے لیے سب کے سب تن تیار ہیں الّا ماشاءاللہ۔ کسی کو یہ احساس بھی نہیں کہ یہ کوئی بری شے ہے۔ اگر کسی کے دل میں کچھ احساس ہے بھی تو اُس کی زبان خوف حکومت سے بند ہے۔ ہر طرف بنی امیہ کے سطوت و جبروت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ رسول کے نواسے سے سختی کے ساتھ یزید کی بیعت کا مطالبہ شروع ہو چکا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر بیعت سے انکار کی صورت میں امام حسین کا مدینہ میں قیام جس قدر خطرناک ہے اسی قدر بے نتیجہ۔ حکومت وقت اپنی انتہائی طاقت صرف کرنے کے لیے تیار ہے۔ کئی پشت کی جمی جمائی سلطنت سے مقابلہ کا یہی نتیجہ ہوگا کہ خاندان نبوت تو تباہ ہو گا ہی۔ حرم رسول کی بے حرمتی اور مدینہ کی بربادی کا الزام ہمیشہ کے لیے امام کے دامن پر رہ جائے گا۔

بادی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضرت امام مدینہ میں قیام فرماتے تو آپ کو اہل مدینہ

ع۱ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا) ع۲ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی

سے کافی امداد ملتی اور اُس بے دردی کے ساتھ، خاندان نبوّت کا استیصال نہ ہو جاتا جس طرح کربلا میں ہوا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر کربلا کی سی صورت مدینہ میں پیش آتی تو حضرت کی حمایت کے لیے کوئی نہیں تیار ہوتا۔ یقیناً کچھ نہ کچھ لوگ ایسے نکل آتے جو حقِ جاں نثاری ادا کرتے لیکن اس سے نتیجہ میں کیا کامیابی ہوتی؟ ہوتا وہی جو ہوا۔ اہلِ مدینہ کی نگاہوں میں حضرت کی جتنی وقعت و منزلت تھی حضرت کو اُس کا پورا پورا اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یابن رسول اللہ یا بابی انت کی صدائیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈال سکیں۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ خاندان نبوّت کا وہ درجہ اہلِ مدینہ کی نگاہوں میں نہ تھا جو دوسرے اصحاب اقتدار کا تھا۔ ظاہر ہے کہ حسینؑ ایسے متبصر انسان کو اس کا کس قدر احساس ہوگا چنانچہ اہلِ بصرہ کو جو خط آپ نے لکھا اُس میں صاف طور سے اپنے حقوق کی پامالی اور اغیار کے منتخب ہونے کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ ہمارے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی گئی ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ اہلبیت کے مقابلہ میں جن حضرات کو اہلِ مدینہ نے فوقیت دی اور ان کی عظمت کا لوہا مانا اُن کا کہاں تک ساتھ دیا۔ حضرت عثمان غنی ایک دن دو دن نہیں بلکہ پورے چالیس دن تک محاصرہ میں رہے لیکن بجز اہلبیت کے کوئی اُن کے آب و دانہ کا لحاظ کرنے والا بھی نہ تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ محاصرین کی کوئی بڑی بھاری فوج تھی جس کا مقابلہ اہلِ مدینہ نہیں کر سکتے تھے۔ مصر کے تھوڑے سے بلوائی تھے اور کیا تھا؟ تمام وہ لوگ جنھوں نے بیعت کی تھی اور حمایت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ نہ معلوم کس غفلت میں بیٹھے ہوئے تھے نہ کسی نے خلیفۂ معظم کی حمایت میں تلوار اُٹھائی نہ کہیں سے اتنے دنوں کوئی کمک آئی۔ ان تجربات کے ہوتے ہوئے حسینؑ سا صاحب الرائے انسان کس امید پر مدینہ میں قیام کر سکتا تھا۔ ہاں ایک ہی صورت قیام کی ہو سکتی تھی۔ وہ یہ کہ حسینؑ بھی معاذ اللہ بیعت یزید کر لیتے اور لا تعاونوا علی الاثم والعدوان کی آیت کریمہ کو فراموش کر دیتے مگر امام عامل بالکتاب اسے کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو سورہ نساء چودھواں رکوع:۔ ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا

ملائکہ جب ظلم علی النفس کرنے والوں کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ تم کس مذہب میں تھے؟ (الناس علیٰ دین ملوکھم) تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو زمین میں مغلوب تھے مگر اُن کا یہ عذر قابل قبول نہیں سمجھا جاتا ہے اور ملائکہ اُن پر جرح کرتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کرکے کہیں چلے جاتے؟ اس آیۂ کریمہ کا منطوق یہی ہے کہ جب کسی مقام پر دینی آزادی نہ حاصل ہو اور بیدینی کی تائید پر مجبور کیا جائے تو اس وقت ہجرت کرنا ضروری ہے۔" حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر حسین عاقبت اندیشی کرکے مدینہ رسول کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسین کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے وہ سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرزِ عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی ناگواری کے مال وجاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسین کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اُس کو معزول کرکے مروان بن الحکم یا اُس کے ایسے کسی دوسرے سفّاک اور سخت ترین دشمن اہلبیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کرکے فرزند رسول کے خون سے مدینۂ رسول کی زمین کو گلرنگ بنایا جاتا۔

وہ خطرہ جو حسین کو ولید کی گفتگو کے بعد پیدا ہو چکا تھا صرف توہم یا اندیشہ نہ تھا بلکہ وہ بالکل یقینی تھا اور اُس نے فعلی حیثیت اختیار کرلی اُس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین یزید کی طرف ولید بن عتبہ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسین بن علی آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں اب آپ کی جو رائے ہو" اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام اُن ممتاز افراد کی جنھوں نے میری بیعت کی اور جنھوں نے بیعت نہیں کی مکمل فہرست جلد بھیجو لیکن اس جواب کے ساتھ حسین بن علی کا سر موجود ہو۔" اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں تک ٹھہر سکتا تھا؟ یہ بالکل ظاہر ہے وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اُسے

معزول کر کے عمر بن سعید کو حاکم مدینہ مقرر کر دیا گیا۔ ع۱ سوال یہ ہے کہ ولید یہاں سے کیوں ہٹایا گیا۔ بات بالکل صاف ہے اور وہ یہ کہ وہ یزید کے احکام کی تعمیل پوری طرح نہیں کرتا تھا۔ ابن خلدون اور سبط ابن جوزی دونوں نے اس عقدے کو حل کیا ہے۔ سبط ابن جوزی اپنے تذکرۂ خواص الامہ میں رقمطراز ہیں کہ جب یزید کو ولید کے طرز عمل کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ولید کو مدینہ سے معزول کر دیا اور عمرو بن سعید اشدق کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا (قلمی ۲۸) ابن خلدون نے بھی اپنی کتاب (مطبوعۂ مصر جلد سوم ص۲۱) میں صاف لکھا ہے کہ جب یزید کو خبر پہونچی ولید کے طرز عمل کی ان لوگوں کے بارے میں (جنھوں نے بیعت سے انکار کیا تھا) تو اُس نے ولید کو معزول اور عمرو بن سعید اشدق کو مقرر کیا۔ ان اقتباسات سے پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حسین کا مدینہ چھوڑنا حق بجانب تھا۔ حسین کو یزید کا عندیہ اور نصب العین معلوم تھا اور وہ موقع کی نزاکت سے کماحقہ واقف تھے۔ ولید کے دربار میں جانے سے قبل اُنھوں نے حفاظت خود اختیاری کر لی تھی۔ یقیناً اگر مروان کو آپ اپنے جواب سے مرعوب نہ کرتے تو معاملہ دگرگوں ہو گیا تھا۔ پھر بھی مروان کے اقدام سے یہ تو ظاہر ہی ہو چکا تھا کہ حسین کا مدینہ میں ٹھہرنا کتنا مخدوش ہے۔ مدینوں میں زندگی کا کوئی شرر باقی نہ تھا۔ اور اُن سے کسی قسم کی التجا کرنا محض بے سود تھا۔ نتیجہ ہوتا کہ یزید کے خفیہ مشیر کار حسین کو قتل کر دیتے اور الزام کسی بے گناہ کے سر تھوپ کر معاملہ کو رفع دفع کر دیتے اور اس طرح حسین بغیر اپنے حق میں یا مذہب کے حق میں اپنا کارنمایاں دکھائے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے۔" کیا مدینہ میں حسین کو اُتنے بھی خالص اور سچے جان نثار مل جاتے جتنے کربلا میں آپ کے ساتھ نظر آتے ہیں؟ یہ بات بہت مشکوک ہے۔ ع۲ کیا نہیں دکھائی دیتا کہ وہ مدینہ جس کا گوشت اور پوست رسول اور علی مرتضیٰ کی کوششوں سے بنا تھا حسین کو مدینہ سے جلاوطن ہوتے اس طرح خاموشی سے دیکھتا ہے جیسے کوئی جنازہ جاتے دیکھتا ہے۔ کون تھا جسے اہلبیت رسول کے خوف کا موقع معلوم تھا لیکن ہر ایک کو یہ بھی معلوم تھا کہ اموی حکومت نے ہر ایک قوی شخص کو جس سے کوئی خوف تھا زہر یا رشوت سے خاموش کر دیا ہے۔ اگر تمھیں معلوم ہو تو وہی ایک ایسے

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ع۲ ریاض صاحب بنارسی

آدمیوں کا نام بتاؤ جنھوں نے حسین سے کہا ہو کہ مدینہ سے نہ جائیے۔ ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔"

خود اہل حجاز کی افتادِ طبیعت کے متعلق دانشمندان عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں جیسا کہ علامہ ابن الفقیہ نے کتاب البلدان (مطبوعہ لیدن۔ ہالینڈ) صفحہ ۱۳۵ میں لکھا ہے کہ امیر معاویہ نے ابن الکوّاء سے مختلف عربی ممالک کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس میں اہل حجاز کے متعلق بھی پوچھا۔ اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ۔"

پھر اگر حسین مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا اُن کا قتل اسی اعلان و اشتہار کے ساتھ ہوتا جو کربلا میں ہوا۔ سیاست حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اُسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے یا تو حسن کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا علی کے قتل کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسین واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے گئے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حسین اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے ـــ تدبّر کا اقتضاء یہ تھا کہ مدینہ میں قیام کرتے تو پھر بیعت ہی کر کے اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو انھیں اپنے اصول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اُس افق پر لے جاکے پیش کرنا چاہیئے تھا جہاں وہ کربلا کے میدان میں سے نکھرے ہوئے ع۵ وہ یہ صاف نظر اور روشن ضمیر جس کی آنکھوں نے ۵۷ برس کی عمر تک بڑی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جس کے کانوں نے پاک ترین دہنوں سے صداقت ریز کلام سُنے تھے اور قوم کے بننے اور بگڑنے کا تماشا اس قربت سے دیکھا تھا جیسا کوئی گھر والا دیکھ سکتا ہے، وہ مسخ شدہ صورتوں کی انتہا کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اُس کے سامعۂ باطنی کو قرنائے تم بنائی دے رہی ہے۔ ذرّہ ذرّہ کائنات کا اُس سے کہہ رہا ہے کہ حسین تم اسی دن کے لیے پیدا اور تیار کئے گئے تھے تمھیں اس جرم پر سزا دی جائے کہ کیوں مشیت ایزدی نے رسول کی گود کا پالا اور فرزند علی و فاطمہ بنایا۔ تم اس

ع۵ ریاض صاحب بنارسی

اقرار جرم پر فخر کرو گے۔ زمانہ تمھارے گھر کو اس طرح پہچان لے گا کہ پھر شبہہ کی گنجائش نہ رہیگی اصول آج تمھارا منھ دیکھ رہا ہے۔ چلو قتل گاہ کی طرف چلو۔ صداقت تمھاری عزت کی ضامن اور حقیقت تمھاری ہمدردی کی کفیل ہو گی اور حسین کی آنکھوں کے سامنے سوتے جاگتے رسول اللہ قبر مطہر سے نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور فرما رہے تھے کہ حسین شہادت سعادت حاصل کرنی ضرور ہے۔ بس اب کوئی تردد نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے گھر بھر کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ طیبہ سے نکلنا اگر انکار بیعت کا اعلان تھا تو فوری خطرہ سے حتی الوسع بچنے کا اقدام بھی تھا۔ ؏۱ "یاد آتا ہے اس وقت حضرت محمد مصطفےٰ کا طائف کی جانب سفر کرنا جو یقیناً ایک بلند منصوبہ اور شجاعانہ ایثار کے ماتحت تھا۔ غور کرو کہ رسول کیونکر بے زاد و توشہ جا رہے ہیں۔ خدا کا بندہ تن تنہا جسے قوم نے ذلت و نفرت کے ساتھ نکال دیا تھا، خدا کا نام لیتا ہوا بہادری سے منزلوں کو طے کرتا چلا جا رہا تھا اور بت پرست ملک کو اپنے کئے ہوئے پر پچھتاوے کی اور دین حق کی حمایت کی ترغیب دلاتا جاتا تھا۔ رسول کی اس کیفیت سے بہت ملتی جلتی ہے حسین بن علی کی صورت جس کو کہ امت نے رسول ہی کی طرح ملک اور قبیلہ سے نفرت کے ساتھ علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور جو آخری دم تک گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا عزم کئے ہوئے ہے۔"

؏۲ "حضرت کے پیش نظر ایک ایسا مقصد تھا جو بہت بلند تھا اور جس کو آپ نے وصیت نامہ کے طور پر لکھکر اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے حوالہ کر دیا تھا۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ یہ وصیت نامہ ہے حسین فرزند علی بن ابیطالب کا اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ اُس کے بندۂ خاص اور رسول ہیں جو حق کی جانب سے حق کو لے کر آئے ہیں اور یہ کہ بہشت و دوزخ حق ہیں اور قیامت آنیوالی ہے اُس میں کوئی شک نہیں اور یہ کہ اللہ تمام مردوں کو ایک روز زندہ کرے گا اور یہ کہ میں غرور، سربلندی، جذبۂ تفوق یا فتنہ انگیزی اور ظلم کے لیے نہیں نکل رہا ہوں بلکہ صرف امت پیغمبر کی اخلاقی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نکلتا ہوں اور اپنے جد بزرگوار

؏۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ ؏۲ مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری

اور اپنے باپ علی مرتضیٰ کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں جو شخص حق جان کر میری باتوں پر عمل کریگا وہ اپنا فرض انجام دے گا اور جو میری باتوں کو مسترد کریگا تو میں صبر و تحمل سے کام لوں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور دوسرے لوگوں کے درمیان حقیقی فیصلہ کرے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس وصیت نامہ کا ایک ایک لفظ جناب سید الشہداء کے حقیقی زاویۂ نظر اور واقعی نصب العین کا آئینہ ہے اور اس کو بہ نظر اعتبار دیکھنے والے اس میں شبہہ ہرگز نہیں کر سکتے کہ حضرت کے سامنے جو مہم تھی وہ صرف یہ تھی کہ اسلامی دنیا کو سیرت نبویہ و علویہ یعنی صحیح انسانیت اور حقیقی اسلام کی طرف دعوت دیں۔"

۶۰ھ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ اتوار کی رات تھی جب حسین مدینہ سے روانہ ہوئے (ارشاد شیخ مفید ص۲۲۱) ع۵ "یقیناً سرزمین مدینہ کو چھوڑتے وقت جہاں وہ اپنے جدّ بزرگوار رسول خدا کی آغوش میں کھیل چکے تھے، جہاں اُن کے قریب ترین اور عزیز ترین افراد دفن تھے حسین کا دل بھر آیا ہوگا۔ اس کے علاوہ آئندہ کے واقعات کی صورت اُن کی آنکھوں میں پھر رہی ہوگی اس لیے مدینہ سے رخصت ہونا یقیناً ایک نہایت درد انگیز منظر تھا۔" آپ کی زبان پر اُس وقت قرآن کی یہ آیت تھی فخرج منها خائفا یترقب قال ربّ نجّنی من القوم الظالمین اس آیت میں موسیٰ کا ذکر ہے اُس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے ہیں اور یہ فقرہ اُن کی زبان پر تھا۔ آپ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے حالانکہ ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہ عام کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ دیا لوگوں نے یہی مشورہ حسین کو بھی۔ مگر وہ اپنے مدینہ سے نکلنے کو "فرار" کے نام دینے پر تیار نہیں تھے اُنھوں نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا نہیں، میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر جو خدا کو منظور ہو۔ (الاخبار الطوال ص۲۳۰)

آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا سوائے محمد بن الحنفیہ کے جو مصلحتہً مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے اور کہا جاتا ہے کہ ایک بھائی آپ کے اور عمر بن علی تھے جو خود اپنی خوشی سے مدینہ میں رہ گئے تھے عبداللہ بن جعفر اس کے پہلے سے مکہ جا چکے تھے اور وہاں وہ بیمار پڑ گئے تھے، اس لیے اُنھوں نے اپنے بدلے میں اپنے دونوں بیٹوں کو حسین

ع۵ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب

کے ساتھ گیا۔ایک روایت کے مطابق حسین اپنی ایک بیٹی کو بھی جو کہ بیمار تھی اپنے مکان پر چھوڑ گئے تھے جن کی تیمارداری حضرت ام سلمہ زوجۂ پیغمبر سے متعلق تھی اور ام ہانی بنت ابی طالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں۔بس ان کے علاوہ اولاد ابوطالب کے مردوں اور عورتوں میں سے کوئی بھی حسین کے ساتھ سے جدا نہیں رہا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسین کے ساتھ بنی ہاشم میں سوائے اولاد ابوطالب کے کسی اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا۔معلوم ہوتا ہے یہ سعادت قدرت نے ابوطالب ہی کے خاندان کے لیے مخصوص کی تھی کہ اسلام کی اس عظیم قربانی میں اُنہی کے مرد، عورتیں اور بچے حصہ لیں اور بس۔حسین کے طرزِ عمل سے آئینہ کی طرح صاف روشن تھا کہ وہ کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں اور اس لیے صرف اپنے گھر والوں کو جن کے وہ کفیل اور سرپرست ہیں اپنے ساتھ لیا ہے اور مدینہ میں کسی شخص کو یہاں تک کہ بنی ہاشم میں سے تمام عزیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی ہے۔اس سے ہر شخص حسین کے مقصد کو سمجھ سکتا ہے۔

عـ۵ "یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ مدینہ سے کس طرف ہجرت کرنا مناسب اور مفاد دینی کے لیے مفید تھا۔آپ کی پیش بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ بنی امیہ کو نہ حلال و حرام کی پروا ہے نہ ان کے دلوں میں شعائر اللہ کی عظمت باقی ہے۔وہ یقیناً خانۂ کعبہ پر بھی حملہ آور ہوں گے چنانچہ آپ اپنے لیے حرم کعبہ ہی نہیں بلکہ "حجر ہامہ" کو بھی مامن نہیں سمجھتے تھے ہاں اتنا ضروری ہے کہ جب کوئی حکومت بڑا اقدام کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔بالخصوص خانۂ کعبہ پر حملہ کرنا جو تمام عربی ذہنیت سے مستقل جنگ تھی۔اس کا جلد وقوع پذیر ہونا آسان نہ تھا۔بالخصوص ایام حج میں، کیونکہ تمام اطراف و جوانب سے لوگوں کا گروہ کا گروہ آتا ہے۔ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنا سخت بلوہ کا باعث ہو سکتا تھا رفتہ رفتہ بڑے سے بڑا جرم انسان کر سکتا ہے اور دوسرے بھی دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔بالخصوص اگر مذہبی رنگ میں رنگ دیا جائے

ے پرندوں کے گھونسلوں کے رہنے کا مقام ۱۲

عـ۵ مولانا نعمت امام صاحب پھلواردی

تو دوسرے بھی اس جرم کی طرف سبقت کرتے ہیں لیکن یکایک کوئی سخت جرم اس قسم کا کرنا سخت ہلاکت کا باعث ہوتا ہے ۔ اس لیے اگر کچھ دنوں کے لیے مامن ہو سکتا تھا تو فقط حرم کعبہ چنانچہ حضرت نے مکہ میں ورود فرمایا اور حرم میں پناہ لی حضرت کا مکہ میں ورود تمام عالم اسلامی کو ایک خاموش پیغام تھا جس نے نہ سننے والوں کو اتنا سنا دیا کہ حسین یزید کی خلافت سے جس کی بنیاد اثم و عدوان پر ہے سخت بیزار ہیں اور اس کی بیعت سے دستکش ہیں :-

سکوت ما است تمنا بیان ہر غم دل ہزار گفتن ما ہست در نگفتن خویش"

مکہ میں عرب کے قدیم روایات اور اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل جائز نہیں ۔ امام نے یہاں پہونچ کر اپنے تئیں ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گزارنے لگے ۔ نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمات مملکت سے کوئی تعلق ۔ آپ نے مکہ پہونچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف و جوانب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی دعوت دی یہ بھی آپ کے مقصد کے تعین کے لیے آپ کے کردار کا ایک اہم جزو ہے ۔ آپ کا مکہ میں ورود بروز جمعہ ۳ شعبان سنہ ۶۰ھ کو ہوا ۔ (ارشاد شیخ مفید ص۲۲۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ دن میں آپ مدینہ سے مکہ پہونچ سکے ۔ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ مدت بتلاتی ہے کہ رستا بہت تیزی سے قطع کیا گیا اور یہ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے ضروری بھی تھا ۔

آپ نے مکہ میں پہونچ کر "شعب علی" میں قیام کیا ۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہونچ چکے تھے ۔ ان کے مکہ میں اچانک پہونچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد حلقہ کیے ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل تھی ۔ لیکن حضرت امام حسین کے مکہ میں پہونچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسین کے گرد و پیش رہنے لگے ۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو گونہ ناگواری پیدا ہوئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حضرت حسین کی موجودگی میں کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا ۔ مصلحت وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسین کے پاس آنے جانے لگے ۔ (الاخبار الطوال ص۲۳)

جب امیر معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عقبہ بن ابی سفیان کی

حکومت تھی اور مکہ میں یحیٰی بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبید اللہ بن زیاد گورنر تھا (الاخبار الطوال ص۲۲۵)

حکومت دمشق کو معلوم ہوتا ہے کہ یحیٰی بن حکیم پر اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسین کے مکہ میں پہونچنے کے بعد یحیٰی بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ پھر جب ولید کے طرز عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہونچی تو ولید کے بجائے اس عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں آپ کو معلوم ہوگا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسین کے معاملہ میں یزید کا طرز عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اُسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے اور خود اُس کے گورنر اُس کے احکام کی تعمیل اُس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورت حال سے ظاہر ہے کہ عمال حکومت میں سے جو بھی حسین کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہلبیت کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ اس کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسین کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا۔ اُس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمال حکومت پر تھی؟!

اس وقت امام حسین کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد بن الحنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا۔ مکہ میں حالات کے ناساز گار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جایئے گا ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیئے گا یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اُس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجیے (طبری ج ۶ ص۱۶۱ و ارشاد ص۲۲۱)

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا سوا اس ایک پُر امن زندگی کے جسے "جیو اور جینے دو" ہی کی لفظوں سے

ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنے ساتھ کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر اور تحریر کسی صورت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی پھر بھی حالات کا تقاضا یکساں نہیں رہتا۔

کوفہ ع۱ "فرات کے مغربی کنارے پر یعنی مقام حیرہ سے تین میل کے فاصلہ پر ۱۷ھ مطابق ۶۳۸ء میں بسایا گیا تھا اس میں یمنی عرب آباد تھے اور یہ مدائن کا قائم مقام ہو گیا جو کہ اپنی خرابی آب و ہوا کی وجہ سے ترک کر دیا گیا جب سے اس کی بنیاد رکھی گئی اسی وقت سے یہ فوجی چھاؤنی کا کام دیتا رہا ہے۔" ع۲ اس کو فوجی چھاؤنی اس لیے بنایا گیا کہ سرحد ایران و حجاز و شام پر واقع تھا۔" اسی مصلحت سے حضرت علی بن ابی طالب نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور جمل، صفین اور نہروان میں حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ ہو کر آپ کے مخالفوں سے جنگ کرنے والے کوفہ ہی کے لوگ تھے۔ وہ آج کل کے محاورہ کے مطابق اگرچہ شیعہ نہیں تھے مگر "شیعۂ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے کو "شیعۂ علی" کہنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ وقت وہ تھا کہ کوفہ شیعیان اہلبیت سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر امیر معاویہ کا ممالک اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیاد بن ابیہ کی حکومت ہوئی، اُدھر اہل کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین اُن کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محبّ علی سمجھے جا سکتے تھے اُن کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام سناتا تھا۔ ابو الحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں اُس زمانہ کی مرقع کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دورِ حکومت میں سب سے زیادہ مصیبت میں اہل کوفہ تھے اس لیے کہ وہاں شیعیان علی کثیر تعداد میں موجود تھے وہاں کا حاکم زیاد بن سمیہ مقرر کیا گیا۔ اُس نے شیعوں کو پوری جستجو کے ساتھ گرفتار کیا اور جہاں پایا قتل کیا اور ہاتھ پاؤں قطع کئے اور آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں اور درختوں پر سولیاں دلوائیں اور عراق سے جلا وطن کیا، یہاں تک کہ کوئی نمایاں شخص اُن میں کا باقی نہیں رہا (نصائح کافیہ علامہ ابن عقیل حضرمی ص ۷)

اس صورت حال میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعۂ علی کے گروہ کے لیے کوئی نمایاں

ع۱ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ   ع۲ علامۂ ہندی مولانا سید احمد صاحب

حیثیت رہتی بلکہ مارے جانے، سعلی پانے اور جلاوطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستی اہلبیت کا نام بھی زبان پر لانا اپنے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کرتے تھے۔

یہ صورت حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس سال تک قائم رہی جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے اور بوڑھے فنا ہوگئے شیعیت ایک مخصوص قلیل التعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی اور وہ جماعت کوفہ کے اتنے بڑے شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ روسائے عشائر اور شیوخ قبائل ذمہ دار و باعتبار اشخاص سب حکومت وقت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دار و مدار ہوتا ہے وہ بلا استثنار ہر ملک میں "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رُخ پر اُڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ اُن میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی۔ اس کے نمونے حکومتوں کے تغیر و تبدل اور سلاطین کے عزل و نصب کی صورت میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی صورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک بیس سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر اُن کو سیلاب کی طرح کسی خاص طرف متوجہ کر سکے سنہ ۶۰ھ کے رجب کا وہ مہینہ تھا جب امیر معاویہ نے انتقال کیا اور اُن کا نامزد کردہ خلیفہ جانشین اُن کا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پرسکون فضا میں تموج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرۃً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید والی سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اُس کے اخلاق و عادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق و عادات، اُس کی مے نوشی اور شہوت رانی، اُس کی طفلانہ جوانی اور

لہو و لعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آ گیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پوچھ گچھ میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات و عادات کا شخص ہے۔

یقیناً اس کا نتیجہ تھا کہ ایک عام بے چینی و اضطراب اور نفرت و بیزاری کا جذبہ سینوں میں پیدا ہو گیا اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر ملت اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دلائے۔

اس کے ساتھ یہ خبریں بھی مشتہر ہوئیں کہ حسین بن علی نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اسی لیے مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستان علی کی اس جماعت کو جو بیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آ چکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے کشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھٹا میں امید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خودکشی کا مرادف ہو گا۔

یہ سوچ کر سلیمان بن صرد صحابی رسول کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ سن رسیدہ اور تجربہ کار سلیمان نے جو پیغمبر خدا کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ لڑائیوں میں شریک رہ چکے تھے مجمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:۔

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسین نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اور وہ مکہ معظمہ چلے گئے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے اور اُن کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہوں کہ اُن کی نصرت و مدد میں اور اُن کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہو گی تو بسم اللہ اُن کو خط لکھیے اور اگر سستی و کمزوری کا اندیشہ ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب دے کر اُس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔“

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کے فرض کو ادا کرتے ہوئے گرجتے برستے

الفاظ سے وقتی جوش کو برانگیختہ اور الفاظ کی طاقت سے رگوں میں خون دوڑا کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ خود مجمع سے اُس کے موجودہ جوش و ولولہ کی آخری تھاہ اور موقع اقدام پر اُس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُن کو موقع کی نزاکت اور آیندہ کے خطرات کا اندازہ کرا دینا بھی مقصود ہے مگر یہ امر فطری ہے، کہ جذبات کے طوفانی ہونے کے موقع پر انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں غلطی کر جاتا ہے مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اُٹھے، نہیں نہیں، ہم یقیناً اُن کے دشمنوں سے جنگ کرینگے اور اپنے تئیں حضرت کے قدموں پر نثار کردینگے۔

یہ جمعیت کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالیشان قصر کے وسیع صحن میں مجتمع نہوئی تھی بلکہ وہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آجتک عرستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صرد کے گھر میں مجتمع ہوگئی تھی۔

مذکورۂ بالا سوال و جواب اور اُس کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جوہر نظر آرہا ہے اور وہ بولنے والوں کے باطنی ضمائر کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن وہ آنے والے ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کرسکتے ہیں؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔

سلیمان بن صرد کی حجت تمام ہوچکی تھی۔ خط امام حسینؑ کے نام بدیں عنوان لکھا گیا:۔

"یہ خط ہے حضرت حسین بن علی کی طرف سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مومنین و مسلمین اہل کوفہ میں سے" اس کے بعد معاویہ کے انتقال اور یزید کی ولیعہدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے لہذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یکدل ہوسکیں اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہے مگر ہم اُس کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے، نہ عیدگاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہوجائے گی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اُس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کردینگے والسلام"

اس خط کو عبداللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے پہلا خط ہی جو امام کو مکۂ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔ جمعیت منتشر ہوی اور اب ہر ایک نے اپنے حلقۂ اثر میں اس تحریک کو پھیلانا شروع کیا اور ڈیڑھ ہی دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہوگئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ سب خطوط قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کیے گئے۔ اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی خلافت کے باعث عام طور پر پیدا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا، ان حضرات کی مذکورۂ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ نہ رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسین کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس خیال سے کہ یزید ایسے شرابخوار و فاسق سے وہ یقیناً بہتر ہیں، اس تجویز کے گرمجوشی سے موید نظر آنے لگے جس کو دیکھکر ان افراد کو جو حقیقتہً اس تجویز کے محرک تھے یہ یقین پیدا ہوگیا کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فریب نظر تھا، عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں ویسی ہی تھی جیسے آندھی کے رُخ پر اڑتے ہوئے پرندے اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط میں "شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی کرے" کے الفاظ بیم و رجا کا اظہار کر رہے تھے یا اب آخری خط میں یہ زوردار الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ "تشریف لائیے جلد اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہٰذا جلدی کیجیے جلدی والسلام" اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ذریعہ روانہ کیا گیا۔

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رُخ کا آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنھیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی مصلحت وقت یہ سمجھی کہ اسی آواز میں آواز ملادیں چنانچہ ان اجتماعی کارروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جا سکتا ہی، ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"کھیتیاں لہلہا رہی ہیں اور میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور تالاب لبریز ہیں۔ بس

جب آپ چاہیں تشریف لائیں ایک ایسے لشکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام"

اس پر سات آدمیوں کے دستخط ہیں شبث بن ربعی۔ حجار بن ابجر۔ یزید بن حارث یزید بن رویم۔ عزرہ بن قیس۔ عمرو بن الحجاج زبیدی۔ محمد بن عمیر تمیمی۔

یہ خط لب و لہجہ کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف ہے۔ اُن میں اپنی دوستی و اخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی۔ یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادی ذہنیت کی ترجمان اور دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاق طبیعت سے اجنبی اور ناشناس ہونے کی دلیل ہے۔

آپ کو بعد میں معلوم ہوگا کہ اس خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقعہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اُس موقع کی رائے عامہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہو کر آیندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنا دیں۔

گزشتہ تقریر سلیمان بن صرد کی اور اس کے بعد کے واقعات، ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور سے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) امام حسینؑ کا بیعت یزید سے کنارہ کشی کرنا اور مدینہ سے روانہ ہونا کسی خارجی تحریک اور اہل کوفہ کے ساتھ کسی مقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھا۔

(۲) حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

(۳) آپ نے مکہ پہنچنے کے بعد بھی خود کسی قسم کی تحریک اہل کوفہ سے نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔

مگر اب جس وقت کہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آئیے ہم آپ کی نصرت و امداد کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ کی ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو ایک آوازیں نہیں ہیں بلکہ آپ دیکھ چکے کہ کوفہ بھر یہی چلا رہا ہے چاہے، وہ دوست ہو یا دشمن

چنانچہ اُن چوں۵۴ خطوں کے بعد بھی جو صرف دو۲ دن کے عرصہ میں گئے تھے برابر خطوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ دو۲ خرجیاں خطوں سے بھر گئیں (الاخبار الطوال ص۲۳۲)
اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسین کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟
صورت حال آپکے پیش نظر ہے یعنی یہ کہ حضرت امام حسین یزید سے بیعت جیسا کہ ابتک نہیں کی، آئندہ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر کہ یا بیعت کی جائے آپ یا قتل ہوں، ناممکن ہوچکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تابکے؟ ع۵ "اوّل تو یزید کے لیے کوئی چیز متبرک تھی ہی نہیں اور اُس کے شریر اور لامذہب مشیران کار شیطانی سازشوں کے پورا کرنے میں مطلق العنان تھے۔ ایک نے اُن میں سے صاف طور پر کہدیا تھا کہ اگر اُن کے مقاصد کی مہم کے لیے ضروری ہو تو وہ مکہ کی دیواروں کو ڈھا دینگے اس کے علاوہ مکہ حسین کے لیے کوئی بہت سازگار مقام نہ تھا اس لیے کہ اگرچہ بہت سے اُس کے باشندے بہت جوش کے ساتھ آپ کے پیچھے پیچھے رہتے تھے مگر آپکے ایک مدّمقابل وہاں موجود تھے ابن زبیر جنھوں نے اپنے کو آپ سے پہلے اُس مقدس شہر میں پہونچا دیا تھا۔ ابن زبیر نمائشی ہمدرد تھے لیکن وہ حسین کے طولانی قیام کے خیال کو اُس شہر میں جہاں وہ لیڈر بننا چاہتے تھے پسند نہیں کرتے تھے۔"
پھر جبکہ یہ خطرہ موجود ہے کہ مکّہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکّہ میں آپ پر فوج کشی ہو اور مکّہ کے اندر کوئی ایسی جماعت نہیں جو آپ کی حمایت پر سچّے دل سے متفق ہو تو اس صورت میں آپ مکّہ میں قیام کرکے مکّہ کے اندر خونریزی کے باعث خود ہوں کس لیے؟ رسول کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہوچکی ہے مگر طائف ہو یا یمن۔ بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔
اس موقع پر عرب کے آباد ترین خطۂ ملک (عراق) اور اُس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ ہمارے یہاں آئیے اور ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں

ع۵ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب (ٹر یجڈی آف کربلا)

اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ ایک دو اور دس بیس سے گزر کر پچین عرضداشتیں بلکہ دو خریطہ جین بھر کے خطوط اور پانچ قاصد یکے بعد دیگرے روانہ ہوتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص ہیں جن کی محبت پر آپ کو پورا بھروسا ہو جیسے حبیب بن مظاہر۔ سلیمان بن صرد رفاعہ بن شداد وغیرہ۔ اس صورت میں یہ نہ دیکھو کہ بعد میں ہوا کیا کیونکہ وہ تو بعد کے وقتی اسباب کا نتیجہ ہی تم اس امر سے بالکل خالی الذہن ہو کر بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ بعد والے واقعات ابھی نہیں ہوئے ہیں، یہ غور کرو کہ موجودہ حالات میں امام حسین کو کیا کرنا چاہیے؟

یہ بھی دیکھنا چاہئیے کہ ع ؎ "جہاں کوفیوں کے بیسیوں معائب ہیں وہاں کچھ محاسن بھی ہیں جن کو نظر انداز کر دینا انصاف کے خلاف ہی ؎ عیب من جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔

کوفہ کا مردم خیز خطہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں فتح ہوا اور بہت جلد اسلامی رنگ میں رنگ گیا۔ نقد و تحقیق مسائل اس کے ضمیر میں داخل تھا چنانچہ سب سے پہلے اس کی طرف سے جو شکایت دربار فاروقی میں پیش ہوی وہ یہ تھی کہ سعد بن ابی وقاص کو نماز پڑھانا نہیں آتی ہی۔ اس کے علاوہ جو گورنر جاتا تھا اُس کے افعال و اعمال پران کی برابر انتقادی نگاہ رہتی تھی۔ کسی حال میں یہ چیز نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ کیا وجہ تھی کہ اہل کوفہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ امام کو دعوت دی جائے اور آپ سے بیعت کی جائے یہی خیال اہل مکہ یا اہل مدینہ کو کیوں پیدا نہیں ہوا۔ امام کے پاس کوفیوں کے سیکڑوں خط آئے۔ کوفیوں نے اٹھارہ ہزار کی تعداد میں بیعت کی۔ یہ تمام چیزیں مکہ پہونچتی رہیں۔ بایں ہمہ کسی مکی کو یہ توفیق نہ ہوی کہ حضرت سے بیعت کرے۔ ہاں مشورہ دینے کے لیے پوری دنیا تھی۔

یہ تو کہا جا ہی نہیں سکتا کہ کوفیوں نے کسی سازش کے ماتحت یا قصداً فریب دینے کے لیے دعوت دی تھی۔ ہاں یہ درست ہی کہ اُنھوں نے دعوت دینے سے پیشتر اپنی قوت و ثبات قدم کا اندازہ نہیں کر لیا۔ نہ غور کیا کہ ہم کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں جان کا ہدیہ پیش کرنے کی ہم میں ہمت ہے یا نہیں۔ چونکہ اُن کی عقل غبار عناد سے پاک تھی اور وہ سمجھے ہوے تھے کہ اسلام کی مرکزیت کس سے وابستہ ہوسکتی ہے، اس بنا پر اُنھوں نے

؎ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی

دعوت نامے بھیجنا شروع کر دیے۔ اگرچہ اُن میں خاص خاص افراد کے سوا عام افراد میں ہمت و شجاعت نہ تھی اور وہ قول پر جان دینا نہیں جانتے تھے مگر دنیا میں ایسے جان دینے والے کئے ہوتے ہیں؟!

بہر حال سوال یہ ہے کہ کیا امام حسین کے لیے جائز تھا کہ اُن کی دعوت مسترد کر دیتے اور محض سابق تجربات کی بنا پر غدار و کذاب سمجھ کر کسی دوسری طرف کا قصد کرتے؟ کسی کے ضمیر پر حملہ کرنا ہرگز کسی مذہب میں جائز نہیں اور قرآن کا سورۂ عبس گواہ ہے کہ طالب کو ٹھکرا دینا روا نہیں ہے۔ صحاح میں ہے کہ ایک بزرگوار صف جنگ میں مسلسل قتل کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جب ایک کافر کے سر پر پہنچ گئے جس کا اس وقت کوئی مددگار نہ تھا۔ غریب فوراً کلمہ پڑھنے لگا مگر بزرگ موصوف نے اس کا کام تمام ہی کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے سخت بازپرس کی۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اُس کا دل چیر کر کے دیکھا تھا؟! اُس کے بعد فرمایا "اے پروردگار میں اس شخص کے فعل سے بری ہوں"۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کوفیوں کی دعوت پر لبیک کہنا مذہبی فرض تھا۔ بلاشبہ اُن لوگوں کے اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے جو حق کو پہچانتے ہوں۔ بخلاف اُن کے جو حق کو پہچانتے ہی نہ ہوں"۔

اگر آپ غور کیجیے تو پورا اندازہ ہو جائیگا کہ مکہ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت امام حسین کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی ضرور جیسے عبداللہ بن زبیر پر اُسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کئے گئے۔ اُسی طرح آپ پر بھی اسی مکہ میں فوج کشی ہوتی اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا لیکن کیا اس وقت جبکہ کوفہ سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جا چکی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا اور آپ اس دعوت و مطالبہ کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کرتے اور وہاں شہید کئے جاتے تو یہی لوگ جو اس وقت حضرت امام حسین پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کوفہ کیوں گئے؟ یہی یہ کہنے نہ اُٹھ کھڑے ہوتے کہ کون سی عقلمندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدۂ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد کی نصرت کر چکے تھے آپ کی محبت کا دم بھرتے تھے

اور اس وقت بجان ودل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سیکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ کی تشریف آوری کی خواہش کر رہے تھے۔ اتنے نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب وگیاہ، جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ وبے اُمنگ اور جہاں کی فضا بے مہرومحبت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ قتل بھی ہوئے اور مکہ معظمہ کی حرمت بھی برباد ہونے کے باعث ہوئے۔ کیوں! کیا یہی کہا نہ جاتا؟ بے شک یہی کہا جاتا اور یقیناً حالات کی بنا پر حق بجانب کہا جاتا اس لیے کہ موجودہ حالات میں عقل وتدبر کا اقتضا یہی ہے کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ ہوں تب بھی اُن پر اتمام حجّت کی جائے۔

معلوم ہے کہ تھے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ عراق والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کئے ہوئے تھے کہ کیا مکہ معظمہ میں آپ کا قیام قتل ہونے سے آپ کو بچا دے گا؟ بلکہ حقیقتہً اگر موازنہ کیا جائے تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں قتل ہونا یقینی اور کوفہ کی طرف روانگی کی صورت میں مشکوک، اس لیے کہ اہل کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اُن کے ذاتی اُفتادِ طبع کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی ہے۔ اس صورت میں اگر آپ مکہ میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے ہوئے، نوعِ انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق ومروّت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصُول پر بحدّ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے تئیں مکہ سے علیحدہ کر کے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی لیے وہ لوگ جو آپ کو عراق جانے سے مانع ہوتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ، اُن کے جواب میں آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے

اور وہاں میں اگر جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کرینگے۔ ہرگز نہیں بلکہ آپ نے زیادہ تر عراق کے متعلق اُن کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور سے قائم رہنے کا اظہار کیا ہے (الاخبار الطوال ص۲۴۳) اور کبھی صاف کہدیا ہے کہ میں یہاں بھی رہوں گا تو قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ مینڈھا بننا نہیں چاہتا (طبری ج ۶ ص۲۶۷ و صواعق محرقہ ص۱۱۷)

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد آپ نے اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمایئے اور باہر نہ جایئے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا "خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل ہوں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھکو وہاں سے باہر لے آئیں گے یہاں تک کہ جو چاہتے ہیں میرے ساتھ وہ سلوک کریں خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کرینگے جس طرح یہود نے روز شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا (طبری ج ۶ ص۲۶۷)

ان وجوہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یقیناً آپ کے لیے کوفہ تشریف لے جانے کی ضرورت تھی اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب تھا۔ بے شک چونکہ عــہ "گزشتہ تلخ تجربوں کی وجہ سے کوفیوں پر اعتماد کرنا مشکل تھا اس لیے آپ نے پہلے اپنے چچا زاد بھائی مسلم کو بھیجا کہ اُن کے دل ٹٹولیں اور حقیقت حال سے اطلاع دیں" ان کے ساتھ آپ نے ایک تحریر بھیجی جس کا مطلب یہ تھا کہ "ہانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر پہونچے اور یہ دونوں شخص تمہارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں، آپ آیئے، شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کردے۔ اچھا تو میں تمہاری جانب اپنے بھائی اور چچا

عــہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

کے بیٹے اور اپنے محل اعتماد عزیز قریب کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھکو تمھارے حالات سے اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمھاری جماعت اور اہل حل وعقد اُس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمھاری طرف آتا ہوں اور امام کے کوئی معنی نہیں سوائے اُس شخص کے جو کتاب الٰہی پر عامل ہو اور عدالت کا پابند اور حق کا متبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی پر وقف کئے ہوئے ہو والسلام (طبری ج ۶ ص ۱۷۹-۱۹۸)

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مُسلم بن عقیل جنگ پر مامور نہ تھے اور نہ کوفہ کی تسخیر کے لیے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ کوفہ کی رائے عام اور وہاں کے لوگوں کے حالات وخیالات کا حضرت امام حسین کے متعلق اندازہ کرکے آپ کو اُس سے آگاہ کریں۔ یہی مُسلم کے طرزِ عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ کوفہ گئے تو حاکم دارالامارہ میں موجود تھا مگر مُسلم نے اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر شورش کرنا ہوتی تو پہلا کام یہ ہونا چاہیئے تھا کہ دارالامارہ پر قبضہ کیا جائے مگر مسلم نے کیا کیا؟ صاف اس بات کا مظاہرہ کہ ہمیں تمھاری سلطنت سے مطلب نہیں، تمھاری حکومت سے کوئی غرض نہیں ہے ہمیں صرف طالبان ہدایت کی تلاش ہے اور اُن کی مذہبی واخلاقی اصلاح مدِنظر ہے۔

مُسلم کے ورودِ کوفہ کے موقع پر طبری اور دوسری مستند تاریخوں نے جو حالات درج کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بن صرد خزاعی کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ ضرور جناب مسلم اُن ہی کے مکان پر قیام کرتے جبکہ وہ اس تحریک کے روحِ رواں اور قائد اعظم اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحب وجاہت اور ذی اثر تھے۔ مجبوراً آپ نے مختار بن ابی عبیدہ کے گھر میں قیام کیا (اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی صدی ہجری تک باقی تھے چنانچہ ابوحنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ اب یہ گھر " دارِ مسیّب " کے نام سے مشہور ہے (الاخبار الطوال ص ۲۳۲)

کوفہ میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی اور لوگ آپ کے پاس ملاقات کے لیے آنے لگے جب کافی مجمع ہو گیا تو مسلم نے امام کا خط جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس سے حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے اور عابس بن ابی شبیب شاکری نے کھڑے

ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا " مجھکو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہار رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم میں جس وقت بھی آپ دعوت دینگے لبیک کہتا ہوا حاضر ہوں گا اور آپکے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کروں گا اور اس وقت تک شمشیر زنی کروں گا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کروں اور میرا مقصد اس سے سوائے رضائے پروردگار کے کچھ نہ ہوگا "

یہ تقریر ختم ہوناتھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے " مرحبا جزاک اللہ کتنی مختصر لفظوں میں تم نے حقیقت حال کو واضح کیا ہے " پھر حضرت مسلمؑ کی طرف خطاب کر کے کہا " خدا کی قسم میرا بھی ذاتی خیال وہی ہے جو عابس بن ابی شبیب نے اپنی لفظوں میں ادا کیا " ایسی ہی لفظوں میں سعید بن عبداللہ حنفی نے تائید کی اور مجمع متفرق ہوا۔ خط کے مضمون کی بنا پر اس کارروائی کا مقصد ظاہر ہے یعنی یہ عہد و پیمان اس غرض سے تھا کہ مسلمؑ کوئی جارحانہ اقدام کرنا چاہتے ہیں اور اس میں یہ لوگ مسلمؑ کی اعانت کرینگے اور نہ اس وقت یہ خیال کسی دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ چند ہی روز میں تن تنہا مسلمؑ کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیئے بلکہ یہ عہد و پیمان صرف امام حسینؑ کی تشریف آوری کی پیش نہاد اور اس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیات کے اندازہ کے لیے تھا۔

مسلمؑ بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو گئی اور اس فضا کے لحاظ سے جو اس تحریک یعنی امام حسینؑ کو دعوت دینے کے متعلق ابتدا ہی سے کوفہ میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے اسباب وضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا بقول شخصے خلقت بھیڑیا دھسان ہوتی ہے۔ جدھر ایک چلا اُدھر سب۔ یزید کی خلافت سے بسبب اُس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف حسینؑ بن علیؑ کی ہردلعزیزی نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلمؑ بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے اُن کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور

"کل جدید لذیذ" کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت ہوتی ہے وہ چوتھی جاذب ان تمام باتوں کا مل کر یہ نتیجہ تھا کہ حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستانِ علی تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آلِ زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی میں مشغول رہے اور دست و پا سر و زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا کوفہ میں بیس ہزار کی تعداد میں علی کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ اور جب یہ نہیں تو کیا مذکورۂ بالا سطحی اور عارضی اسباب سے جو رائے عام ہموار ہوئی ہو اُس میں کوئی وزن یا ثبات و استقرار ہو سکتا ہے؟

بے شک جب اُس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عام کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہے سہے، پروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو مسلم بن عقیل کو جنھیں اس شہر کے حالات کا تجربہ بھی حاصل نہ تھا صورتِ حال کی تشخیص میں دھوکا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے۔ اُن کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جانبازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عام کو ہموار کرکے مسلم کی نصرت و بیعت پر آمادہ کرنے والے بے شک سب سچے خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور اُن کا کام یہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں اُن کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن آئندہ کے انقلابات کو کوئی دوسری صورت پیدا نہ کرینگے، اس کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی۔ بے شک اُنھوں نے اپنے اقراروں اور عہدِ جانبازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا کے کر دکھایا جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیئے۔

مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے، اس لیے امام حسین کو خط لکھدیا کہ کوفہ آپ کے ساتھ ہے تشریف لائیے۔ مقامی حکومت کا طرزِ عمل اُن کی نسبت روادارانہ تھا نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر کہدیا کہ مجھے مسلم کے آنے کا علم ہے مگر میں جب تک کوئی جنگی اقدام میرے خلاف نہ ہو اُس وقت تک کوئی جارحانہ اقدام نہیں کروں گا۔ کوفہ میں یہ خبر گرم ہے کہ اب بہت جلد ہی حسین بن علی تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی ہے اور حلقہ حلقہ جماعت جماعت لوگ بیٹھ کر اس مسئلہ پر اظہارِ خیالات کرتے ہیں

اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ ہیں لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ کوفہ کے اندر ایک جماعت موجود ہے جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تلی ہوئی ہے اور وہ اموی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ ہیں جنھیں حسین بن علی کے اقتدار کے بعد اموال خلق پر بیجا تصرفات کا حق باقی نہ رہے گا ان ہی کی جانب سے خفیہ کارروائی یہ ہوئی کہ یزید سے حاکم حال کو معزول کر کے ایک مدبر اور سفاک حاکم کا مطالبہ کیا گیا۔ وہاں سرجون غلام یزید کے مشورہ سے قرعۂ فال عبیداللہ بن زیاد کے نام نکلا۔ عبیداللہ کوئی اور نہیں، زیاد کا بیٹا اور معاویہ کا ایک معنی سے بھتیجا ہے اور یہ خاندان وہ ہے جس پر حیلہ و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کی کہ اُس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغۂ راز میں رکھا تاکہ اُس کا ورود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر راستے میں جبکہ کوفہ نزدیک رہ گیا اُس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کر کے ایک سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور چہرہ پر اُسی طریقہ سے جو عرب قوم کے بہادروں کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھاٹا باندھ لیا جس کی بنا پر شناخت ناممکن ہو گئی۔ ایک مرتبہ شہر پناہ کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک رئیس قوم پورے وقار و تمکنت کے ساتھ، سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اُس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و لجام، ساز و سامان سے آراستہ۔ اس حشم و خدم کو دیکھکر اُن توقعات کی بنا پر جو قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا یعنی ہر شخص یہی سمجھا کہ حضرت حسین بن علی تشریف لائے ہیں اور اُس قائم شدہ اثر کی بنا پر جو دلوں میں تھا جس جماعت کی طرف سے عبیداللہ کا گزر ہوتا تھا وہ بہ نظر تعظیم کھڑے ہو کر آداب بجا لاتی تھی اور "خوش آمدید" کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی تھی کہ مرحبابك یابن رسول الله قد مت خیر مقدم ابن زیاد کسی کو کچھ جواب نہ دیتا تھا بلکہ آوازوں کو سُنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل و شمائل کو پہچانتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہو گیا اور لوگ اشتیاق میں گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص بخیال خود فرزند رسول کی تمنائے زیارت میں آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہونچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس وقت مُسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا پکار کر کہا "رستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبیداللہ بن زیاد ہیں"

نہ معلوم ان الفاظ میں کون سا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اُٹھتے ہوئے ہاتھ اور مسرت آمیز ترانے سب موقوف ہو گئے۔ سناٹا سا چھا گیا اور مجمع تتر بتر ہوا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دارالامارہ میں پہونچا ہی تو دس آدمیوں سے زیادہ اُس کے ساتھ نہ تھے (طبری ج ۶ ص ۲۰۰-۲۰۱)

اب ذرا فطری رجحانات پر غور کرتے ہوئے اہل کوفہ کے موجودہ باطنی اضطرابات کا اندازہ کیجئے۔ ایک تو اچانک حادثہ جو غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہو وہ خود سنسنی پیدا کر دیا کرتا ہے اُس پر یہ صورت حال کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے خلاف جاسوسی کے فرض کو ادا کیا یعنی اپنے باطنی خیالات و جذبات اور حسین بن علی کے ساتھ خلوص عقیدت کو خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود پیش کر دیا۔ اور ابن زیاد نے صاف ایک ایک کے چہرہ اور آواز کو پہچان رکھا ہے اور ابن زیاد وہ ہی جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، جلاد کے ہاتھ سے سر کو قلم کرا دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزا و اقارب کے لیے پیش نظر ہیں، کیا یہ وجوہ ایسے نہ تھے جن کی بنا پر دل و دماغ معطل، قوائے عمل سلب اور طاقتیں مضمحل اور ہمتیں پست ہو جاتیں اور اُن پر عظیم خوف وہراس کا غلبہ ہو جاتا۔

عربستان میں اب تک یہ طریقہ موجود ہے کہ بڑے شہروں میں ہر محلہ کا ایک مختار محلہ ہوتا ہے جو اُس محلہ کی مردم شماری، وارد و صادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ و غیر شادی وغیرہ امور کے تشریحات کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص اُس محلہ سے کسی جرم کا مرتکب ہو یا کہیں مفرور ہو تو اُس کی جواب دہی اور سراغ رسانی کی ضمانت بھی اُسی سے تعلق رکھتی ہے۔

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہدیدی تقریر کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ کہ تمام محلات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص اور جن سے عرافت یعنی مختاری محلہ کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلہ کی مردم شماری اور جو لوگ نووارد ہیں اُن کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہی، اُن کے نام ادارہ حکومت محلیہ میں پیش

کردیئے جائیں اور وہ کسی وجہ سے ان باتوں کے تفصیل وار لکھنے سے معذور رہوں تو ضمانت داخل کریں کہ ان کے محلہ میں کوئی متنفس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اس کے خلاف ظاہر ہوا تو اُس مختار محلّہ کو فوراً اُس کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اُس کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا (طبری ج ۶ ص۲۰۱)

یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی مشتبہ ہو۔ کوفہ کا چپہ چپہ جواسیس مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ اب ہر شخص خاص اپنے محلّہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا بھی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرارداد طے کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہ پہلا وقت تھا کہ مسلم بن عقیل کو اپنی جان کے خطرہ کا اندازہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہوا۔ اب اُن کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ وہ حفاظت خود اختیاری کے اصول پر جہاں تک مقدور ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے اُنھیں مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس میں وہ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ نظر آیا اس لیے کہ اُن کا قیام وہاں مشتہر ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی وقت آئے تو وہاں اُن کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے اور پھر وہ آنے والے واقعات سے بے خبری کی حالت میں چند روز سے اپنے موضع پر گئے ہوئے تھے (طبری ج ۷ ص۵۸)

لہٰذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ وہ غیر معلوم طریقہ پر ہانی بن عروہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ یہ قبیلۂ مراد و مذحج کے سردار تھے اور جب نکلتے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ہمراہ رکاب چلتے نظر آتے تھے۔

مسلم نے ہانی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے تئیں بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں ڈال دیا جو اُن کے حفظ جان و آبرو کی بہترین ضمانت ہو سکتی ہے۔

ہانی نے مسلم کو مخفی طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوائے مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس راز کی اطلاع نہ دی۔

دوستانِ اہلبیت کو جو اس تحریک کے بانی تھے اپنی ناکامیابی کا منظر سامنے نظر آگیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کرنے لگے۔ بے شک اب نقطۂ نظر بالکل بدل گیا تھا۔ اس کے پہلے امام کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پُرامن نمائندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسین کے لیے عہد وفاداری کا استوار کرنا تھا چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہی کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب خود مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلانے کی ذمّہ دار ہے اُس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُس ہدایت نامہ سے آگے ہی جو مسلم کو امام حسین کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورتِ حال ہی جس کے لیے مسلم اور جماعت کوفہ کو بہرحال مناسب طرزِ عمل اختیار کرنا لازم ہے۔ چنانچہ مسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور ابو ثمامہ صائدی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمّہ دار رہے۔

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے پناہ کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اُس نے مسلم کی سراغ رسانی کے لیے اپنے غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ مکر و فریب کے ساتھ مسلم کا پتہ چلائے معقل اس فکر میں مسجد جامع میں آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ مسلم بن عوسجہ جو اُس وقت اُس مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے مسلم بن عقیل کے نمایندۂ خاص ہیں اور اُن کی طرف سے حسین بن علی کی بیعت لیتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے وہ مسلم بن عوسجہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا کہ میں شام کا رہنے والا ہوں ذوالکلاع کا غلام ہوں اور خدا کے فضل سے اہلبیت رسول کا دوست ہوں مجھے معلوم ہوا کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ آج کل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسولِ خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں۔ مجھے تمنا پیدا ہوئی کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور یہ تین ہزار درہم جو میرے پاس ہیں انکی خدمت میں نذر کردوں مگر اب تک کوئی ایسا شخص نہ ملا جو مجھے اُن کی خدمت میں پہونچائے یا اُن کا پتہ بتائے ابھی میں اس مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے کچھ مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا

کہ آپ کو اس خاندان کے لوگوں سے واقفیت حاصل ہے۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ یہ روپیہ مجھ سے لے لیجئے اور مجھے اُن بزرگ کی خدمت میں لے چلیے کہ میں اُن سے بیعت کروں اور اگر آپ چاہیں تو اُن کے پاس جانے سے پہلے یہیں مجھ سے بیعت لے لیجئے۔ یہ مکارانہ تقریر تھی جس کو صاف دل اور نیک نیت مسلم بن عوسجہ نے حقیقت پر محمول سمجھا اور جواب دیا "مجھے تمھاری ملاقات سے بہت خوشی ہوئی اور اس بات سے اور زیادہ مسرت حاصل ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور تمھارے ذریعہ سے اہلبیت رسول کو کچھ تقویت حاصل ہوگی۔ بے شک اس کا افسوس ہے کہ میری کارگزاریاں اس معاملہ میں نشوونما پانے کے پہلے ہی تمھارے کانوں تک پہونچیں جس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو جائے" بہرحال کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور رازداری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ نے اقرار کیا کہ میں چند روز میں تمھارے لیے مسلم بن عقیل سے اجازت حاصل کر لوں گا۔ چنانچہ معقل اس کے بعد چند روز تک برابر آتا جاتا رہا یہاں تک کہ مسلم بن عوسجہ کے ساتھ جناب مسلم کے پاس پہونچا۔ اور آخر ابن زیاد کے پاس خبر پہونچائی جس کی بنا پر ابن زیاد نے ہانی بن عروہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔ ہانی کو اُن تحفظات پر جو اُنھوں نے مسلم بن عقیل کے اخفا میں کر لیے تھے پورا بھروسہ تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر اُن کے دل میں کسی طرح کا اندیشہ نہ گزرا اور نہ اُنھوں نے اس موقع پر اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی بلکہ خود تن تنہا ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ راز منکشف تھا اور واقعہ سے انکار بے سود اور اقرار کے بعد اپنے مہمان کو حوالے کر دینے سے انکار باعث اشتعال۔ آخر بوڑھے لیکن بات کے پکے ہانی کا سر و چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہو گیا اور ابن زیاد کے حکم سے وہ قیدخانہ بھیج دیئے گئے۔ بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی تھا۔ اُسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذحج کے بہت سے زرہ پوش سوار لے کر دارالامارہ پر چڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے ہانی کے دل میں رہائی کی توقعات پیدا کر دیے لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمائش اور

اس کہنے سے کہ ہانی قتل نہیں ہوے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظربند کر دیے گئے ہیں، وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے۔

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ اُن کا پناہ دینے والا، وفادار اور مستقل مزاج بہادر ہانی بن عروہ اُن کی وجہ سے زدوکوب کی توہین آمیز تکلیف برداشت کرکے دشمن کے قیدخانہ میں ہے۔ اور مسلم کے گرد گھر میں خاندان مراد کی عورتیں نالہ و شیون کر رہی ہیں۔ کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے ہوے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں اُن کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابل اعتماد شخص کے یہاں جاکر مخفی ہو جاتے؟ لا الٰہ الّا اللہ! غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مسلم کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا۔ اور کوئی قرارداد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اُس وقت کھڑے ہو گئے جب اُن کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زدوکوب کے بعد قید کیے گئے ہیں (طبری ج ۷ ص ۵۸)

واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ ۱۸ہزار بیعت کرنے والے سب ایک دم میں مسلم کے گرد جمع ہو جاتے اور جنگ میں اُن کے ساتھ شرکت کرتے اور پھر جبکہ کوفہ کے محلّے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ محلّہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا کافی وسعت رکھتا تھا اور اُسی کے اطراف میں مسلم کے گرد اگرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جونہی یا منصور امت کا نعرہ بلند کیا گیا جو پہلے سے قرارداد کے مطابق اُن کا شعار یعنی امتیازی نعرۂ جنگ تھا تو اُس وقت شرما شرمی وہ چار ہزار آدمی مسلم کے پاس جمع ہو گئے لیکن اُس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہونگے اس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر ہے۔

ابھی مسلم قصر دارالامارہ تک پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ واپس جانا شروع ہو گئے اور پہونچتے پہونچتے صرف تین سو (۳۰۰) رہ گئے لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ

کوئی بڑی جمعیت ہے، قصر کے اندر قلعہ بند ہو گیا اور مسلم نے بنی مراد کی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آتے گئے یہاں تک کہ مسلم کے پاس کافی اجتماع ہو گیا اور ظہر سے شام تک برابر زد و خورد ہوتی رہی۔

موجودہ جمعیت کہ جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں شریک ہے مختلف قبائل کے مخلوط مجمع کا نام ہے اور قبائل کی روح شیوخ و اشراف قبائل ہیں کہ جو ہمارے سابقہ بیانات کے مطابق حکومت کے ہوا خواہ اور پابند فرمان ہیں اور ابن زیاد نے بروقت پیش بندی یہ کی ہے کہ آج صبح سے شیوخ و اشراف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا ہے کہ ان سے حسب موقع کام نکالا جا سکے۔

اب ابن زیاد نے پہلی تدبیر تو یہ کی کہ شہر کی ناکہ بندی کرا دی یعنی چوراہوں اور عام رستوں پر پہرے بٹھلا دیے کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آ سکے اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ امر لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ نہ آتے بلکہ اکا دکا جس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا چنانچہ عبد الاعلیٰ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لیے آ رہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محلہ بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلخب ازدی نے ہتھیار جسم پر آراستہ کر کے چاہا تھا کہ مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن اشعث نے گرفتار کر لیا یہ دونوں جانباز مسلم و ہانی کی شہادت کے بعد ابن زیاد کے حکم سے قتل کر ڈالے گئے (طبری ج ۶، ص ۲۰۶)

اس طرح مسلم سے مختلف اطراف و جوانب کی مدد قطع ہو گئی۔ دوسری جانب اشراف قبائل کو مجمع کے منتشر کرنے کے لیے حکم دیا عـه "چنانچہ بعض لوگ قصر پر چڑھ گئے اور لوگوں کو ڈرانا شروع کیا۔ کچھ لوگ قصر کے عقبی دروازہ سے باہر نکل گئے۔ گلیوں میں جا جا کر شور و ہنگامہ برپا کر دیا۔ عورتوں کو خبر دی کہ تمام لوگ قتل کر دیے جائیں گے، ابھی شام سے فوج آنیوالی ہے۔ نادان عورتیں گھر سے باہر نکل پڑیں اور اپنے اعزا کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر لے جانے لگیں۔ بہت سے لوگ عورتوں کو باہر دیکھ کر گھبرا گئے اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے صرف تیس ۳۰ آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جا کر نماز مغرب پڑھی

عـه مولانا نعمت امام صاحب

نماز کے ختم ہونے کے بعد وہ بقیہ تیس ۳۰ بھی چلے گئے۔ اب حضرت مسلم تنہا بازاروں میں پھرنے لگے، ایک عورت اسید حضرمی کی منکوحہ طوعہ نامی سے پناہ مانگی۔ وہ آپ کو اپنے گھر لے گئی۔ جب ابن زیاد نے دیکھا کہ خطرہ بالکل نہ رہا تو لوگوں کو حکم دیا کہ سائبانوں میں دیکھیں، کہیں ابن عقیل کے ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ اس طور پر مزید اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشا کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر میں مسجد میں کثیر انسانوں کا ہجوم ہو گیا۔ اقامت کہی گئی اور ابن زیاد نے اپنے داہنے بائیں محافظ کھڑے کر دیئے۔ اس کے بعد نماز کی امامت کی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت و دشمنی کا ہنگامہ اُٹھا رکھا ہے تم نے دیکھا۔ جس کے گھر ہم ابن عقیل کو پائیں گے اُس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ اور جو انھیں ہمارے پاس لائیگا اُس کو اُن کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ اس کے بعد حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے اور لوگوں کو عمرو بن حریث کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا طوعہ کا لڑکا بلال جو مسجد سے گھر آیا تو دیکھا ماں گھر کے ایک کمرے میں بار بار آتی جاتی ہے۔ اس کو شبہ ہوا، پوچھا کہ واقعہ کیا ہے۔ ماں نے پہلے تو چھپایا لیکن جب یہ بضد ہوا تو قسمیں لینے کے بعد حقیقت ظاہر کر دی کہ ابن عقیل کو میں نے پناہ دی ہے وہ رات بھر تو خاموش رہا صبح ہوتے ہی ابن زیاد کے لڑکے عبدالرحمٰن کو خبر دی اُس نے فوراً باپ کو خبر پہونچائی۔ ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کر دی "۔ تن تنہا مسلم اور اتنا انبوہ کثیر۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم اپنی خاندانی شجاعت کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد زخمی ہوے اور ایک گڑھے میں جسے خس پوش کر دیا گیا تھا گرا کر گرفتار کر لیے گئے۔ جب مسلم گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس لائے گئے ہیں تو اس وقت جو گفتگو ہوئی ہے وہ ملاحظہ کیجئے اور دیکھیے کہ مسلم پر جو بغاوت کا الزام عائد کیا گیا اُس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں ابن زیاد نے کہا "ابن عقیل تم یہاں آئے ہو لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور اُن میں آپس میں فساد کرانے کہ ایک

جماعت دوسری جماعت پر حملہ کرے اور خانہ جنگی ہو۔" مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک اقدام حسینی کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نہیں، میں اس لیے تو نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تیرے باپ نے اُن کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور اُن کے خون بہائے اور اُن میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے اس لیے کہ اُن کی اخلاقی اصلاح کریں اور عدالت و انصاف اور تعلیمات قرآن پر لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں"۔

واقعتہً مسلم کا کوئی طرز عمل اُن کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ صفائی اُن کے جرم بغاوت سے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کیا کام دیتا ہے۔ آخر مسلم بن عقیل عـہ "دوشنبہ ۹ ذی الحجہ ۶۰ھ ۱۱ ستمبر ۶۸۰ء کو قتل کر دیے گئے"۔

اب شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنا خطرناک سمجھتے تھے اور اس لیے چاروں طرف سناٹا اور ہو کا عالم تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

انتہا ہے کہ وہی ہانی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کی غلط خبر سننے پر دارالامارہ کھنچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آگیا تھا آج مشکیں کسے ہوئے بازار میں لائے جا رہے ہیں اور وہاں پکار رہے ہیں کہ کہاں ہیں میرے قبیلہ والے بہادر بنی مذحج ہائے افسوس آج میرے لیے مذحج نظر نہیں آتے لیکن کوئی ایک متنفس بھی ان کی طرف رُخ کرتے نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ابن زیاد کا ترکی غلام اپنی تلوار سے اُن کے سر و تن میں جدائی کر دیتا ہے۔

یہ سب یہاں ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع بر وقت مکہ میں کیسے پہنچ سکتی تھی۔ حضرت امام حسین کو مسلم کا خط پہنچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے، سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یقینی اس خط کے پہنچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کی روانگی ضروری ہو گئی تھی

عـہ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود پھر بھی حج کو ترک فرمادیں اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متوقع عجلت یقینی کچھ ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتاد طبیعت اور ذوق عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری موقع رکھتا تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ حج کی تمامیت کو دو دن باقی اور آپ نے اس قریبی وقت میں ایک دم حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ معظمہ سے روانگی اختیار فرمالی۔

اس کے اسباب ظاہری آنکھوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرم الٰہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی اور انھیں یہ ہدایت کہ حسین جس حال میں ہوں اُن کو گرفتار کرلو۔ یہ راز اُس وقت کھلا جب آپ مکہ سے باہر آچکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور کہا فرزند رسول! اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟ امام نے فرمایا "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کرلیا گیا ہوتا"

بس یہ تھا کہ جس نے حسین کو عراق کی طرف روانگی پر مجبور کیا۔

عہ۱ "امام نے سفر کے لیے قدم کیا اُٹھایا، ہر گام پر تعلیمات اسلام کی اشاعت اور ہر مقام پر سنت نبویہ کا احیاء فرمایا۔ آپ نے اہل مکہ کو بتادیا کہ حرم کی بے حرمتی ہونے والی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میری وجہ سے شعائر الٰہیہ کی عظمت کو صدمہ نہ پہونچے مجھے ایک بالشت مکہ سے دور قتل ہونا ایک بالشت قریب قتل ہونے سے زیادہ محبوب ہے ؎

لہو بیکس کا مقتل کی زمیں پر نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

حضرت نے احرام حج توڑ دیا اور وہ سنت نبویہ جو صلح حدیبیہ کے موقع پر دنیا نے دیکھی تھی اُسے دوبارہ یاد دلایا جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خانہ کعبہ کی کیا عظمت ہے اور اُس کی اباحت کا سبب بننا کس قدر گناہ ہے" عہ۲ "حضرت امام حسین کو یہ ثابت کرنا تھا کہ خانہ کعبہ مرکز روحانیت ہے نہ مرکز عسکریت۔ وہ لڑنے مرنے کی جگہ نہیں

عہ۱ مولانا نعمت امام صاحب پھلواروی عہ۲ علامہ ہندی مولانا سید احمد صاحب

وہ مامن ہو۔ امام حسین نے چاہا کہ قرآنی ہدایات اور رسول کی تعلیم کی بنا پر اقوام عالم کی للچائی ہوئی ملک گیری کی نظروں سے حجاز کو محفوظ کر دیں اور امن کا مرکز بنا کر عالم کے فرقوں کو مطمئن کر دیں۔"

وارث کعبہ نے کعبہ کو رخصت کر دیا۔ نتیجہ آخر امام کے پیش نظر تھا یعنی موت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکۂ معظمہ میں روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزند آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے اتنا ہی جتنا یعقوب کو یوسف سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے جدا کر رہے ہیں کوئی چارہ کار نہیں اُس دن سے جو خط تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے ہم اُس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسول سے اُن کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔" یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے اُس رات کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی، اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ کیا ہی کسی متکلم میں دم جو اُس اطمینان قلب، اُس عزم، اُس سچائی اور اُس خلوص کی حد بتلا سکے جو اس تقریر کے الفاظ میں مضمر ہے اور جو حسین کے بلند کردار کا معرف ہے۔

پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے مکہ سے فوراً نکل جانا اُن خطرات کے بعد جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے ہیں ضروری ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کہاں جائیں؟ عقلاً اُسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے ہیں، اُن تمام خطرات کے باوجود جو بہر حال آنکھوں کے سامنے ہیں اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو ہے ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جایا جائے۔ جہاں

جانا، ناخوانده مہمان کی حیثیت سے ہو یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح وزاری کے ساتھ دعوت دے رہے ہیں۔

خطرہ کے معنی کیا؟ یہی تو کہ جان جائے گی مگر جان تو جانا ناگزیر ہے پھر یہ جان ایک انسانی فرض کی ادائی کے سلسلہ میں کیوں نہ جائے جس کا نام ہے وعدہ وفائی، طالبان ہدایت کی ہدایت اور خلق خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اور اس پر کافی بحث کی جا چکی ہے۔ حضرت امام حسین نے اُن لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ نہیں کہا کہ نہیں مجھے اُن سے امید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پہ قائم رہیں گے مگر آپ نے اپنی روانگی کو اُن کی طرف ضروری بتلایا چنانچہ فرزدق بن غالب شاعر سے جب ملاقات ہوئی اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل تو آپ ہی کے ساتھ ہیں مگر تلواریں اُن کی بنی امیّہ کے ساتھ رہیں گی۔ حضرت نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھلاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو اُس کا شکر ہے اور اس شکر کے ادا ہونے کے لیے اُس کی مدد درکار ہے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں حائل ہو تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُس کی نیت میں سچائی اور اُس کے ضمیر میں پارسائی ہو"، اس کے معنی یہ ہیں کہ مقصد نیک ہو اور نیت خیر، اس کے بعد "ہرچہ بادا باد"، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسین کسی دوسرے پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوئے تھے بلکہ خود اپنے ارادۂ وعمل کی طاقت پہ بھروسا کر کے۔

خانۂ کعبہ میں گرفتاری کے جو خطرے تھے اُن کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آ گیا اُس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پہ حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے جو یحییٰ بن سعید افسر پولیس کی قیادت میں تھا بیرونِ شہر آ کر آپ سے مزاحمت کی اور کہنے لگے کہ آپ کو واپس چلنا ہو گا۔ حضرت نے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی آویزش بھی ہوئی مگر امام حسین کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو روکنے پر تیار تھے اس لیے اُن لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہو گیا (طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۲)

دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس افسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیجی (الاخبار الطوال ص۲۴۴)

جیسا کہ ارشاد شیخ مفید میں ہے یہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز وہاں کوفہ میں حضرت مسلم سے اور ابن زیاد سے جنگ چھڑی اور ۹ ذی الحجہ کو وہ شہید کئے گئے۔ اس وقت حضرت امام حسین مکہ سے نکل کر وادی غربت کی منزلوں میں راستہ طے کر رہے تھے۔

آپ کے پاس قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے اور پہنچ گئے تھے جو آپ کے ساتھ ساتھ چلے (ارشاد مطبوعہ طہران ص۲۴۳)

مکہ سے کربلا کے سفر تک حضرت امام حسین جن منزلوں میں مقیم ہوئے اُن کے نام ترتیب کے ساتھ مختلف مورخین نے مختلف دیے ہیں۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے اُن کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے:-

(۱) صفاح اس منزل پر بقول طبری فرزدق سے ملاقات ہوئی جس کی تفصیل اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ دینوری کا بیان بھی اس کے مطابق ہے (الاخبار الطوال ص۲۴۵)

(۲) ذات عرق ابن طاؤس نے فرزدق سے ملاقات اس منزل پر لکھی ہے۔ فرزدق چونکہ حج کے ارادہ سے جا رہے تھے اور حج کو صرف ایک دن باقی تھا اس لیے یقیناً یہ منزل مکہ سے بالکل نزدیک، شاید دو ہی چار گھنٹہ کی راہ پہ ہوگی اور اسی لیے امام کا اس منزل پر قیام کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ راستہ چلتے کے ٹھہر کر فرزدق سے بات چیت ہوئی اور پھر آپ آگے بڑھ گئے۔

اسی منزل پر عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آکر ملاقات کی واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسین مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے ہیں اور کوفہ کا قصد فرمایا اس وقت عبداللہ بن جعفر مدینہ ہی میں تھے ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے جانا اس خطرہ کی بنا پر تھا کہ وہاں کے حاکم کو یہ فرمان آچکا تھا کہ اگر حسین بیعت نہ کریں تو ان کا سر اتار لیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ سے ہے کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں

بھیجے گئے ہیں جنھیں حکم یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو حسین کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیجدیں۔ اس موقع پر عبد اللہ بن جعفر نے اپنے مقدور بھر یہ بڑی خدمت انجام دی کہ وہ حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اُس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسین کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد عون و محمد اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آئیے کیونکہ اُس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیت کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر آپ دنیا سے اُٹھ گئے تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبان ہدایت کے لیے نشان راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں سفر میں جلدی نہ کیجئے میں خود اس خط کے پیچھے آرہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کی خدمت میں راستے میں جا کر ملحق ہوئے عمرو بن سعید نے عبد اللہ بن جعفر کے اصرار سے امان نامہ تحریر کیا اور اُسے اپنے بھائی یحیٰی کے ساتھ عبد اللہ کے پاس بھیجا عبد اللہ یحیٰی کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور جب امام منزل ذات عرق پر پہونچے تو عبد اللہ اور یحیٰی وہاں آکر امام سے ملحق ہوئے اور تحریر امام کے سامنے پیش کی، امام خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے آپ نے عبد اللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھکر اُن کے سپرد کیا۔ عبد اللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس گئے۔

(۳) بطن الرمہ او حاجر "بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو خط دیکر اہل کوفہ کے نام روانہ کیا (الاخبار الطوال ص۲۴۷) اس خط کا مضمون یہ تھا "یہ خط ہے حسین بن علی کا برادران ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد الٰہی کے معلوم ہو کہ مُسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمھارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی

ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام کو پہونچائے اور تم کو اس پر بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں جب میرا خط تمھیں پہونچے تو انتظامات مکمل کرو اور تیزی سے اپنا نظام درست کرو کہ میں اس چند روز میں تمھارے یہاں پہونچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ والسلام۔"

یہ خط حضرت نے قیس بن مسہر صیداوی کو جو اہل کوفہ کے فرستادہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے دے کر روانہ کیا۔ اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جا سکتی تھی۔ ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے ہیں تو عبد اللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے انھوں نے آپ سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہل کوفہ کی دعوت کا حال سُن کر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح کوفہ جانے سے اختلاف کیا اور امام نے فرمایا کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ (الاخبار الطوال ص ۲۴۵)

(۴) زرود اس منزل پر زہیر بن قین سے ملاقات ہوئی۔ یہ حج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کوفہ جا رہے تھے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اسکے پہلے ان کو خاندان رسول سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ عام طور پر اہل شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کو اُس زمانہ میں "عثمانی مسلک" کہا جاتا تھا۔ مگر حسین کی نباضِ فطرت فراست اُن کی باطنی استعداد سے واقف تھی۔ آپ نے اُن کے پاس پیغام کہلا بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، خاندان رسول سے جو وحشت عام طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اُس کی بنا پر انھوں نے ملنے سے انکار کیا مگر ان کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھی کہا کہ "واہ کیا غضب کی بات ہے کہ رسول خدا کا فرزند تمھارے پاس پیغام ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو" اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسین کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسین نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ یہ ہمہ تن حسین کے موافق بن گئے۔ بڑے خوش خوش منزل پر واپس آئے اور حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے اکھاڑ کر اصحاب امام کے

خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور اُس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائے۔ ساتھیوں سے کہا کہ میں نے امام حسین کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے۔ جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ قیام کرے اور جو نہ چاہے وہ یہیں سے واپس جائے چنانچہ ساتھ والے سب واپس گئے (الاخبار الطوال ص ۲۵۶)

صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو ان سے کچھ خوش آیند توقعات یا امید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اُس آخری انجام کا انکشاف تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسین کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزل عمل میں گامزن تھے۔

بے شک عوام بالکل ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ اُن کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آیند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزند رسول اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت، عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کوفہ میں اپنے شیعوں کے اصرار و طلب پر جا رہے ہیں وہاں پہونچ کر تاج و تخت، فوج و لشکر، حشم و خدم سب کچھ مہیا ہوگا حضرت بادشاہ عراق ہوں گے اور امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہوگی ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب ایک مختصر لشکر بن گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ بے شک کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکز سلطنت کی طرف جا رہا ہے لیکن زرود سب سے پہلا وہ مقام ہے جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبد اللہ بن سلیم اور منذر بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغت حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرود میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے۔ ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا جس نے حسینی قافلہ کو آتے دیکھ کر رستہ بدل دیا اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ امام اُس کو دیکھتے ہی ٹھہرے تھے کہ کچھ حالات کوفہ کے معلوم کریں لیکن جب اُس نے رُخ دوسری جانب کر دیا تو حضرت آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کوفہ کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری سے

اُس جانے والے تک پہونچ گئے اور صاحب سلامت کے بعد اُس کا قوم و قبیلہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اسدی ہے تو انھوں نے بتایا کہ ہم بھی قبیلۂ بنی اسد میں سے ہیں۔ ذرا تم سے اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں اُس نے کہا کہ "ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلمؑ بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کئے گئے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُن کی لاش کے پاؤں میں رسّی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جا رہا ہے۔" بڑی وحشت ناک خبر تھی دونوں آدمیوں نے سُن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اُس وقت اُسے دل میں رکھ لیا یہاں تک کہ وقت اُس کے اظہار کی اجازت دے۔

(۵) زبالہ اس منزل پر پہونچ کر جب حضرت امام حسینؑ نے قیام کیا تو دونوں اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجا لائے۔ حضرت نے جواب سلام دیا، اُنھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ تخلیہ میں کہیں؟ حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا "ان لوگوں سے کوئی بات راز نہیں۔" اُنھوں نے کہا آپ نے اُس سوار کو دیکھا تھا جو کل شام کے وقت آ رہا تھا؟" فرمایا "ہاں اور میں نے اُس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے۔" اُنھوں نے کہا کہ ہم نے حضور کے منشا کے مطابق اُس سے حالات دریافت کئے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھدار، سچا اور دانشمند شخص ہے۔ اُس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلمؑ بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید ہو گئے اور اُن کی لاشیں بازاروں میں پھرائی گئیں۔"

بے شک یہ خبر بہت اندوہناک تھی۔ ایک طرف مسلمؑ کا صدمہ جو آپ کے چچازاد بھائی اور وفادار ساتھی تھے۔ دوسری طرف اپنے مستقبل کے متعلق ظاہری تمام امیدوں کا ختم ہو جانا لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت ہر موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے۔ سخت موقعوں پر تمام لوگوں کی نظر سردار پر ہوتی ہے۔ اگر کہیں اُس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقا اور ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہونچی۔ کیا ہوا صرف اتنا کہ حضرت نے

چند بار کہا انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہما اور بس خاموش ہو گئے۔
دینوری نے کلمۂ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ نحتسب انفسنا
"ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا یعنی اُسی کی راہ میں ہم ان جانوں کو نثار کرتے
ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔ (الاخبار الطوال ص ۲۴۶) اس فقرہ سے یہ پتہ چلتا تھا
کہ آپ بھی اُسی راہ پر قائم ہیں اور جان دینے پر تیار ہیں جس راستے پر مُسلم کی جان گئی۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اُس سے پورا پورا
اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائیں قائم کر چکے تھے اُن
سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور ایک بے قرار جذبہ کے ساتھ جو الفاظ سے جھلک
رہا ہے کہنے لگے "خدا کا واسطہ اپنے اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے، یہیں سے
واپس ہو جایئے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا
کوفہ آپ کے خلاف ہی ہوگا" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے
جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اُس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا وقتی
جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل بہت کم کامیاب ہوا کرتے ہیں لیکن اُن کے اس مشورہ کو
خاموشی کے ساتھ سُن لینا تمام اہل قافلہ کو اُن کی اس رائے سے متاثر ہو جانے کا موقع دینا
تھا اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری
جذبہ کے احساس سے دینا چاہا اور اُس کے لیے ایک نظر اولادِ عقیل پر ڈالی اور فرمایا "تمہاری
کیا رائے ہے مُسلم تو شہید ہو گئے"، امام کے اس سوال نے گھٹے ہوئے جذبات پر برادرانِ
مُسلم کے وہی کام کیا جو کسی مشتعل مادہ سے آگ کا چھو جانا، تمام عقیلی جوان کھڑے ہو گئے
اور کہا خدا کی قسم ہم تو واپس نہ ہوں گے جب تک مُسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں یا وہی
موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں جو مُسلم نے چکھا" یہ سُننا تھا کہ حضرت متوجہ ہوئے۔
دونوں اسدیوں کی طرف، فرمایا "جب یہ لوگ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کرینگے!
حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مُسلم کی برابری نہیں۔ آپ کوفہ
میں پہنچ جائیں تو کوفہ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے" حضرت نے اس

خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی۔
ابو حنیفہ دینوری کا بیان ہے کہ اس منزل پر محمد بن اشعث اور عمر بن سعد کا قاصد بھی امام کے پاس پہونچا۔ واقعہ یہ تھا کہ جناب مُسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین حاصل ہونے کے بعد ان دونوں آدمیوں سے یہ وصیت کی تھی کہ تم ایک خط حضرت امام حسین کے پاس بھیجدینا کہ کوفہ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوفہ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں تشریف لانے کا ارادہ نہ کیجیے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور وہ منزل زبالہ پر امام کے پاس پہونچا۔ اس خط سے قتل مُسلم کی خبر کا پورا یقین ہو گیا۔ اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسہر قتل کئے گئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۷)
قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی موجودگی میں حضرت مُسلم کی خبر شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص اور رازدار لوگ تھے اسی لیے اتنے مجمع میں حضرت مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونیکے بعد بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی یہانتک کہ آپ کو اپنے دودھ شریک بھائی عبد اللہ بن یقطر کی خبر شہادت پہونچی جنھیں آپنے خط دیکر قیس بن مسہر کے بعد روانہ کیا تھا اور وہ بھی کوفہ پہونچنے سے قبل ہی گرفتار کر کے شہید کئے گئے حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا آپ جانتے تھے کہ راستے کے بہت سے عرب آپکے ساتھ اس خیال سے ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک میں جارہے ہیں۔ جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے ہیں یہ آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورت حال کا اظہار کر دینگے تو بس وہی لوگ آپکے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقۃً آپ کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کے ساتھ مرنا پسند کرتے ہیں (طبری ج ۶ ص ۲۲۶)
چنانچہ آپنے ایک عام اعلان کی صورت میں حسب ذیل سرکاری بیان تمام اہل قافلہ کی اطلاع کے لیے شائع کیا۔ "ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوئی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہمارے ماننے والوں نے ہماری مدد سے ہاتھ اٹھا لیا اس لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اُس پر

کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام!

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور وہ اپنے بائیں روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ بس وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔

(۶) بطنِ عقیق

اس منزل پر قبیلۂ عکرمہ کا ایک شخص ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی جانب سے قادسیہ اور عذیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اُس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سوائے تلواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسا نہ کیجئے۔ وہی لوگ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسین نے اُس کی خیر خواہی پر اُسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۷)

حقیقتِ حال یہ تھی کہ مسلم کو شہید کرنے کے بعد ایک تو خود عبید اللہ بن زیاد کو خیال تھا کہ عنقریب حسین بن علی تشریف لانے والے ہیں اور اُس کو اندیشہ تھا کہ اگرچہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں لیکن اُن کے آنے سے کہیں پھر انقلاب پیدا نہ ہو جائے۔ دوسری طرف مکہ سے یزید کے جاسوسوں نے یزید کو اطلاع دی کہ امام حسین یہاں سے روانہ ہو گئے اس لیے اُس نے مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر معلوم ہونے کے بعد ابن زیاد کو لکھا کہ مجھکو خبر معلوم ہوئی ہے کہ حسین بن علی عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ اب تم ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو اور سنگر بناؤ اور وہم و گمان بھی خطرہ کا ہو تو اُس سے تحفظ کرو اور بدگمانی جس پر ہو اُسے فوراً گرفتار کر لو (طبری ج ۶ ص ۲۱۵)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اشخاص گرفتار کر لیے گئے جن سے اہلبیت رسول کی حمایت کا اندیشہ تھا اور اس طرح شہر کے داخلی حالات کے متعلق اطمینان حاصل کیا گیا اور دوسری طرف کوفہ کے باہر جتنے راستے مختلف سمت کے تھے اُن سب کی ناکہ بندی ہوئی تاکہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ جہاں دوستانِ علی کافی تعداد میں بسے ہوئے ہیں کوئی مداخلت نہ کریں، نیز امام حسین جن کا آنا قریبی زمانہ میں یقینی تھا اُنکے

ساتھ دینے کے لیے کوئی جماعت باہر نہ جانے پائے۔ اس کے لیے قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا کئی ہزار سواروں کے ساتھ حصین بن تمیم کو مقرر کیا گیا جو اب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ قصہ سے لے کر قطقطانہ لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام اور بصرہ کے راستے تھے ان سب میں لشکر پھیلا دیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آسکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن یقطر جو امام حسین کے فرستادہ اہل کوفہ کے نام خط لے جا رہے تھے وہ اسی قادسیہ میں پہونچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور حضرت امام حسین جب ان حدود میں پہونچے اور صحرائی عربوں سے حالات کو دریافت کیا تو انھوں نے کہا بخدا ہمیں کچھ نہیں معلوم سوائے اس کے کہ نہ ہم اندر جا سکتے ہیں اور نہ باہر نکل سکتے ہیں۔ جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے بطن عقیق تک امام حسین بالکل اس راستے پر جا رہے تھے جو سیدھا کوفہ تک پہونچتا ہے لیکن یہ سنکر کہ قادسیہ کے ناکہ پر فوجوں کا پہرا ہے اور وہاں پہونچنا اپنے کو یقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کرا دینا ہے آپ اس شاہراہ عام سے ذرا ہٹ کر روانہ ہوئے اور اسی لیے قادسیہ کہ جو ہر کوفہ جانے والے کے محل گزر میں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقطر گرفتار ہوئے تھے آپ کے منازل سفر میں واقع نہیں ہوا اور آپ کا اس فوج سے تصادم نہیں ہوا جو حصین بن تمیم کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

(۷) سراۃ بطن عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی (الاخبار الطوال ص ۲۴۶) صبح ہوئی تو امام نے حکم دیا کہ پانی کثرت سے بھر لو اور مشکیں، چھاگلیں پانی سے پُر کر لو۔ حکم ہوا اور جاں نثار رفقا نے اطاعت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام چشمہ کے کنارے یا اس کے نزدیک تھا اور شاید اس مقام پر پانی کا کثرت کے ساتھ لے لینا اسی لیے ہو کہ اب یہ رستہ جو اختیار کیا گیا تھا شاہراہ عام سے الگ تھا اور عام شاہراہوں پر تو عموماً تھوڑی تھوڑی دور پر چشمے یا کنویں وغیرہ موجود ہوتے ہیں

لیکن بے راہہ راستے میں عرب کے ریگستان اور بیابان ہوتے ہیں جہاں پانی کا ملنا بڑی بڑی دور تک غیر ممکن ہوتا ہے اس لیے پانی کا انتظام ہو جانا پہلے سے ضروری ہے

(۸) شراف ہجرت کا سنہ ساٹھ اپنے دور کو ختم کر کے رخصت ہوا ہے اور محرم سنہ اکسٹھ ہجری کا چاند فلک پر نمودار ہوا۔ پہلی تاریخ بھی ہو گئی اور دوپہر دن کے قریب گزرا ہو گا امام حسین کا قافلہ منزل شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا کہ ایک شخص نے اصحاب میں سے کہا "اللہ اکبر" امام نے فرمایا بے شک اللہ سب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اُس نے کہا مجھے خرمے کے درخت دکھلائی دے رہے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ دونوں اسدیوں نے جن کا تذکرہ خبر شہادت مسلم کے بیان میں ہو چکا ہے کہا کہ اس جگہہ تو درخت خرما کبھی ہم نے دیکھے نہیں۔ حضرت نے فرمایا پھر تم ہی دیکھو، کیا دکھلائی دیتا ہے؟ اُنھوں نے کہا ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

(۹) ذو حسم فوج کے آنے کا یقین کر کے امام حسین نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان نہ باقی رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذو حسم پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جیے۔ اگر ہم دشمن کے پہلے اس تک پہونچ گئے تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ حضرت نے اس رائے کو پسند فرمایا اور آپ بائیں طرف متوجہ ہوے آنے والی سپاہ نے جو دیکھا تو اُس نے بھی اُسی طرف کا رُخ کیا۔ مگر امام وہاں پہلے پہونچ گئے۔ اصحاب کو حکم دیا کہ خیمے نصب کر دیے جائیں۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ اتنی دیر میں وہ فوج بھی قریب پہونچی اور معلوم ہوا کہ حر بن یزید ریاحی ہے ایک ہزار کی فوج کے ساتھ جو سد راہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ چونکہ امام سامنے کے راستے پر نہیں گئے جو قادسیہ پہونچتا تھا اور اس لیے حصین کی فوج کے چنگل میں نہ آسکے جو قادسیہ میں پڑی ہوی تھی مگر جاسوسوں نے حصین کو آپ کے اس طرح بچ کر آگے بڑھ جانے کی اطلاع

دے دی اس لیے حسینؑ نے حُر کو اس ایک ہزار کی فوج کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے آگے روانہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ناکہ بندی کرنے والی فوجوں کی زد سے بہت دور نکل آئے تھے اس لیے حُر کو آپ تک پہونچنے میں بڑی غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا اس لیے یہاں پہونچتے پہونچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔

امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے۔ تلواریں حمائل کئے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جسمیں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپکے لیے دشمن کی موجودہ حالت برداشت کے قابل نہیں تھی آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کردو۔ حکم کی دیر تھی اطاعت امام پر کمربستہ جوان کھڑے ہوگئے اور سب کو سیراب کیا۔ حالت یہ تھی کہ پیالے لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے، جب ہر گھوڑا تین چار یا پانچ دفعہ پی کر مُنھ ہٹا لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے، یہاں تک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہوگئے۔ علی بن طعان محاربی حُر کا ایک ساتھی تھا، وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہونچا۔ جب امام حسینؑ نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا، فرمایا "راویہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھا لو" میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے۔ اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرت نے فرمایا "جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھالو" میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا اب پانی پیو، مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا تھا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہونچتا تھا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا تب حضرت خود اُٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کرکے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو بھی سیراب کیا (طبری ج ۶ ص ۲۲۷)

اس واقعہ نے حسینی خلق و مروت کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُر کے دل پر قائم کیا

اُس کے ظاہر ہونے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ کم از کم اس وقت وہ ششدر رہ گیا تھا کہ اس احسان کے بعد اب اسی وقت اس بلند مرتبہ انسان سے کس طرح کی گفتگو کروں امام نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور اُنھوں نے اذان کہی جب نماز جماعت کی صفیں تیار ہوگئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد حُر اور اُس کی فوج کو مخاطب کرکے ارشاد کیا " اے کوفہ کے لوگو! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمھارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمھاری طرف اُس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمھارے خطوط میری طرف نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آئیے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے شاید خدا آپکے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کردے۔ اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آہی گیا ہوں۔ اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں " اس تقریر کے بعد بھی خاموشی چھائی رہی اور کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر حضرت نے اقامت کا حکم دیا اور اقامت ہوئی۔ اب آپ نے حُر سے فرمایا کہ چاہو تو تم اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھاؤ۔ حُر نے کہا نہیں آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپکے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دونوں طرف کے لوگوں نے امام کے پیچھے نماز ادا کی۔ ظہر کے وقت امام اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپکے اصحاب آپکے خیمہ میں جمع ہوئے۔ حُر اُس خیمہ میں جو اُس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اُس کے کچھ ساتھی اُس کے پاس آکر بیٹھے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اُسی میدان میں بیٹھ گئے، اس طرح کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں اور اُن ہی کے سایہ میں دوپہر کا وقت گزرنے تک بیٹھے رہے۔ عصر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آکر عصر کی نماز کا اعلان کیا۔ نماز کے بعد آپ نے رُخ کیا تمام مجمع کی طرف اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا:۔ تم لوگ اگر تقویٰ اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل ہوگی۔ حقیقۃً ہم اہلبیت امت اسلامیہ

کی فرمانروائی کے اُن لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اُس رائے کے خلاف ہو جو تمھارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہوئی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" اب حُر کی مُہرِ خاموشی ٹوٹی اور اُس نے کہا ہمیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں جن کا آپ حوالہ دے رہے ہیں۔

امام نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لاکر سامنے رکھدیے اور نکال کر پھیلا دیے۔ حُر نے کہا ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور ہیں اس بات پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر آپ کو چھوڑیں نہیں، جب تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس نہ پہونچا دیں۔ امام نے زور سے کہا "موت تمھیں اس سے زیادہ نزدیک معلوم ہوگی۔" یعنی میں تمھارے ہاتھوں میں گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس تو نہیں جاؤں گا۔ بس اب کوفہ جانے کا ارادہ بالکل بدل گیا ہے یعنی پہلے تو رستہ بدلنے کے ساتھ سہی مگر رُخ کوفہ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اس کے بعد اب کوفہ جانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ امام نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا :۔ "صورت حال جو پیش آئی ہے وہ تم لوگ دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اُس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اُس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے سوائے تھوڑے حصّہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھانس کے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبالِ جان ہے۔" اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام سے مطلع کرنا اور اُن کے عزائم میں پختگی پیدا کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سُنکر اصحاب

کی جانب سے بھی اپنے اخلاص نیت اور پختگی عزائم کا کوئی اظہار ہو۔ زہیر بن قین کا ذکر اس کے پہلے ہو چکا ہے کہ وہ پہلے عثمانی جماعت میں سے تھے اور اب آستے سے امام کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ انھیں اس وقت اس کا احساس تھا کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا پورا حق حاصل نہیں ہے مگر اُن کا قلبی جوش و ولولہ اُن کو سکوت کی اجازت بھی نہ دیتا تھا آخر امام کی تقریر ختم ہوتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور اصحاب امام سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت مانگی کہ آپ لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں یا میں کہوں؟ یہ اخلاق و مروت سے بالکل بعید تھا کہ انھیں روکا جاتا سب نے کہا نہیں تم تقریر کرو۔ زہیر نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا:-

"خدا آپ کو مقصد تک پہونچائے اے فرزند رسول! ہم نے آپ کے ارشاد کو سنا بخدا دنیا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اُس سے آپ کی نصرت اور ہمدردی میں ہوتا تو ہم آپ کے ساتھ چلنے کو دنیا کے ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے۔"

امام نے دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی۔ اس کے بعد نافع بن ہلال جملی کھڑے ہوئے اور حسب ذیل پُر زور تقریر کی:-

"فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جد بزرگوار سے یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر پلا دیں اور لوگ اُن کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جس طرح کہ وہ چاہتے تھے اور اُن کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو اُن سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے اور دماغ میں غدّاری کا خیال مضمر رکھتے تھے وہ باتیں ایسی کرتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہیں اور کردار میں مخالفت کرتے تھے ایسی جو انتہائی تلخ تھی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ کا انتقال ہو گیا آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ اُن کی نصرت پر متفق ہوئے اور اُن کے ساتھ مل کر ناکثین و قاسطین و مارقین (اہل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی یہاں تک

کہ اُن کی وفات ہوئی اور آج ہمارے نزدیک آپ کو وہی صورت درپیش ہے۔ لہذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیت خراب کرے گا وہ خود اپنا بُرا کرے گا۔ اور خدا آپ کو اُس سے لاپرواہ کردے گا۔ اب آپ ہم کو لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب۔ ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اُس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اُس کے جو آپ سے دشمنی کرے۔"

پھر بریر بن خضیر ہمدانی نے تقریر کی جو حسب ذیل ہے:۔

"خدا کی قسم اے فرزند رسول! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ ہم کو موقع دیا۔ اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت میں ہمارے اعضا قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جد بزرگوار روز قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پاسکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو برباد کیا ہو اور وائے ہو اُن کے لیے۔ یہ خدا کو کیا مُنھ دکھائیں گے اور کیا حال ہوگا اُس دن جب وہ آتش جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے۔"

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو اور سب لوگ یہاں تک کہ خواتین اپنی عماریوں میں سوار ہوئیں آپ نے حکم دیا کہ چلو جس راستے پر آئے ہیں اُسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سدِ راہ ہوئی۔ امام نے فرمایا کہ تمھارا مطلب کیا ہے؟ حُر نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں۔ حضرت نے فرمایا خدا کی قسم یہ تو نہیں ہوگا۔ حُر نے کہا پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں۔ یونہی تین مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔ آخر میں حُر نے کہا کہ میں آپ سے جنگ پر تو مامور نہیں ہوں، مجھے تو یہ حکم تھا کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کوفہ پہونچیں۔ اب جب آپ کوفہ جانے سے انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا رستہ اختیار کیجیے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو

اور نہ مدینہ کی طرف واپسی کا راستہ ہو۔ یہ میرے اور آپ کے معاملہ میں انصاف کا طریقہ ہے آپ اس راستے پر رواں ہوں یہاں تک کہ میں ابن زیاد کو لکھوں اور چاہیں تو آپ بھی یزید یا ابن زیاد کو خط لکھیں۔ بہرحال شاید خدا اس طرح کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ مجھے آپ سے کوئی عملی تصادم نہ کرنا پڑے۔" حضرت کو حُر کی یہ بات اچھی معلوم ہوئی اور آپ قادسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے اور حُر حضرت کے ساتھ ساتھ۔ دینوری کا بیان ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا (الاخبار الطوال ص ۲۴۸)

راستے میں جو گفتگو ہوتی جاتی تھی، وہ بھی بڑی معنی خیز تھی۔ حُر نے کہا دیکھیے میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی پر رحم کیجیے، اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل ہوں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ حضرت نے جواب دیا "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو۔ اس کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا شعر بطور مثال پڑھا جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت میں ایک جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت سچی ہو اور وہ حق کے راستے پر جہاد کر رہا ہو"

حُر نے جو یہ انتہائی عزم کا اظہار سنا تو وہ حضرت سے کچھ فاصلہ پر علیٰحدہ ہو گیا اور دُور دُور مگر آپ کے ساتھ روانہ ہوا۔

(۱۰) بیضہ اس مقام پر امام حسین نے اصحاب حُر اور اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کے تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے فرائض کو دکھلایا ہے فرماتے ہیں "ایہا الناس پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے جو ظلم و جور کرتا ہے، محرمات الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے۔ خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے اور سنت رسول کی مخالفت کرتا ہے اور بندگان خدا میں معصیت کا طرز اختیار کئے ہوئے ہے لیکن یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور

اصلاح کی کوشش نہ کرے نہ قولی اور نہ عملی تو خدا کو حق ہوگا کہ وہ اس شخص کو بھی اُسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے یعنی اُس گناہ میں اسے بھی شامل قرار دے۔"
اس کے بعد موجودہ حالت پر تبصرہ فرماتے ہیں "تمھیں معلوم ہوگا کہ ان بنی امیہ نے اطاعت شیطان کو اپنا راستہ بنالیا اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کی ہے مسلمانوں کے اموال کو اپنا بنالیا ہے۔ اور حرام خدا کو حلال، حلال خدا کو حرام بنا دیا ہے۔ اس صورت میں مجھ سے زیادہ کس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے"

ان الفاظ میں پورے طور پر حسین کے اُن تعلقات و خصوصیات کی طرف اشارہ ہے جو انھیں اسلام کے ساتھ حاصل ہیں جن کو پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس طرح کہ رسول کے رشتہ سے حسین اور اسلام میں وہی تعلق تھا جو ایک گود میں پرورش پانے والے دو بچوں میں ہوتا ہے تو اب اگر اسلام کے گلے پر چھری پھر رہی ہو تو حسین سے زیادہ اُس کی مدد کا فرض کس پر عائد ہو سکتا ہے

(۱۱) عذیب الہجانات اس منزل پر امام حسین اور نیز حُر کے لشکر نے ایک تیر کے فاصلہ سے الگ الگ قیام کیا (الاخبار الطوال ط ۲۴۹)

(۱۲) قصر بنی مقاتل عذیب الہجانات سے امام حسین روانہ ہوئے تو کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ پر یہاں تک کہ قصر بنی مقاتل پر پہونچے۔ یہاں پہونچکر آپ نے اور ساتھ ہی ساتھ حُر نے قیام کیا (الاخبار الطوال ص ۲۴۹)
قصر بنی مقاتل سے آگے بڑھے اور تھوڑا راستا طے ہوا تو اس وقت امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی آنکھ کھلی تو آپ فرما رہے تھے انا للہ و انا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین دو تین مرتبہ آپ نے یہی غمگین الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس وقت آپ کے فرزند علی اکبر گھوڑا دوڑاتے ہوئے آپ کے پاس آئے اور یہی الفاظ اپنی زبان پر جاری کر کے دریافت کیا کہ اس وقت ان کلمات کے زبان پر جاری کرنے کا کیا سبب تھا؟ فرمایا ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ تو راستہ طے کر رہے ہیں اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح

ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے"۔ شاہزادہ نے عرض کی "بابا خدا آپ کو رنج کی صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ امام نے فرمایا کیوں نہیں؟ یقیناً قسم اس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے شاہزادہ نے کہا "جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے" امام نے فرمایا "بیٹا تمھیں خدا جزائے خیر دے۔ بہترین جزا جو کسی بیٹے کو اُس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو"۔ یہ عزت نفس، اطمینان قلب اور ثبات ضمیر کا عجیب مرقع تھا۔

(۱۳) نینوا قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور حر کی طرف سے بھی اب کوئی مزاحمت نہیں کی جاتی یہاں تک کہ یہ قافلہ "نینوا" کی زمین پر پہونچا۔ یہاں ایک سوار مسلح کوفہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا اور سب کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہونچا تو اُس نے حر اور اُس کے اصحاب کو تو سلام کیا لیکن حسین اور اصحاب حسین کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ قاصد ابن زیاد کا تھا جو حر کے نام خط لایا تھا، اُس میں لکھا تھا کہ تم کو لازم ہے جہاں پر تم کو یہ خط پہونچے کہ وہیں پر حسین کو آگے بڑھنے سے روک دو اور اُنھیں ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ و جائے پناہ ہو اور میں نے اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہے اور تم سے جدا نہ ہو جب تک میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے والسلام"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد کو حر کے روادارانہ برتاؤ کی امام کے ساتھ اطلاع ہو گئی۔ امام کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز پڑھنا، اور پھر کوفہ لے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت پیدا کرنا کہ مدینہ اور کوفہ کے علاوہ دوسرے راستے پر جائیے یہ باتیں تھیں جن سے حر کی وفاداری ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن گئی اور اُسے ضرورت ہوئی کہ وہ اپنے تعمیل حکم کے لیے حر کی نگرانی کے لیے اپنے قاصد کو ساتھ رہنے کی ہدایت کر دے حر جو کچھ بھی ہو ابھی تک دنیا کا بندہ تھا۔ اس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخواستگی طبع کے ساتھ سہی مگر وہ امام اور آپ کے اصحاب کے سامنے آیا اور اعلان کیا کہ یہ

امیر ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جہاں یہ خط پہونچے وہیں پر آپ لوگوں کو اُترنے پر مجبور کر دوں اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو حُر نے اپنا معاملہ صفائی کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ امام نے نہ چاہا کہ اب اس کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے بس اتنا کہا کہ اچھا ہم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام "غاضریہ" ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیہ ہے (الاخبار الطوال میں سقبہ ہے) مگر حُر نے کہا مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے چٹیل میدان میں اُتاروں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگراں مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرز عمل کی جا کر اطلاع دے۔ اس موقع پر اصحاب امام کو جوش پیدا ہو گیا اور زہیر بن قین نے کہا کہ فرزند رسول ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اُن لوگوں سے جنگ کے جو ان کے بعد آئیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی جن کے مقابلہ کی ہم کو طاقت نہ ہوگی۔ مگر امام نے فرمایا کہ نہیں میں جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا زہیر نے کہا اچھا یہاں ایک قریہ ہے فرات کے کنارے اور وہ ایک محفوظ جگہ ہے اور تین طرف سے فرات اُس کو گھیرے ہوئے ہے، وہاں چلیے۔ امام نے نام پوچھا۔ اُنھوں نے کہا "عقر" اس لفظ کے معنی ہوئے بانجھ یعنی بے نتیجہ۔ امام نے فرمایا مجھے تو اس لفظ سے نفرت ہوتی ہے آخر امام حسین نے حُر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو۔ حُر خاموش ہو رہا۔

کربلا

امام ذرا بائیں طرف مڑے اور تھوڑا سا چلے تھے کہ سپاہ حُر سامنے آ کر سدراہ ہو گئی اور کہا کہ بس یہیں اُتر پڑیے۔ فرات یہاں سے دُور نہیں ہے امام نے نام پوچھا۔ معلوم ہوا کربلا۔ فرمایا اچھا کرب و بلا کی یہی منزل ہے۔ یہ کہہ کر گھوڑے سے اُتر پڑے (الاخبار الطوال ص ۲۴۹)

اب جبکہ قلم اس منزل تک آ گیا اور امام کا سفر منزل آخر تک پہونچ گیا تو ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے جس سے آپ کو اُس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا اور یہ معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی یہ سفر امام کے مقصد کے حصول کے لیے کتنا ضروری تھا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ امام کا مقصد یزید سے اُس طرح کی جنگ نہ تھی جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ انھیں نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا، نہ براہ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کریں اور چاہے اپنی اور تمام عزیزوں کی جان دے کر کیوں نہ ہو مسلمانوں میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزید اور اُس کے کردار کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اُن کے ظاہری دعوائے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ سے روانگی اختیار کی جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اُس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کرتے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اُسے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مدنظر تھی۔ یا زہر کام کرتا اور یا تلوار مگر تلوار کیسی جس کی ذمہ داری کسی صورت سے سلطنت شام پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ملجم کا سا جس نے علی کو شہید کیا تھا یا کوئی تیر آتا آدمی نہیں بلکہ جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا یہی ہوتی ہیں حکومت کی شعبدہ کاریاں جن کا نام دنیا نے "سیاست" رکھا ہے۔ حسین اس طرح کی سیاست کے گروں کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ اس لیے چھوڑا کہ اُن کا واقعہ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے ——— جا کر قیام کیا، کہاں؟ مکہ معظمہ میں جو قلب جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہر حال ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع

ہونا ضروری تھا وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر وسخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھی جن کو "اسواق العرب" کہا جاتا ہے، ذیقعدہ سے لے کر محرم تک مکہ وطائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسین کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی، اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسین کو اُن کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسول کا نواسا، سلطان حجاز و عراق کا فرزند۔ ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی جس کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا اپنی ہاشم کا بزرگ خاندان یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ حسین نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ امام حسین کا یہاں خاموش قیام بھی تمام اطراف ملک میں آپ کے بیعت یزید سے اختلاف کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وجہ تھی جس سے آپ کی زندگی سیاست وقت کے لیے یہاں بھی ناقابل برداشت ثابت ہوسکتی تھی اور اسی لیے حکومت یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تھے کہ آپ کو گرفتار کرلیں یا قتل کریں۔

امام حسین کو یہاں قتل ہونا منظور نہ تھا۔ اوّل تو اُسی وجہ سے جو خود آپ نے ظاہر کی کہ آپ اپنے سبب سے حرمت خانہ کعبہ کا ضائع ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری بات جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے گردوپیش حج کے زمانہ میں ایک بڑا بھیڑ ہوا کرتا ہے۔ ہر قسم کے لوگ اور ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں امام حسین کے لیے یہ بات تو بہر حال غیر ممکن تھی کہ آپ عرفات، منیٰ، مشعر، مقام ہر جگہ میں اپنے ساتھ پہرا رکھیں اور پہرا بھی اتنا مضبوط جو اُس ہنگامۂ و اژدہام میں پوری نگرانی کر سکے۔ بہت ممکن تھا کہ حجر اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے ہنگام میں، منیٰ کی قربانی کے موقع پر، مقام ابراہیم میں نماز پڑھتے کے کسی وقت اچانک آپ پر قاتلانہ حملہ ہوجاتا اس طرح کہ قاتل کا پتہ نہ لگتا۔ پھر کس کے مُنہ میں دانت تھے جو یہ کہہ سکتا کہ حسین کا قاتل یزید یا اُس کا کوئی فرستادہ ہے۔

ع۵۱ "اس طرح پر مکہ میں قتل ہو جانے سے حرمت کعبہ بھی جاتی، خونِ حسین بھی برباد ہوتا۔ حاجیوں کے قافلہ میں ہلچل اور اہل مکہ میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا اور رسول کے نواسہ کا خون ہدر ہو جاتا قاتلوں کا کہیں پتہ ہی نہ چلتا اور یزید پر کوئی الزام نہ آتا کوئی کہتا کہ یزید نے قتل کرایا ہے اور کوئی کہتا کہ نہیں عبد اللہ بن زبیر کے آدمیوں نے حسین کو قتل کر دیا ہے یزید اور یزیدیوں کو اپنی براءت کا موقع مل جاتا اور خونِ حسین کا الزام بیچارے عبد اللہ بن زبیر پر ڈال دیا جاتا اور حسین کے قصاص میں عبد اللہ بن زبیر کو پکڑ کر ایک ہی تلوار سے دونوں کی خلش مٹا دی جاتی اور یزید کا دل ٹھنڈا ہو جاتا کیونکہ تاریخیں اس کا بھی پتہ دے رہی ہیں کہ عبد اللہ بن زبیر سلطنت کے خواہاں تھے اور اسی لیے حسین کی موجودگی مکہ میں اُن کو بھی سخت گراں تھی۔ چنانچہ یہ عبد اللہ بن زبیر کو ناگواری امام کے قیام کی اتنی نمایاں تھی کہ جب امام نے قطعی ارادہ مکہ سے نکلنے کا کر لیا تو عبد اللہ بن عباس نے گویا مبارکباد دی عبد اللہ بن زبیر کو اور کہا کہ اب میدان خالی ہو گیا اب تم خوب کھل کھیل سکتے ہو (الاخبار الطوال ص۲۴۳) یقیناً اس ناگواری کا علم اموی سلطنت کو بھی ہو گا اور اس لیے یہ بالکل آسان بات ہوتی، کہ امام حسین کے قتل کی ذمہ داری عبد اللہ بن زبیر پر ڈال دی جاتی۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسین نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی مکمل نہ کیا ع۵۲ "وہ چلے لیکن عامل مکہ نے انھیں روکا۔ مگر حسین کے آہنی عزم کے سامنے گورنر کو اپنی فوجیں ہٹانا پڑیں۔ یزیدی عامل کا حسین کو مکہ سے روانہ ہوتے وقت روکنا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ حسین وہاں آزاد نہیں تھے حسین کے زیر نظر دو چیزیں تھیں ایک تو اپنی اور اپنے اعزا کی جان بچانا اور دوسرے اسلام کے کسی قانون کو برباد نہ ہونے دینا اصلی نصب العین تو شاید یہی دو ہوں مگر نتیجہ کے طور پر اس سے آپ کے مقصد میں دوسری حیثیتوں سے بھی وہ جان پڑی جو بغیر اس کے غیر ممکن تھی"۔ ع۵۳ "ایک ایکا خلاف توقع حسین کا حج کو ترک کرنا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑے ہونا

ع۵۱ ناموس اسلام ع۵۲ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ع۵۳ نہضۃ الحسین۔ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی (بغداد۔ عراق عرب)

ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا، اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑا دی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی مکمل اسی وقت قلم بند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسین بن علی کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟! آخر تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانا کے قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

"یزید کے خوف سے"

کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟

"حسین سے بیعت کا طالب ہے"

لاحول ولا قوۃ۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسول اور یزید ایسے شرابخوار اور زناکار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی ترک کر دیا؟!

"جان کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسین کے قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے"۔ توبہ توبہ! اس سے بڑھکر سفاکی اور ظلم کیا ہوگا۔ ارے فرزند رسول کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا گیا۔ یہ وہ تذکرے ہونگے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ جاری تھے، وہ زمانہ کہ جب مراسلت و تجارت کے راستے کم تھے اور تار ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب اس سے بڑھکر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسین کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس کا مطلب اگرچہ یہ نہیں تھا کہ امام کیلئے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے کیونکہ اسکی آپ نے دعوت ہی نہیں دی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہیں پائی اور اہل شام کو اپنے دل سے اس کیلئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع نہیں ملا اس لیے حسین کی مظلومیت و حقانیت مخفی نہ ہو سکی یقیناً اگر امام کی طرف سے نشر و اشاعت کے ان طریقوں کو عمل میں نہ لایا جاتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسین کا خون رائگاں چلا جاتا یعنی کہ آپ جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور آپ کا مقصود بھی حاصل نہ ہوتا مگر صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوئی یعنی امام شہید ہوئے اور فوراً ہی تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ناحق قتل کئے گئے شام کا حاکم اور اس کے وزراء اور ہوا خواہ کسی تہمت تراشنے کا موقع ذرا بھی نہ پا سکے یہ اسباب و علل شہادت کے نشر ہی کا نتیجہ تھا حسین نے اپنی نقل و حرکت

کے اسباب کی اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شایع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومیت کے سامنے دنیا کا سر خم کرا دیا۔ اسی میں آپ کے مقصد کی تکمیل پوشیدہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حسین کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا وہ خود ایک خاموش مبلغ تھا۔ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے۔ ادھر امام حسین اپنے اہل و اقربا۔ انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب لیے ہوئے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسین کا شاندار قافلہ اور اصحاب و انصار کا مختصر لشکر۔ اُس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکۂ معظمہ کی طرف حج کے لیے متوجہ ہو۔ یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور حسین کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کیے ہیں چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق سے ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوئی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمٰن مخزومی سے بھی اسی طرح جبکہ وہ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آ رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حسین بن علی اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اس کے ساتھ مدینہ میں محمدؐ بن الحنفیہ اور عبداللہ بن جعفر کا چھوڑ دینا بھی بڑا معنی خیز ہے۔ بہت ممکن ہے۔ جیسا بتلایا جاتا ہے یہ دونوں بزرگوار بیمار بھی ہوں مگر ہمیں یقین ہے کہ فرض کا احساس حضرت امام حسین کو ان کے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرتا تو بیماری کی صورت میں بھی نہ آپ اس میں کوتاہی کرتے اور نہ یہ افراد ہی ایسے تھے کہ امام کی آواز پر لبیک نہ کہتے لیکن ع۵ امام یہ جانتے تھے کہ مسلمان حج کے بعد مدینہ ضرور جاتے ہیں اور وہاں خانوادہ رسول کے افراد سے

ع۵ ڈاکٹر حسین صاحب فاروقی بی اے

بھی شرف ملاقات حاصل کرتے ہیں۔ آپ کی مدینہ میں عدم موجودگی ہی ان لوگوں پر بڑا گہرا اثر ڈالے گی مگر یہ "منفی" Passive پروپیگنڈا ہی ہوتا۔ اس لیے پروپیگنڈا کا Active اثر ڈالنے کیلئے آپ عبداللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ کو مدینہ میں چھوڑ گئے تاکہ یہ لوگ جو اسلامی دنیا میں کافی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں آپکے مقاصد کی اشاعت کرتے رہیں اور جس اسلامی تحریک کی کامیابی کیلئے آپ قربانیاں دینے جا رہے ہیں اُس کا صدر ہیں مورچہ مضبوط رہے۔ عبداللہ بن جعفر تاجر تھے اور اُن کے تجارتی تعلقات نہ صرف اہل مدینہ اور اہل مکہ سے تھے بلکہ باہر سے آنیوالے بینے تجار بھی آپ کی رسم و راہ بھی مدینہ میں برابر تجارتی قافلے آیا کرتے تھے اور پھر یہ قافلہ مدینہ سے شہروں شہروں گھوم کر واپس ہوتے تھے۔ عبداللہ بن جعفر ان قافلوں کے سرکردہ افراد میں اسلامی تحریک کے اثرات کو اچھی طرح پھیلا سکتے تھے؛

اب یہ دیکھیے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد آپ نے رُخ کدھر کا کیا؟ کوفہ کی طرف کا۔ اس کے اخلاقی و مذہبی پہلو بیان کیے جا چکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ اہل کوفہ کے انتہائی اصرار کو اس بنا پر مسترد کرنا کسی صورت پر جائز نہیں تھا کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں ہے جبکہ آپ کے نمائندہ نے جا کر وہاں کے حالات کو بھی قول و قرار کے موافق پایا تھا لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کوفہ کی جانب روانگی کو آپ کے مقصد یعنی بعد والے انقلاب میں کتنا بڑا دخل ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "کسی کے ہو رہو یا کسی کو اپنا بنا لو" حسین اپنے وطن سے بے بسی اور بیکسی کے ساتھ نکل چکے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی بھروسے کے قابل حالت نہ تھی مگر مکہ سے آپ کا نکلنا اہل کوفہ کے مہمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی عزت و حمیت کے تقاضے مہمان کے بارے میں سب کو معلوم ہیں۔ یہ بالکل صحیح کہ عین موقع پر اُن مجبوریوں سے جن کا ذکر شاید بعد کو آئیگا اہل کوفہ کثرت کے ساتھ امام حسین کی امداد کو نہیں پہنچ سکے یا نہیں پہنچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ یقینی تھا کہ بعد کو اہل کوفہ کے دل میں ایک عجیب بیقرار احساس پیدا ہوگا اس کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی، اور یہی احساس آگے بڑھ کے اور پرورش پا کے ایک عظیم سیلاب کی صورت میں اُمنڈیگا جو اس سلطنت کے بیڑے کو ہمیشہ کیلئے ڈبو کر چھوڑے گا۔ جس کا نتیجہ ہوگا امام کی فتح اور دشمن کی شکست دیکھیے گا کہ بعد کو ایسا ہی ہوا یا نہیں کہ ادھر امام حسین شہید ہوئے اور ادھر اہل کوفہ کے

جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا اور یہ احساس دل کے اندر کروٹیں لینے لگا کہ ہمارا بلایا ہوا مہمان تھا جو ہمارے تغافل یا تساہل کی بدولت مارڈالا گیا۔

امام حسین تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن یہ بات نہ ہوتی جو کوفہ کی طرف آنے میں ہوئی۔ اُس وقت آپ کی شہادت ممکن ہے کہ شکست ہی ہوتی لیکن اب فتح اور دائمی فتح ہو گئی یہی وجہ تھی کہ آپ نے حضرت مسلم کی شہادت سننے کے بعد بھی اپنے ارادہ کو مضبوطی سے قائم رکھا اور اپنے آخری انجام کی ذمہ داری اہل کوفہ پر باقی رکھی وہ لوگ جو مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقینی نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال میں حق بجانب تھے مگر انھیں حسینی مقصد کا اندازہ نہ تھا آپ کے روانگی عراق کا ارادہ اگر حقیقتاً کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بیشک اب ارادہ کو بدل جانا چاہئے تھا اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ حضرت کے سامنے کوئی امیدوں کا سبز باغ نہیں تھا بلکہ وہ اُس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو حضرت مسلم کی خبر شہادت معلوم ہوئی متزلزل نہ ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگی ارادہ، وعدہ کی سچائی اور بات کی پابندی کا تقاضا یہ تھا کہ آپ انھیں دکھلادیں کہ دیکھو ہم اپنے وعدہ پر قائم ہیں اور تمھارے بلائے ہوئے آتے ہیں اور اُس وقت تک اپنے ارادہ پر قائم رہیں گے جب تک روکے نہ جائیں اور اور جب تک آگے بڑھنے میں خود اپنی طرف سے خونریزی اور امن عامہ کی بربادی کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ابھی مسلم کی شہادت کے اطلاعات ابھی تو نہیں آئے ہیں عام اسباب کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ وہ بڑی خونریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہل کوفہ نے پورے طور پر داد شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سرنگوں ہوئے ہوں اور ممکن ہے اُن کے دلوں میں یہ ارمان ہوں یا بعد میں کہنے کا موقع ملے کہ اگر امام حسین آجاتے تو ہمیں تازہ قوت حاصل ہو جاتی اور حالات کا ورق بالکل پلٹ جاتا اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے ہیں بڑی کمزوری اور کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اب آپ واپس ہوتے تو کس طرف؟ آپ نے اپنے اقدامات سے اُس وقت کی اسلامی حالت کا آئینہ والی

دنیا کو اندازہ کرا دیا۔ عــہ "مکہ اور مدینہ کو خیرباد کہکر انھوں نے وہاں کی حالت کو ظاہر کر دیا اور کوفیوں کے ادعائے غلط آمیز کو انھوں نے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجکر بالکل نمایاں کر دیا اس وقت مکہ اور مدینہ اور کوفہ اسلامی تہذیب کے خاص مراکز تھے جہاں کہ رسول اور علی نے لوگوں کی حالت سدھارنے کے لیے اپنی زندگیاں ختم کر دی تھیں جب ان مقامات کی یہ حالت تھی تو شام، فلسطین، بصرہ، مصر، یمن وغیرہ سے کیا امید کی جا سکتی تھی"، معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی کچھ امید ہونا چاہیئے تو کوفہ ہی سے اور کسی دوسری جگہ سے نہیں۔ آپ نے ارادہ میں تبدیلی کی بس اُس وقت جب حُر کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور اُس نے کہا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لیجائینگے۔ اب امام کا ارادہ بدل گیا، اسلیئے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت سے فوجوں کو درہم و برہم کرتے راستے کو صاف کرتے کوفہ پر حملہ آور ہوں اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ صبر و خاموشی کے ساتھ جس طرح ابتک آ رہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھیں۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی کیونکہ ابتک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ حیثیت سے، اپنے ارادہ سے تھا اور اب حُر کی فوج آجانے کے بعد اس قصد سے کہ آپ کو کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جائے۔ آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا ابن زیاد کی فوج کے ہاتھ میں اسیر اور ابن زیاد کا قیدی بن جانا ہے۔ کیونکہ ابھی یہ حُر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر لفولج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جاتا ہے جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے عــہ۲ "خود اپنے اختیار سے کوفہ کی طرف جانا یہ اور بات ہے اور ابن زیاد کا قیدی ہو کر اُس طرف جانا ایک ایسی بات تھی جو کہ حسین کا سا بلند ہمت انسان کسی طرح منظور نہ کر سکتا تھا"

اسی لیے آپ نے حُر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے چلنے کیلئے آئے ہیں انتہائی ترش اور دلیرانہ جواب دیا کہ موت تمھیں اس سے زیادہ نزدیک نظر آئے گی۔

بیشک پہلی صورت باقی ہے کہ آپ کوفہ جا کر حملہ آور کی صورت سے اور غنیم کی فوج کو پسپا کر کے وہاں اپنا قبضہ جمائیں۔ یہ صورت بیشک پہلی صورت سے مختلف ہے، مگر ایک تو آپ کے ساتھ موجودہ فوجی طاقت ایسی نہیں ہے کہ

عــہ سید خورشید حسن صاحب نقوی عــہ۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

ایک سرکاری منظم عسکر کا مقابلہ کر سکے اور بغیر ایسی طاقت کے موجود ہوئے ایک جگہ گھیر لیے جانے کے بعد حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بہتر کے ساتھ تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا تو عین شجاعت و ہمت اور صحیح طریقہ کار ہے مگر اس قلیل تعداد کے ساتھ غنیم پر جارحانہ حملہ کرنا سوائے تہور اور ناعاقبت اندیشی کے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے یہ آپ کے اُس مسلک کے خلاف ہے جو آپ نے شروع سے قائم کر رکھا ہے کہ آپ کی طرف سے بغاوت اور شورش انگیزی کی سی کوئی صورت نہ پیدا ہونے پائے۔ یہ آپ کی طرف سے ایک عملی جنگ کا اقدام تھا جس کی ذمہ داری آپ اپنے اوپر لینا پسند نہ کرتے تھے اور تشدد کا راستہ خود اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے پہلی ہی گفتگو میں جو حُر کے ساتھ ہوئی ہے اس رواداری کا اظہار کر دیا تھا کہ میں بلایا ہوا آیا ہوں اگر میرا آنا منظور نہ ہو تو میں واپس جاتا ہوں یہ بات اُس صورت میں ہوتی جب آپ خود کوفہ پر حملہ کر دیتے یا حُر اور اُس کی فوج سے جنگ شروع کر دیتے جس پر آپ کے بعض اصحاب مصر بھی تھے مگر حضرت نے یہی فرمایا کہ ہم جنگ کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے۔

بس یہ سبب تھا کہ فوج حُر کی اس مزاحمت کے بعد آپ نے کوفہ کا خیال ترک کر دیا اور واپس جانے کا ارادہ کیا کہاں؟ مدینہ یا مکہ یا طائف و یمن وغیرہ کسی اور جانب؟ یہ معلوم نہیں۔

اور یہی جنگ سے حتی الامکان بچنے کا مظاہرہ ہی اس کا باعث تھا کہ جب کربلا کی سرزمین پر پہونچکر فوج حُر نے قطعی آگے بڑھنے سے مزاحمت کی تو آپ نے وہیں پر خیمے نصب کرا دیے کیونکہ اب بغیر جنگ کئے ہوئے آگے نہ بڑھ سکتے تھے پھر آگے بڑھنے کی صورت میں اگر کوئی اہم مرکز آپ کے پیش نظر ہوتا جہاں جا کر آپ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں تو اچھا یوں بھی سہی۔ ان لوگوں سے اپنے مقصد میں سد راہ ہونے کی وجہ سے جنگ بھی کر لی جائے لیکن جب آپ کے آگے کوئی خاص مرکز نہیں ہے جس طرف جائیں اور نتیجہ میں پھر ابن زیاد کی فوج میں گھرنا ہی ہے تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہرینگے آگے بڑھیں گے ایک لاحاصل سی بات ہے۔ جنگ ہو تو پھر وہی آخری جنگ ہو جس میں بیعت اور عدم بیعت کا سوال تھا اور جو آپ نے مدافعتی صورت پر بہترین طریقہ سے انجام دی اس لیے آپ نے اپنی طرف سے اس موقع پر بھی امن پسندی اور رواداری کا ثبوت دیا کہ اچھا تم کہتے ہو تو ہم یہیں قیام کر لیں گے دیکھیں آئندہ حالات کی رفتار کیا ہوتی ہے چنانچہ آپ نے کربلا کی سرزمین پر فرات کے کنارے سے ہٹ کر خیمے نصب کر لیے۔

مکہ سے کوفہ تک کے منازل کی جغرافیائی صورت جو واقعات سے ظاہر ہوتی ہے حسب ذیل تھی،

جس زمین کو اب کربلا کہا جاتا ہے یہ حقیقتاً مجموعہ ہے چند زمینوں اور قریوں کا جو اُس زمانہ میں بالکل پاس پاس واقع تھے۔ اس کی مثال زمینداریوں اور جاگیروں اور موضعات کی حیثیت سے ہر ملک میں موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں ایسا پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعات ارض کے مستقل نام ہوتے تھے جنھیں اگر ہر ایک کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ کئی مقام ہیں اور اگر اُن کے باہمی قرب پر نظر کی جائے تو وہ سب ایک ہی ہیں اور ایک جگہ کا واقعہ دوسری طرف منسوب ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضتہ الحسین" میں لکھا ہے واقعہ کربلا کے محل وقوع میں جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں۔ کربلا، نینوا، غاضریہ، شط فرات انھیں ایک ہی جگہ کے متعدد نام نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے ایک ہی سمجھی جا سکتی تھیں اور اس لیے محل وقوعِ واقعہ کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا۔

"نینوا"، یہ ایک قریہ تھا جسے موجودہ زمانہ کے سدۂ ہندیہ کے قریب سمجھنا چاہیئے، اس کے پہلو میں "غاضریہ" تھا یہ قبیلہ بنی اسد کی ایک شاخ بنی غاضرہ کی طرف نسبت رکھتا تھا اور ان ہی کا محل سکونت تھا یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب "حسینیہ" کے نام سے مشہور ہے اسی جگہ ایک قریہ شفیہ تھا اور یہیں پر ایک قطعہ زمین کربلّہ تشدید لام کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی جانب جنوب کی طرف واقع ہے اس کے متقبل "عقر بابل"، کے نام کا قریہ تھا جو غاضریات کے شمال غربی میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں جن میں بہت اہم آثار قدیمہ کے انکشاف کی امید ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا۔ اور اپنے قدرتی محل وقوع یعنی ٹیلوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب "نواویس" کا مقام تھا جو اسلامی فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سب کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسین کی قبر مبارک ہے۔ حیر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور

پہلو بہ پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرقی کی طرف سے جدھر، حرم حسینی کا "باب السدرۃ" اور "منارہ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب باب زینبیہ کے حدود تک پہونچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف در قبلہ کے مقام تک آ کر ختم ہوتا تھا ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو "ن" کی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا رستہ مشرقی جہت میں اُس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت عباس میں جانے کا رستہ ہے۔ تحقیقاتی انکشاف سے اب تک یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن مکانات کے آثار میں جو قبر امام حسین کے گرد ہیں شمالی اور مغربی جانب زمین کی قدیمی بلندی کے نشان موجود ہیں اور مشرقی جانب سوائے نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے کچھ نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال و غرب کی جانب سے ہلالی شکل کے اوپر بلند تھی۔ یہی ہلالی دائرہ وہ تھا جس میں فرزند رسول کو گھیر کر شہید کیا گیا۔ فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا ہے اُسے براہ راست کوئی تعلق اس کربلا کی زمین سے نہ تھا۔ اُس کا خط سیر حلہ، مسیب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصوں کی جانب تھا کربلا میں اور اس میں بڑا فاصلہ ہے لیکن اس نہر یا دریائے فرات سے ایک چھوٹی شاخ مقام "رضوانیہ" کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے شمالی مشرقی جانب کے ریگستانوں اور نشیبوں سے ہوتی ہوئی اُس مقام سے ہو کر گزرتی تھی جہاں حضرت عباس علمدار کی قبر ہے اور اس کے بعد موجودہ مقام ہندیہ کی طرف سے ہوتی ہوئی اُس مقام کے مغربی شمالی جانب جس کا نام قریہ ذی الکفل ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر "علقمہ" کے نام سے موسوم تھی اور اُسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات کہا جاتا تھا طف کے معنی ہیں "نہر کا کنارہ"، خصوصیت سے دریائے فرات کے اُس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے ہیت تک تھا طف کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے "فرات صغیر" یعنی نہر علقمی کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا طف کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو واقعۂ طف کہا جاتا ہے اور کربلا کو شط فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

چوتھا باب

دوسری سے دسویں محرم تک

حسین کربلا میں ٹھہر گئے۔ حُر نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دے دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور "دستبیٰ" کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کے فرزند عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے حکومت "رے" کا پروانہ لکھا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانے کے لیے باہر نکل بھی چکی تھی اور عمر بن سعد اس فوج کو لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا۔ اب امام حسین کی مہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو مامور کیا کہ پہلے اس مہم کو سر کر لو۔ پھر ایران کی طرف روانہ ہونا۔ عمر سعد صحابی تو نہیں مگر تابعی ضرور تھا۔ عین حضرت عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اس کی پیدائش ہوئی تھی (تقریب التہذیب حافظ ابن حجر مطبوعہ دہلی ص ۱۹۰) اس کے سن تمیز تک پہونچنے تک بہت سے صحابۂ کرام موجود تھے یقینی اُن کی زبانی اُس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبر اکرمؐ نے حسن و حسین کے بارے میں ارشاد کئے تھے۔ نیز حسین کے ساتھ رسول کی انتہائی محبت کے واقعات بھی گوش زد ہوئے ہوں گے۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب کے زمانۂ خلافت میں جبکہ امام حسین بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کمسنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسین کے محاسن ذات اور بلند اوصاف و اخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا۔ پھر جبکہ آپ مدینہ تشریف لے گئے تو اُس وقت سے اب تک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اُسے امام کے تقویٰ و عبادت، خوش اخلاقی اور سخاوت کے کتنے ہی واقعات سننے میں آئے ہوں گے

ان تمام امور کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حضرت امام حسین سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اُسے ایک گناہ خیال کرتا تھا۔ اُسے یہ تصور بےچین کرتا تھا کہ مجھے کس سے لڑنے کے لیے بھیجا جارہا ہے، چنانچہ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے کہا اچھا تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کرو۔ یہ معاملہ سخت تھا، عمر سعد کو رے کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی یہاں تک کہ اُسے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی۔ مہلت مل گئی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب و اعزا سے مشورہ لینا شروع کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔ حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی "آپ حسین سے جنگ کو نہ جائیے اور گناہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتۂ قرابت قطع کرنے کے مرتکب ہو جیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسین کے خون کا بار اپنی گردن پر لیجیے۔" (طبری ج ۶ ص ۲۳۳)

یہ وہ پہلو تھا جسے سچے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر رے کی حکومت کا خیال دلا رہا تھا۔ وہ دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اُس کے اشعار ظاہر کر رہے تھے:۔

اا ترك ملك الری والری رغبتی ۔۔۔ ام ارجع مذموما بقتل حسین

وفی قتله النار التی لیس دونها ۔۔۔ حجاب وملك الری قرة عینی

(یعنی) کیا میں رے کی حکومت چھوڑ دوں درانحالیکہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسین کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار رہوں؟! اُن کو قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے اور رے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے (کتاب البلدان علامہ ابن الفقیہ ص ۲۷۱)

دوسرے لوگ اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسین کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اُس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہو گا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں پھر رے کی نقد حکومت کو چھوڑ کے آخرت کے رحمت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟!

غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے اس لیے کہ نتیجۃً عمر بن سعد کے عمل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی وقتی دلفریبی غالب آئی اور اُس نے رسول کے فرزند سے جنگ پر کمر باندھ لی مگر ایک آخری مرتبہ ضمیر کی چٹکیوں نے اُسے آمادہ کیا کہ وہ پھر ابن زیاد سے کمزور الفاظ میں سہی معذرت کرلے چنانچہ اُس نے آکر کہا کہ آپ مجھکو دستبیٰ اور دیلم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کرچکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہوگیا ہے اور میری فوج والوں نے بھی وہاں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھکو اُدھر روانہ کیجیے اور حسین بن علی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اشراف اہل کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت اور فن سپہگری و مہارت جنگ میں مجھ سے کم نہیں ہیں روانہ کردیجیے عمر سعد نے چند آدمیوں کے سرداران اہل کوفہ میں سے نام بھی لیے۔ ابن زیاد برہم ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ تمھیں سرداران کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہوگا تو تم سے مشورہ لے کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنی کہو کہ تمھیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کرو۔ عمر سعد نے دیکھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ قربانی پر اُس کا نفس تیار نہیں تھا۔ مجبوراً اقرار کیا کہ میں ہی جاؤں گا چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمر بستہ تھی کربلا کی طرف روانہ ہوگئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسین کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن یعنی تیسری محرم کو کربلا پہونچ گیا (طبری ج ۶ ص ۲۳۳ الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

حر کے ساتھ ایک ہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچ ہزار ہوئی حضرت امام حسین اور اُن کے مختصر ساتھیوں کے لیے اتنا لشکر بہت تھا مگر نہ معلوم امام حسین کی خاندانی شجاعت اور اُن کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر کتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا۔

عمر بن سعد نے کربلا آکر ایک کوشش معاملات کے رو باصلاح کرنے کی شروع کی عزرہ بن قیس احمسی سے کہا کہ وہ امام حسین کے پاس جاکر آپ کے مقصد نصب العین اور نقطۂ نظر

کو دریافت کرے۔ یہ اُن سات آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے سب سے آخر میں امام حسین کو دعوتی خط لکھا تھا۔ اس لیے اُس کو آپ کے پاس جانے سے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے شرم دامنگیر ہوئی اور اُس نے صاف انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوسرے ایسے ہی اشخاص کہ جو خطوط لکھ چکے تھے انھیں بھی جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبد اللہ شعبی ایک درشت خو سخت مزاج انسان یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے پر تیار ہوں بلکہ اگر مجھے حسین کے قتل کرنے کا بھی حکم ہو تو میں اس مہم کو انجام دیدوں عمر سعد نے کہا نہیں، یہ منظور نہیں ہے، تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں آئے کس لیے ہیں؟ کثیر لشکر امام کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ صائدی جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسین پر پہرہ دے رہے تھے۔ اُنھوں نے دُور سے دیکھ لیا اور امام سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بڑا بُرجگر لیکن بدترین خلق انسان اور انتہائی سفاک و خونریز شخص آرہا ہے ــــ اس کے بعد آئے اور کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کے رکھدینے کا مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں اگر تم اس پیغام کو سنو تو میں کہدوں۔ نہیں تو واپس جاؤں ــــــ وفادار ابو ثمامہ کو کسی طرح یہ گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی اس سلح شوری کے ساتھ ساتھ اسلحہ لے کر امام کے پاس جائے۔ انھوں نے کہا اچھا کم از کم میں تمھاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو لے جاؤں گا۔ شیطنت مزاج انسان نے کسی طرح نہ مانا اور کہا ہرگز نہیں تم میری تلوار کو ہاتھ بھی لگانے نہ پاؤ گے۔ ابو ثمامہ نے کہا پھر تم اپنا پیغام مجھ ہی سے کہدو۔ میں اس کا جواب لے آؤں گا۔ تمھیں اس طرح سے قریب نہیں جانے دوں گا آخر آپس میں سخت کلامی ہوگئی۔ کثیر واپس گیا اور عمر سعد کو تمام واقعہ سے مطلع کیا۔ اُس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا، اُس سے کہا کہ تم جا کر دریافت کرو کہ آپ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں۔ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا امام نے جو اُسے آتے دیکھا دریافت فرمایا تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہر نے کہا جی ہاں یہ ایک شخص ہی قبیلہ حنظلہ کا بنی تمیم میں سے اور اپنے ننھیالی رشتہ سے ہمارا عزیز ہوتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے

اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام کی خدمت میں تسلیم بجالایا اور عمر سعد کا پیغام پہونچایا، وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا "مجھکو تمھارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا" جواب بالکل صاف تھا۔ قاصد واپس جانے لگا۔ حبیب بن مظاہر کو موقع تبلیغ کامل گیا کہنے لگے "اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت تمھاری اور ہماری ہدایت ہوی ہے" قرہ نے کہا میں جو پیغام لایا تھا اُس کا جواب پہونچا دوں، پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، وہ گیا اور عمر سعد سے پورا جواب امام حسین کا بیان کیا۔ عمر سعد کا دل تو پہلے ہی امام حسین کے مقابلہ سے لرز رہا تھا، اس جواب میں اُسے امید کی بجلی چمکتی دکھائی دی اور توقع ہوی کہ اب صلح ہوجائے گی اُس نے عبید اللہ بن زیاد کے نام خط لکھا کہ میں نے یہاں پہونچ کر حسین کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں، کیا مطالبہ کرتے ہیں اُنھوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھکو لکھا تھا اور میرے پاس اُن کے قاصد گئے تھے اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور اُن کے خیالات میں تبدیلی ہوگئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں اُدھر ہی واپس چلا جاؤں گا"

خط پہونچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غرور، دنیا کے گھمنڈ اور تکبر، فرعونیت اور ظلم و سفاکی کے جذبہ کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا۔

الآن اذ علقت مخالبنا بہ یرجو النجاۃ و لات حین مناص

(یعنی)، اب جبکہ ہمارے چنگل اُن تک پہونچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب ہیں، ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے"

اُس نے عمر سعد کو خط لکھا: ۔ "خط پہونچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسین کے سامنے یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور اُن کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کرلیں جب

وہ ایسا کر سکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے۔"

اس خط سے عمر سعد کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ اور تاریکی چھا گئی اس خط کی اسپرٹ بالکل مفسدانہ اور فتنہ پردازانہ تھی۔ پہلے تو بیعت کا سوال ہی حضرت امام حسین سے ایک ناممکن بات کا مطالبہ تھا پھر اس پر یہ کہ بیعت کے بعد بھی حکومت کی طرف سے کسی خوشگوار نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ پھر ہم رائے قائم کرینگے" اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اس کے بعد بھی حکومت حضرت امام حسین کے گزشتہ انکار یا بزعم خود باغیانہ رویہ کے بارے میں کچھ سزا تجویز کرنے کا حق رکھے گی۔

خط کے انداز سے صاف ظاہر ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسین کے روادارانہ جواب سے مغالطہ میں مبتلا ہو گیا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فوج کی کثرت کو دیکھکر حسین ڈر گئے ہیں اور اس لیے وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں جہاں سے آیا ہوں واپس چلا جاؤں گا مگر عمر سعد حسین اور ان کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ حسین کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے۔ کسی مرعوبیت یا خوف پر مبنی نہیں ہے اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے فوراً کہدیا کہ اچھا معلوم ہو گیا کہ امیر ابن زیاد امن وسکون کے خواہاں نہیں ہیں (طبری ج ۶ ص ۲۳۴)

پھر بھی اس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسین کے پاس بھیجدیا۔ امام حسین نے وہی کہا جسے عمر سعد بالکل سمجھ چکا تھا۔ "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں (الاخبار الطوال ص ۲۵۲) عمر سعد نے یہ جواب امام حسین کا ابن زیاد کے پاس بھیجدیا۔

حقیقت میں عمر سعد ایک بے جان لاشے کی طرح اپنے عمل کو حکومت کی مرضی کی تعمیل میں اپنے ضمیر کے بالکل برخلاف چلا رہا تھا اس کی قوت ارادی میں خود کوئی جان نہ تھی وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے مگر اس طرح کہ میری خیر خواہی حکومت پر کوئی حرف نہ آئے۔ ابن زیاد کو اس خط کا مضمون دیکھکر بڑا غصہ آیا وہ سمجھا کہ اتنی فوج حسین کو مرعوب کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئی۔ اس لیے اس نے کوشش کی کہ

تعداد فوج زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پوری کاوش و کوشش حسین کے نفس اور ارادہ کی طاقت کا اندازہ نہ کرنے کی وجہ سے عمل میں لائی گئی ابن زیاد پہلے ہی دن اگر حسین سے جنگ کرنے اور آپ کو قتل کرنے ہی کا ارادہ کر لیتا اور شروع ہی سے یہی نصب العین قرار دیتا تو وہ شاید اتنی فوج روانہ ہی نہ کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ پھر وہ اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا اور جس طرح جناب مسلمؑ کے مقابلہ میں مزید کمک بھیجنے کی ضرورت پڑی تھی ویسے ہی یہاں بھی ہوتا مگر شروع ہی سے فوج کی تعداد بڑھانے کی اتنی کوشش جنگ کے سر کرنے کے بجائے حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو مرعوب کرنے پر زیادہ مبنی معلوم ہوتی ہے —— وہ گویا دکھلا رہا تھا کہ حکومت کے پاس اتنی طاقت موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کا اندازہ اس بارے میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ اتنی بڑی فوج حسین اور اُن کے ساتھیوں کو اتنا بھی تو متاثر نہیں بنا سکی کہ اُن کے انکار کا آہنگ کچھ مدھم ہی ہو جاتا۔

ابن زیاد نے فوج کی تعداد بڑھانے کے جو انتظامات کئے وہ تاریخ میں درج ہیں پانچہزار فوج تو گنی جنی ہوئی آپ سُن ہی چکے ہیں۔ چار ہزار کی فوج حصین بن تمیم کوتوال شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے ناکہ پر تھی جو عذیب، واقصہ، تعلع، اور خفان تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی۔ ابن زیاد نے اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا۔ اور خود کوفہ سے باہر نکل کر نخیلہ میں جو کربلا کے راستے میں تھا آکر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے در پے کربلا کی جانب روانہ کرے۔ بڑے بڑے سرداران کوفہ حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، عمرو بن الحجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ ہوں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اکیلا نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی مسموع نہیں ہوتا تھا چنانچہ شبث نے بیماری کا عذر کیا ابن زیاد نے کہا تم بیمار بن رہے ہو۔ اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد

کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ ابن زیاد کو اس کا علم ہو گیا تو اُس نے سوید بن عبد الرحمن منقری کو تھوڑے سے سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے کہ حسین سے جنگ کو نہیں روانہ ہوا ہے اُسے گرفتار کر کے لے آیا جائے سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی ترکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا ہوا تھا سوید نے اُسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیجدیا، اُس کی گردن ماری گئی۔ اس سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب حسین سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۵۲) اب میں سمجھتا ہوں تاریخ میں مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت ہے کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسے علامہ مجلسی نے اختیار کیا ہے۔ یا پینتیس ہزار تھے جسے ابن شہر آشوب نے لکھا ہے یا ایک لاکھ تک جیسا بعض اہل مقاتل نے لکھا ہے۔ بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے یہ ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں اُنڈل آئی تھی اور کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مار رہی تھی۔

فوجوں کی طاقت بڑھانے کے بعد بھی جب حسین اور اُن کے ساتھی خوفزدہ اور متاثر نہیں ہو سکے تو ایک بڑا بے پناہ اقدام یہ کیا گیا کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے اور وہ پیش کرتی ہے یہ موقع کہ جب خلیفہ سوم حضرت عثمان مدینہ کے دارالامارہ میں محصور تھے اور مصر کے بلوائی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور پانی کا پہونچنا شہر کے اندر بند ہو گیا تھا تو ان ہی حسین کے پدر بزرگوار حضرت علی نے مشکیں پانی کی دارالامارہ میں بھجوائی تھیں اور خود حسین اور ان کے بڑے بھائی حسن کو بھیجا تھا کہ دیکھو پانی پہونچنے میں رکاوٹ نہ ہو۔

اس کے بعد یہ بھی موقع یاد ہے کہ جنگ صفین میں اتفاق سے امیر معاویہ کا لشکر فرات کے گھاٹ پر حضرت علی کی فوج سے پہلے پہونچ گیا تو معاویہ کے حکم سے ابوالاعور سلمی نے دس ہزار شامیوں کی فوج کے ساتھ گھاٹ کا رستہ روک لیا اور حضرت علی کے لشکر پر پانی بند کر دیا گیا۔ ایک رات دن یہ لوگ پیاسے رہے آخر حضرت علی نے حکم دیا کہ

جنگ کرکے انھیں گھاٹ پر سے ہٹا دو۔ مالک اشتر اور دوسرے افسروں نے حملہ کرکے بہادری کے ساتھ فوج شام کو گھاٹ سے ہٹا دیا اور خود فرات پر قبضہ کیا۔ اس وقت ہوا ہوگا اہل شام کو اندلیشہ کہ اب علی ہم پر پانی بند کردینگے مگر حضرت علی کا جب گھاٹ پر قبضہ ہوا تو آپ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ خبردار اہل شام کو پانی لینے سے منع نہ کیا جائے۔ نتیجہ یہ تھا کہ گھاٹ پر علی کی فوج کا قبضہ تھا مگر شام والے بڑے اطمینان سے آ آ کر پانی پیتے تھے اور پانی بھر کرلے جاتے تھے اور کوئی تعرض اُن سے نہ کیا جاتا تھا (الاخبار الطوال ص۱۷۰)

مگر افسوس دنیا کی نابینائی اور بے انصافی آج معاملہ کو برعکس کرتی ہے۔ ناکردہ گناہ بلکہ محسن ہستی کو گناہگار بنا کر اپنی ستم کیشی کو انتقام کے پردہ میں چھپاتی ہے۔ ابن زیاد کا خط آتا ہے عمر بن سعد کے پاس کہ حسین اور اُن کے اصحاب پر پانی بند کردو اور انھیں ایک قطرہ بھی پانی کا نہ ملے جیسا کہ مظلوم خلیفہ عثمان بن عفان کے ساتھ کیا گیا تھا (ذرا سے لفظوں کے اختلاف کے ساتھ طبری ج ۶ ص ۲۳۴ اور الاخبار الطوال ص ۲۷۲ دونوں قدیم مورخین کے یہاں یہ خط درج ہے) عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمر بن حجاج زبیدی کو پانچسو سواروں کی فوج کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کردیا کہ ایک قطرہ پانی کا حسین اور اصحاب حسین تک پہونچنے نہ پائے۔ دینوری نے تصریح کی ہے کہ یہ امام حسین کی شہادت سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے (الاخبار الطوال ص۲۵۳)

ع۱ "وہ سرچشمہ ہمدردی جس نے ابھی چند روز ہوئے اپنے دشمنوں کی پوری فوج کو سیراب کیا تھا اب اس کے ننھے ننھے بچے ایک ایک قطرہ پانی کو ترس رہے ہیں" کیا حسین کے موقع کی دشواری کا اندازہ اس وقت کچھ دشوار ہے؟ عالم یہ تھا کہ

ع۲ "محاصرہ کن فوجوں کی گھنی اور تاریک صفیں، پے در پے چمکتی ہوئی انیوں اور تلواروں کی باڑہ کا انبوہ بڑھتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نہ صرف اپنی بلکہ عورتوں اور معصوم بچوں کی پیاس جنگل کی آگ کی طرح بڑھ رہی تھی۔ موقع فہمی کی راہ میں اب کوئی چیز حائل نہ تھی یعنی یہ امر بالکل صاف تھا کہ اب ہم اہل کوفہ کی مدد نہیں کرسکتے

ع۱ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ع۲ ریاض صاحب بنارسی

نہ اہل کوفہ اپنی جگہہ قائم ہیں۔ قائد لشکر یزید سے یہ گفتگو ہو چکی کہ ہم کو واپس جانے دو لیکن گروہ یزید اس پر راضی نہیں ہوتا۔ کیا معنی تھے اس کے یعنی دو بڑی باتوں میں اہل کوفہ کی مدد کا موقع ناممکن تھا لیکن اب تک یہ ممکن تھا کہ حکومت یزید سے یہ عہد ہو جائے کہ ہم کوفہ نہ جائیں اور وہ ہم پر بیعت کا جبر نہ کرے اور اس طرح ایک بڑا اصول اپنی جگہ قائم رہے لیکن یزید کی حکومت جواب دیتی ہے کہ ہمارے چنگل میں آکر نکلنا چاہتے ہو۔ اس نے ہر شخص کے گزشتہ خوف اور خیال کو بالکل صاف کر دیا کہ یزیدیت جس وقت حسین پر قبضہ پاتی بیعت یا قتل کے علاوہ کسی اور بات پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ اب وقت تھا کہ جس جس طرح حسین پر دشمن کی سختی بڑھتی جاتی۔ اُن کے انکار کے معنی اور اُس کا درجہ واضح ہوتا جاتا اور دشمن اپنے تمام ممکن ذرائع ختم کرنے کے بعد بھی اس تسکین کا موقع نہ پاتا کہ ہمارے اتنے سامانوں نے چند بچوں، بڈھوں اور جوانوں کو مرعوب کر لیا یا ہم اپنی بات منوا سکے"۔

پھر بھی وہ امن وسلامتی (ایمان واسلام) کے پیغمبر کا نواسا تھا جس نے ایک مرتبہ اور امکانی درجہ تک دشمن کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش اور صلح وآشتی کی فضا قائم رکھنے کی خواہش کی اُن کو اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کا محفوظ رکھنا حتی الامکان مدنظر تھا جو اُن کے نانا کی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے بشرطیکہ اُس سے اہم مذہبی مفاد قربان نہ ہوتا ہو عـ۱ "آپ شہادت کا آئیڈیل (مثالیہ) دنیا کے سامنے پیش کیا چاہتے تھے اور اس کے لیے آپ کا تمام حجتیں ختم کر دینا نہایت ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ہر موقع پر نہایت ملائمت برتی ہی اپنی طرف سے حفظ نفس کا کوئی احتیاطی پہلو جو اصول خودداری اور منزلت مذہب سے متصادم نہ تھا فروگذاشت نہیں فرمایا"۔ چنانچہ عـ۲ اپنے دشمنوں کو دائمی عذاب سے بچنے کا ایک آخری موقع دینے کے لیے انھوں نے عمر بن سعد کو ایک نجی گفتگو کی دعوت دی۔ دونوں خیام کے مابین خیموں کی آگ کے دھوئیں کی وجہ سے ہلال زرد ہو گیا تھا اور اُس کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی، اُس ریگستان کے آسمان پر

عـ۱ مولانا اختر علی صاحب تلہری عـ۲ ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب (ٹریجڈی آف کربلا)

جہاں کہ حسین اور عمر بن سعد دونوں اپنے اپنے خیموں سے نکل کر تیس تیس ہمراہیوں کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب ایک دوسرے کے پاس پہونچا تو ہمراہی ٹھہر گئے۔ دونوں سپہ سالار ملے گھوڑوں سے اُترے اور بہت دیر تک گفتگو میں مشغول رہے چاند آہستہ آہستہ آسمان پر رینگتا رہا اور ستارے اپنا خاموش رابطہ کرتے رہے صحرا میں رات کی تازہ ہوا سے خیمہ کے پردے متحرک تھے جبکہ یہ دونوں رات کو دیر تک گفتگو میں مشغول رہے ان کے ہمراہی کچھ سُن تو نہ سکتے تھے لیکن وہ نگراں رہے کہ دیکھیں اس گفتگو کا کیا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی صحیح طریقہ پر نہ معلوم ہو سکا کہ ان میں کیا گفتگو ہوئی اس بڑے شہید کی یہ آخری اپیل جبر و تشدد کی قوتوں کے سامنے تاریخ کے طالب علم کے سامنے کم و بیش ایک راز ہی رہے گی " مگر مختصر طور پر اتنا معلوم ہو سکا کہ بات اتنے پر ختم ہوئی جاتی تھی کہ حضرت امام حسین عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دینگے اور اگر ضرورت ہو تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دینگے اور کسی دور و دراز جگہ پر چلے جائیں گے۔

غور کیا جائے تو اس صورت سے بھی حسین کی جیت تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اُس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی۔ پھر بھی آپ کا رویہ اتنا نرم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ صلح کے راستے پر گامزن ہیں اور اُس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت امام حسین کی اس شرط مصالحت سے اطلاع دی ان الفاظ کے ساتھ کہ الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور امت اسلامی کا معاملہ رو باصلاح ہو گیا۔ آخر میں اُس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے طبری میں ہے کہ ابن زیاد نے بھی بہت خوشی کے ساتھ اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیر خواہانہ ہے۔ ہمیں اس صورت کو منظور کر لینا چاہیئے مگر شمر بگڑ گیا اور کہنے لگا " بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اُسے چھوڑ دے! حسین آپ کے پاس پہلو میں آگئے ہیں اگر آج وہ چلے گئے اور اُنھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیے

کہ قوت و عزت اُن ہی کا حق ہوگا اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصّہ۔ میری رائے میں
کبھی اُن کی یہ خواہش منظور نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بڑی ذلّت کی بات اور کمزوری کی
نشانی ہے بے شک اُنھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا چاہئیں اور آپ کے سامنے
سرِ تسلیم خم کر دیں۔ پھر اگر آپ انھیں اُن کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق
ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اُس کا کیا ذکر! میں نے
تو سُنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسین کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے"۔

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدانہ اور فتنہ پردازانہ تقریر تھی۔ جس سے ایک
طرف تفوق طلبی اور ظفر انجامی کے جذبہ کو حرکت پیدا ہوئی، دوسری طرف انانیت، غرور اور
خودی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی جانب سے بدگمانی ہوگئی اور وہ
خلوص اور سچائی کا اثر جو اُس کی تحریر سے پیدا ہوا تھا رخصت ہو گیا۔ شمر بڑا خیر خواہ
دوست اور سچا مشیر کار معلوم ہوا اور عمر سعد پر غصّہ آیا کہ وہ لڑنے گیا ہے اور رات رات
بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے حسین سے مل گیا ہے۔ ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے
پھر ایسے مشتبہ شخص کا سردار لشکر رکھنا کیسا ہے؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے
طرزِ عمل کا تدارک ہو اور حسین کے ساتھ ہر قسم کی مصالحانہ گفتگو کا سدباب ہو۔ اُس نے
اسی غصّہ کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا:۔ "میں نے تم کو حسین کی جانب اس لیے
نہیں بھیجا ہے کہ تم اُن کے ساتھ مراعات کرو یا اُن کے ساتھ معاملات کو طول دو یا
اُن کو زندگی کی امیدیں دلاؤ یا میرے پاس اُن کی سفارش کرنے بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین
اور اُن کے اصحاب میرے حکم پر سرِ تسلیم خم کریں اور اپنے تئیں میرے رحم و کرم کے سپرد کر دیں
تو ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو اُن پر حملہ کر کے اُنھیں قتل
کر ڈالو اور اُن کے اعضا کو قطع کرو کیونکہ وہ لوگ اسی کے مستحق ہیں"۔ اتنا ہی نہیں اسلام
کے نام کو بدنام کرنے والے، انسانیت کی پیشانی کو عرق انفعال سے تر کرنے والے اور تاریخ
کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنیوالے یہ الفاظ ہیں جو کسی اور کی نسبت نہیں، رسول کے
سب سے پیارے نواسے حسین کی نسبت لکھے جا رہے ہیں کہ "اگر حسین قتل ہو جائیں تو

اُن کے سینہ اور پشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا۔ کیونکہ وہ سلطنت کے باغی مخالف اور حریف ہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد اُن کو کوئی نقصان پہونچے گا لیکن میں یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسین کو قتل کروں تو اُن کے ساتھ یہ سلوک کروں گا اگر تم نے ان احکام کا اجرا کیا تو خیر تمھیں معاوضہ ملے گا جو ایک وفادار و فرمانبردار شخص کو ملنا چاہیے اور اگر تمھیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علحدہ ہو جاؤ اور اس منصب کو شمر کے سپرد کردو جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کردی ہیں"

یہ خط شمر کے سپرد کیا اور زبانی بھی اُس سے کہدیا کہ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو وہ معزول ہے اور تم اُس کی جگہہ سردار لشکر ہو تم جنگ کرنا اور عمر سعد کو قتل کرکے اُس کا سر میرے پاس بھیجدینا۔

یہ تعجیلی اور تنبیہی حکم نامہ شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجدیا گیا۔ اب جنگ کا التوا غیر ممکن سا ہوگیا ع۵ "اس کتاب میں حسین کے نظریات کی توضیح کی جاچکی ہے۔ ایک دفعہ یہاں پھر سمجھ لو کہ وہ کسی ایک فرد کے حق کو ظاہر کرنے یا کسی ایک فرد کی غلطی کی تلافی کرنے نہیں آئے تھے بلکہ وہ عام انسانی حقوق کی پیشوائی و نمایندگی کے لیے آئے تھے۔ اُن کی جنگ انسانی حریت مساوات اور اخوت کے لیے تھی۔ وہ ایک سماجی غلطی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ حضرت محمد مصطفٰے نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ایک زبردست تمدن قائم کیا تھا۔ اپنی رسالت کے تھوڑے ہی زمانہ میں اُنھوں نے عربی سماج کو یکسر بدل دیا اُنھوں نے عربوں میں زندگی کی ایک لہر، ایک جذبہ کا وہ خزانہ بھر دیا تھا کہ عرب اب گویا تہذیب و تمدن کی مشعل ہو گئے تھے ساری دنیا کے لیے ـــــــ بگڑی ہوئی انسانی سوسائٹی کو متوازن کرنے کے لیے اسلام نے ذاتی اغراض و مقاصد اور لوگوں کی خودکامیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ امویوں کو اسی سے عناد تھا۔ شام کو اپنی مستقل حکومت بناکر انھیں اپنے مقصد کی تکمیل میں نئی راہیں دکھائی دیں۔ قتل حضرت عثمان کے انتقام کا بہانہ لے کر شاہ دمشق کو اس اسلامی قیادت کے خلاف محاذ قائم کرنے کا اچھا موقع ملا سیاسی

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

چالیں چلی جانے لگیں اور اسلامی تاریخ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان کی خونریزیوں سے خونیں دکھائی دینے لگی۔ مکہ و مدینہ کو بھی ان کے مہلک اثرات کا شکار ہونا پڑا۔ بصرہ و کوفہ میں زندگی کی لہر باقی نہ رہی۔ یزید کی ولیعہدی اور جانشینی گویا اس تمدن اسلامی کے خلاف اعلان جنگ تھی حسین سے حکومت دمشق کی اطاعت قبول کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس شاہی حکم کے سامنے جھکنے کی کس کو مجال تھی؟ حسین بن علی نے اس شاہی مبارزطلبی کو قبول کیا۔ یقیناً اُن کا یہ فعل بڑی شجاعت اور بہادری کی مثال ہے۔ اموییوں کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حسین اُن کی باتوں کو جلد مان لیں گے حسین کے لیے اس قسم کا ظہور تعجب خیز نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جنگ جمل اور صفین یقیناً معرکۂ کربلا کا مقدمہ تھیں۔ اُنھوں نے واقعات پر غور کرکے اُن کا ایک خاکہ اپنے دماغ میں پہلے ہی سے بنا لیا تھا۔ مکہ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حسین کا مکہ کو اپنے لیے جائے پناہ قرار دینا فی الاصل امویوں کی سیاست کے تار و پود بکھیر دینا تھا اور یہ ظاہر کر دینا مقصود تھا کہ بنی امیہ کو دنیاوی فتح کا اتنا شوق ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو اپنی بات پوری کرنے کے لیے وہ احترام خانہ کعبہ کو بالائے طاق رکھکر اُسے قتل گاہ بنا دینے میں دریغ نہ کرینگے حسین عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفیوں میں کوئی جان باقی نہیں تھی لہذا حسین کربلا گئے اور اُنھوں نے صلح کے شرائط پیش کیے جو انتہائی معقول تھے۔ یہ شرط کہ ان کو اجازت دی جائے کہ وہ اموی سلطنت سے کہیں باہر چلے جائیں یزیدی حکومت نے ٹھکرادی اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ اس حکومت کی بنیادیں کتنی ناقص ہیں وہ حسین کی شخصیت اور قدر و قیمت کو بھی بخوبی جانتی تھی اور گویا وہ احساس کمتری میں گرفتار تھی حسین جہاں رہتے اُس کو یہ اندیشہ تھا کہ کبھی نہ کبھی حسین کہیں قلوب خلق کو اپنی طرف کھینچ نہ لیں۔ اس لیے اُس نے اپنی شرط کو یہیں تک محدود رکھا کہ غیر مشروط اطاعت یا پھر تلوار حسین کو ان دونوں میں سے ایک کو منتخب کرنا تھا تلوار اس میں شک نہیں کہ حسین کو ختم کرسکتی تھی لیکن بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت اس پیغام کو فنا کر دیتی جس کو حسین قائم رکھنا چاہتے تھے۔ بیعت سے ممکن ہے کہ وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے جا

اور پھر کسی خفیہ حربہ سے شہید کر دیے جاتے لیکن اگر وہ زندہ بھی رہتے تو یہ زندگی خود اُن کی آنکھوں میں کتنی ذلیل ہوتی ؟! تلوار فوری موت کا سبب تھی لیکن وہ اُن کو زندۂ جاوید بنا دیتی تھی حسین کے نفس کو بچانے بغیر صورت حال نازک ضرور ہے ذرا دوسری تاریخی عظیم شخصیتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا جن کے اوپر بھی کوئی ایسا ہی موقع گزرا ہو اور دونوں کا موازنہ کیجئے تب حسین کے نظر انتخاب کی داد دیجئے۔ جو ذاتی مفاد کو مدنظر رکھیں گے وہ حسین کے اس انتخاب کو عزت کی نظر سے نہ دیکھیں گے لیکن جو انسانی بہبودی و فلاح کے علمبردار ہیں وہ حسین کے انتخاب کی داد دینگے۔ حسین کی ذات نہایت اہم و ذمہ دار تھی۔ وہ ایک خاص مقصد کو لے کر آئے تھے۔ وہ صلح کر سکتے تھے لیکن اطاعت قبول نہیں کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے صلح کو بھی محدود کر دیا تھا کہ اس میں بیعت کر لینے کا کوئی پہلو نہ نکلے۔ وہ ملک چھوڑ کر کسی سرحدی مقام پر جا سکتے تھے۔ اپنی تمام املاک کو چھوڑ سکتے تھے لیکن کسی صورت میں اپنے مقصد حیات سے دستکش نہیں ہو سکتے تھے اور اپنے اصول سے سرِ مو منحرف نہیں ہو سکتے تھے۔ اصول غیر قابل تبدیل ہوا کرتا ہے حسین جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق ہے ہر بات برداشت کر سکتے تھے اور اُنھوں نے ایسا کرنے سے گریز نہیں کیا۔ وہ اپنی ذات کے مالک تھے، اپنے نفس پر پورا اختیار رکھتے تھے لیکن جہاں سے اصُول کے تحفظ کی منزل شروع ہوتی تھی وہ اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو اصُول کے تلف کرنے کا اختیار نہیں تھا وہ اصول کے محافظ تھے، اُس کے امین تھے، مگر اُس پر کوئی تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے اور نہ اس کا انھیں جواز تھا حضرت محمد مصطفٰے نے اس اصول کو امتحان کے اوقات میں قائم رکھا۔ حضرت علی نے اُس کو زندگی بھر نباہا۔ حسن بھی نا امیدی کی حالت میں بھی اس پر قائم رہے۔ اب حسین کے ہاتھ میں سارا اختیار تھا کہ وہ تاریخ کو چاہے بدل دیتے یا سنوارتے لیکن اللہ ری امانت کی فرض شناسی، اُنھوں نے تمام ذاتی خیالات کو نظر انداز کر دیا۔ تمام مادی خواہشوں کو محو کر دیا۔ اور بغیر مہلک نتائج کا خیال کئے ہوئے آخر وقت تک اپنے اصُول کی بقا پر قائم رہے ــــ"

حقیقت میں بیعت کرنا ہوتی تو امام حسین پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے۔ اب خطرہ کو بالکل سامنے دیکھکر وہ اس بیعت یا اطاعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسین نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسین بیعت یا غیر مشروط اطاعت ہرگز نہ کرینگے اس لیے جونہی اسے ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ پہونچا اور اس نے کھول کر پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا "کمبخت یہ تونے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو ہی نے ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسین کبھی اپنے تئیں ابن زیاد کے رحم و کرم پر نہ چھوڑینگے۔ یقیناً حسین ایک غیور دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔ شمر نے کہا ان باتوں کو جانے دو! یہ بتاؤ کہ اب کروگے کیا؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل کروگے یا سرداری کو میرے سپرد کروگے؟

کمزور دل والا، دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے وقتی اعزاز اور جاہ و ثروت کے ہاتھ سے چلے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا۔ وہ دنیا کے عشق میں اس وقت اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر تیار ہو جاتا تھا جس میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔ خطرہ بالکل نقد تھا اور اپنا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب تھا جس پر تمام فیصلہ کی بنیاد تھی جس کے ساتھ بس فقط سرداری رہنے اور نہ رہنے کا سوال نہ تھا بلکہ جیسا ابن زیاد کی گزشتہ تقریر سے معلوم ہوا جان کا مرحلہ بھی درپیش تھا یعنی مخالفت کی صورت میں قتل کیا جانا بھی یقینی تھا۔ اس کے لیے تو ویسے ہی جذبۂ حق پسندی کی ضرورت تھی جو راہ حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے۔ مگر عمر سعد اس جذبہ سے عاری اور ثبات و استقلال سے خالی تھا۔ شمر کے اس سوال پر اُسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں

میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا۔ اب شمر کا وجود اُس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اپنی نسبت ظاہر ہو چکی تھی اور اُسے اپنی وفاداری اور اخلاص مندی کا ثبوت دینا تھا اس لیے اب جنگ میں تھوڑی بھی تاخیر اُس کے نزدیک مناسب تھی۔ اور اس لیے اُسی وقت حملہ کی تیاری کر دی اور نویں ۹ تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسین پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسین عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور کچھ نیند غالب ہو گئی تھی ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینب کے کان میں گئی آپ گھبرا کر امام حسین کے قریب آئیں اور ہوشیار کیا کہ دیکھیے دشمن کے لشکر کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ چونکے اور فرمایا میں نے ابھی رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت فرماتے ہیں تو عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتا ہے۔ اچانک حملہ کی وحشت سے زینب کا دل دہلا ہوا تھا ہی۔ اب جو بھائی نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینب مضطرب ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے مُنہ پیٹ لیا اور کہا "ارے یہ غضب!" امام نے بہن کو تسکین دی فرمایا اے بہن غضب تمھارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو۔ خدا مالک ہے" ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ جناب عباس بھی پہونچ گئے اور کہا بھیا! لشکر آ گیا۔ حضرت یہ سُن کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا اے عباس سوار ہو اور ان کے پاس جاؤ۔ ان سے پوچھو کہ اس وقت نئی بات کیا پیدا ہوئی۔ ان کے طرزِ عمل میں تبدیلی کیوں ہوئی اور اس بے وقت کے حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ آپ نے جا کر دریافت کیا تمھاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ ہو" آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمھارا مطالبہ پیش کرتا ہوں، اس کے بعد جو کچھ فرمائیں گے تم سے آ کر بتلا دوں گا۔ جناب عبّاس گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسین کی خدمت میں گئے کہ آپ کو واقعہ سے اطلاع دیں، اتنی دیر میں

حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوج مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسین کی بیگناہی پر اُن کو قائل معقول کرتے رہے، یہاں تک کہ جناب عباس واپس آئے اور فرمایا کہ امام نے ایک رات کی مہلت مانگی ہے۔ صبح کو دیکھا جائے گا عمر سعد شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا اس لیے اب وہ امام حسین کے معاملہ میں خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ اُس کو شمر کی ذات سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا جو آپ کی رائے۔ افسر آپ ہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے" وہ سمجھا کہ شمر کا یہ فقرہ اُس کا دل لینے کیلئے ہے اس لیے اُس نے کہا" میں تو چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے"، مگر اصل میں اُس کا ضمیر اس کے خلاف تھا۔ اس لیے اب وہ متوجہ ہوا دوسرے سرداروں کی طرف اور کہا کیوں تمھاری کیا رائے ہے عمرو بن حجاج زبیدی (وہی ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی جو اُن کے قتل کی غلط خبر سُن کر فوج لے کے دارالامارہ پر چڑھ دوڑا تھا) نے کہا "سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلۂ ترک و دیلم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمھیں اُن کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی" قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینی چاہیے۔ آخر ایک شب کی مہلت مل گئی اور بڑھی ہوئی حملہ آور فوج پیچھے واپس گئی۔

غور کرنے کے قابل بات ہے کہ ع "حسین نے یہ کیوں کیا؟ کیا وہ تیار نہ تھے؟ کیا اُنھیں کہیں اور سے مدد کی امید تھی؟ کیا وہ میدان جنگ سے کہیں اور چلے جانا چاہتے تھے؟ کیا وہ اس وقفہ سے کچھ اور سوچنا چاہتے تھے؟ اور کیا وہ تمام باتوں کو غور کر کے صبح کو بیعت قبول کر لینا چاہتے تھے؟ کیا چاہے رات ہی کو وہ قتل ہو جاتے یا دن کو قتل کئے جاتے اس میں کوئی فرق ہو سکتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں! اُن کے دماغ میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی"۔

ایک تو آپ نے اپنی مہلت مانگنے کا سبب اُسی وقت جب جناب عباس کو مہلت مانگنے کے لیے بھیجا ہے ظاہر کر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا" ہم آج کی رات اپنے پروردگار

ع سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کی خوب عبادت کرلیں اور دعاؤ استغفار میں مصروف رہیں کیونکہ خدا خوب واقف ہے کہ میں ہمیشہ سے اُس کی عبادت اور تلاوت قرآن اور کثرت دعاؤ استغفار کو محبوب سمجھتا رہا ہوں (طبری ج ۶ ص ۲۳۸ مطبوعہ مصر)

دوسری بڑی مصلحت اس شب کی مہلت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دے دیں اور ایک بار اور یہ کہدیں کہ جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہے وہ چلا جائے تاکہ عین موقع پر کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے یا دل ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے اس شب کو اپنے مجمع کے چھانٹنے کی کوشش کی اور لوگوں کو غور و خوض کر لینے کا پورا موقع دیا۔ ع۵ "نویں" کا دن گزر کر جو رات آتی ہے اُسی کو ہی "شب عاشورا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ رات اتنی ہی اہم اور قابل یاد ہے جیسا خود روز عاشورا حسین نے اس رات کو اپنے ساتھیوں کو بلا کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ ہم ابن خلدون سے نیچے پیش کرتے ہیں:۔

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اتنا جانباز اور وفا شعار نہیں سمجھتا جتنا کہ میرے ساتھی ہیں اور نہ دنیا میں اتنے نیک اعزا کسی کو ملے جیسے نیک اور وفادار میرے اعزا ہیں۔ خدا تمھیں اجر عظیم دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کریگا میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تمھارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ میں ہرگز مزاحم نہیں ہوں گا۔ شامی محض میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر وہ مجھے پالیں گے تو دوسروں کی تلاش نہیں کریں گے" حسین اس وقت اس سیاسی ڈرامے کا جو ابوسفیان کے خاندان والے کھیل رہے تھے مضحکہ اُڑا رہے تھے اور گویا یہ امویوں کی سیاست کا پول کھولنے کا آخری موقع تھا۔ وہ اس بات کو واضح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ کسی مادی چیز کو اپنا وسیلہ نہیں بنانا چاہتے اور نہ وہ کثرت افواج سے مرعوب ہیں اُنھوں نے یہ بھی صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی قسمت کے فیصلہ کو جانتے ہیں اور موت کا

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

مقابلہ کرنے کے لیے بخوشی تیار ہیں۔ اُن کا یہ خطبہ دشمن کی ریاکاریوں اور غدر تراشیوں کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھا وہ گویا دشمن پر یہ ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ چونکہ وہ اپنی مقدس ذمہ داری کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ اس کے بچانے میں آخر وقت تک ثابت قدم رہیں گے چاہے ان کے ساتھی بھی اُنھیں چھوڑ کر چلے جائیں۔"

کیپٹن ال ایچ بنٹ جے پی ڈپٹی کلکٹر ممالک متحدہ کہتے ہیں:۔

"بعد ختم تقریر آپ نے وہ کام کیا جس کی مثال صفحۂ عالم میں ملنا ناممکن ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو انسانی کمزوریوں کا کس قدر احساس تھا اور کس قدر آپ فیاض اور رقیق القلب تھے اور جذبۂ ایثار کس حد تک آپ میں موجود تھا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ خیموں کے تمام چراغ گُل کر دیے جائیں اور جس کا جہاں جی چاہے اس اندھیرے میں چلا جائے۔ میں نے اپنی بیعت تم سب سے ہٹالی ہے۔"

منشی پریم چند صاحب ورما لکھتے ہیں:۔ "مگر ایک فرد بھی اس دوستانہ فہمائش سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ آج سپاہیوں کو جبراً فوج میں برقرار رکھا جاتا ہے۔ انھیں مصنوعی ذرائع سے شراب پلا کر، یا عقب میں توپیں لگا کر میدان جنگ میں مقید رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسی تحریک سپہ سالار کی جانب سے ہو تو کسی سپاہی کی گرد بھی نظر نہ آئے بڑے بڑے کپتان اور کرنیل گھر کی راہ لیں مگر یہاں ہر طرح سے موقع دینے پر بھی کوئی حضرت حسین کی رفاقت ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ بوڑھا زہیر بن قین سا صحابی کہتا ہے۔ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے کہ میں آپ کی حمایت میں زندہ جلایا جاؤں گا اور پھر زندہ ہو کر جلایا جاؤں گا اور یہ عمل بہتر مرتبہ ہوتا رہے تو بھی میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتا۔"

یہ سب سے آخری جواب تھا ان کے پہلے سعید بن عبداللہ حنفی اور مسلم بن عوسجہ اور سب سے پہلے حضرت ابوالفضل العباس اور تمام اعزا اظہار خیالات کر چکے تھے۔ عزیزوں نے کہا تھا کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں خدا ہم کو یہ روزِ بد نصیب کرے۔ امام نے خاص طور سے اولادِ عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تمھیں اجازت

دیتا ہوں " انھوں نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں"
مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ "ہم آپ کو چھوڑ دیں اور خدا کے یہاں آپ کے حق کو ادا کرنے کے
جو ابدہی کی فکر نہ کریں ؟! یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے
ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار
لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح
جدا نہ ہونگا۔ اگر ہتھیار نہ ہونگے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا
اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں"
سعید بن عبد اللہ حنفی نے کہا "بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا
کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ہم نے رسالتمآب کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے
میں ادا کر دیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا۔ پھر جیتے جی
جلا دیا جاؤں گا پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ
ستر مرتبہ ہو گا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آخری موت آپ
کے قدموں پر نہ آئے۔ چہ جائیکہ یہ تو ایک دفعہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی
عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے"۔ دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی
قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہجہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ
ہم آپ سے جدا ہو جائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کر دینگے۔ ہاں جب ہم مر جائیں تو
پھر جو ہونا ہے ہو۔ ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے (طبری ج ۶ ص ۲۳۸-۲۳۹)

یہ تھا مجاہد کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ وہ دل لبھانے والی
تقریروں سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات سے۔ خوش آیند امیدوں
کے سبز باغ سے اور دلفریب توقعات کے سراب خیال سے اپنے ساتھ والوں کو
گرویدہ بنانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقت حال کو واضح کر کے
غلط فہمیوں کے پردہ کو چاک کر دینا چاہتے تھے ——— یہ کوشش شب عاشور تک
ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک مظاہرہ روز عاشور بھی ہوا جب بشر بن عمر و حضرمی کو

جو انصار امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہنچی کہ ان کا فرزند عمر و رے کی سرحد پر قید ہو گیا۔ اُنھوں نے کہا خدا پر چھوڑتا ہوں اُس کو بھی اور اپنے تئیں بھی۔ بیشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید رہے امام کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو، وفادار مجاہد نے کہا "مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں یہ بھلا کہاں ممکن ہے"۔ حضرت نے فرمایا! اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیجدو اور یہ قیمتی کپڑے لو کہ ان کی قیمت سے اُس کی رہائی کا سامان کیا جائے حضرت نے پانچ کپڑے مرحمت کئے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی کیا اتنی بے نیازی اور اتنی سچی کوشش اصحاب کو اپنے سے جدا کرنے کی اتنے سخت موقع پر حسین کے سوا کوئی دوسرا شخص کر سکتا تھا؟

مسٹر سی ایس رنگا آئر (سابق ایم ایل اے سنٹرل) لکھتے ہیں "حسین کا عمل ڈیوک آف ولنگٹن کی طرف منسوب شدہ اصول سے بہت بلند تھا۔ یہ وہی ڈیوک ہے جس نے واٹرلو (Waterloo) میں نپولین کو جرمن جنرل بلوشر کی اعانت سے شکست دی تھی۔ سواروں کے ایک دستہ کو دفعتہً مقام "راس امید" (Cape of Good Hope) بھیجے جانے کے موقع پر ایک افسر نے گھر پر رہنے کی رخصت طلب کی تو ڈیوک مذکور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے جواب دیا "چلو یا اب جاؤ" (Sail or sell) حسین یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص اُن کے ساتھ اُس جگہ کا سفر اختیار کرے جہاں سے پھر کوئی واپس نہیں آتا۔ اُنھوں نے سب سے چلے جانے کے لیے کہا مگر برخلاف اُس افسر کے جس نے رخصت طلب کی تھی، بہادر اصحاب حسین کے ساتھ چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے حالانکہ اُن سے بار بار یہی کہا جا رہا تھا حسین خوب جانتے تھے کہ اُن کی جنگ کا خاتمہ اُن کی شہادت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے ایک بڑی فوج جمع کرنے کے وہ اپنے موجودہ ساتھیوں کو بھی واپس کر رہے تھے وہ مال غنیمت کے لیے جنگ نہیں کر رہے تھے جس کی کشش ہمیشہ سپاہیوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اُنھوں نے نہ حسین عورتوں کی طمع دلائی نہ شرابوں کے قرابوں کے ذریعہ سے اُنھیں مرد میدان بنایا۔ نپولین کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ اس نے کیلے (Calai) میں اپنی فوج سے کہا تھا کہ اگر انگلستان پر فتح حاصل ہو جائے تو دنیا کی بہترین عورتیں تمھارے ہاتھ آئیں گی۔ حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ دنیاوی نقطۂ نظر سے جنگ میں ہم کو فتح نصیب نہ ہوگی"۔

اب جو لوگ حسین کے ساتھ رہ گئے تھے وہ موت کو اپنے سامنے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے اس پر آمادہ تھے اس لیے کمزوری کا ان میں شائبہ نہ تھا۔

دوسری بات اس ایک رات کی مہلت میں یہ تھی کہ ع۱ " وہ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ کا دینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے رات بھر میں یزیدیوں کی جنگی اسپرٹ میں کچھ تبدیلی ہو جائے اور وہ ٹھنڈے دل سے حسین کی بات پر غور کر سکیں وہ ان جانوں کو یوں تباہ ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ رسول کے نواسے سے بڑھ کر مسلمانوں کی جانیں کیسے عزیز ہو سکتی ہیں۔ وہ ان جانوں کو بہتر سے بہتر قربانیوں کے لیے صرف کرانا چاہتے تھے"۔ چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسین کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت سے فوج عمر سعد سے الگ ہو کر حسین کی جانب آگیا اور آپ کی نصرت میں جان نثار کی۔

حقیقت میں ایک داعی حق کی بڑی کامیابی ہے اگر وہ کسی ایک انسان کو بھی گمراہی سے نکال کر ہدایت تک پہونچا دے اور یاد رکھیے کہ حسین کے حصول کی یہ ایک بڑی فتح صرف اس رات کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

ع۲ "حسین نے مع اپنے ساتھیوں کے تمام رات عبادت میں بسر کی وہ محض قادر مطلق سے مدد کے طالب تھے۔ وہ محض اس امید میں زندہ تھے کہ کل شہید ہوں گے"۔

آپ نے کل کی جنگ کے موقع کے لیے امکانی حد تک حفاظت کا سامان بھی کیا۔

اس میں تو کوئی شبہہ ہی نہیں کہ حسین اس باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر نوجوانی سے لے کر بڑھاپے تک میدان جنگ میں گزری اور حسین نے بھی آنکھیں کھول کر بڑے بڑے

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

معرکے دیکھے مگر جیسی سپہ سالاری کا موقع حسین کو درپیش تھا ویسا اس کے پہلے اسلام کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

اب جنگ کے ٹلنے کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امام کے ساتھ فقط جنگ کے سپاہی نہ تھے بلکہ عورتیں اور بچے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد انتہائی کم اور دشمن کی سپاہ حد سے زیادہ تھی۔ کوفہ میں اس عمومی اعلان کے بعد کہ جو قتل حسین کے لیے نہ جائے گا اُس کا گھر گرا دیا جائے گا اور وہ خود قتل ہو گا، کوفہ کے ہر طرح ہی کے لوگ کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔

شمر جو ایک پست فطرت اوباش انسان تھا اپنے ساتھ بہت کمینے بدمعاش کوفہ کے آدمی معرکۂ کربلا میں لے آیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ قتل و غارت کے موقع پر اس قسم کی باتوں سے نہیں چوکتے جنھیں شریف لوگ اور بڑے سپاہی اپنی شرافت اور سپاہیانہ آن بان کے خلاف سمجھ کر ہرگز اختیار نہیں کرتے۔

حضرت نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کا قیام کھلے ہوئے میدان میں دشمن کو چاروں طرف سے ہجوم کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں سراپردۂ حرم کی حفاظت آپ کی زندگی ہی میں غیر ممکن ہو جائے گی۔ یہ خیال کر کے آپ نے کربلا کی سرزمین پر تمام اطراف میں گردش کی۔ ایک خاص موقع لشکرگاہ اور حرم سرا کے لیے مناسب نظر آیا جہاں تین طرف سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا مدوّر شکل میں اس طرح آ کر ملتا تھا جس سے ہلال کی شکل پیدا ہو۔ اسی کا نام "حائر" ہے جو شخص اس دائرہ میں آ جاتا وہ تین طرف سے محفوظ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہو جاتا۔ مگر یہ پناہ وہی لے سکتا ہے جس کے پاس کافی مقدار میں آب و طعام موجود ہو۔ امام اگر شروع سے یہاں خیمہ زن ہوتے تو ساتویں سے پہلے ہی دشمن راستہ روک کر بھوک اور پیاس کے شکنجہ میں کس لیتا۔ لیکن امام کو اس کے پہلو میں جنوب کی طرف ایک طولانی سلسلہ ٹیلوں کا ملا جو اُس پہلے موقع سے زیادہ مناسب صورت رکھتا تھا اس لیے کہ جو شخص اس کے دامن میں قیام کرے

وہ شمال اور مغرب کی جانب سے چھوٹی پہاڑیوں میں محصور ہوگا اور مشرق و جنوب کی جانب وسیع میدان جنگ حرب و ضرب کے لیے موجود ملے گا۔ حضرت نے اپنے حرم سرا اور خیمہ گاہ کے لیے اس جگہہ کو منتخب فرمایا تھا اور شب عاشور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملالیں اور ہر خیمہ کی طناب کو دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرادیں کہ ان میں آگ دے دی جائے جس کے بعد اس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شب عاشور مکمل ہوئیں اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کردی گئی۔ اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیرنے اور چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

پانچواں باب

دسویں محرم ۶۱ھ

(صبح سے عصر تک)

آغاز حرب - تفصیلات - لشکروں کی نوعیت
اصحاب حسین کی شخصیت - انصار و اقربائے امام کی
بے نظیر شجاعت اور حیرت انگیز قربانیاں
حضرت امام کا جہاد اور مظلومانہ شہادت

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی - یقین کرنا چاہیئے کہ آج کربلا کے میدان میں کوئی آنکھ سوئی نہیں ہوگی اس طرف عبادت خدا اشتیاق شہادت، بی بیوں میں اضطراب، بچوں میں گھبراہٹ اور سب سے بڑھ کر پیاس کی بے چینی - دوسری طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی، تدابیر جنگ میں مشورے اور صبح کا انتظار۔

اب ع؎ رات ختم ہوئی اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا حسین نے اپنے بیٹے علی اکبر سے کہا کہ بیٹا اذان دو۔ اذان کے لیے علی اکبر سے بہتر کون ہو سکتا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ وہ آواز اور شکل میں بالکل رسولؐ کی شبیہ تھے۔ اذان کا کیا مقصد ہے؟ اگر ہم اس کی تحلیل کریں تو اس کا مقصد محض خدا کی عظمت ثابت کرنا اور اچھے کردار کے لیے دعوت دینا ہے۔ اس وقت اذان کا مقصد یہ بھی تھا کہ یزیدیوں کو یہ احساس ہو جائے کہ حسین اور اُن کے ساتھی مسلمان ہیں اور اسلام مسلمانوں

ع؎ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی ایڈوکیٹ

کے ساتھ جنگ کی مخالفت کرتا ہے حسینؑ اس طرح پھر یزیدیوں کو متنبہ کر دینا چاہتے تھے نمازِ صبح نہایت خضوع و خشوع سے ادا کی گئی جس کی نظیر تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔"

عام انسانی دل و جگر کے معیار پر خیال ہوتا ہے کہ اس وقت اصحابِ حسینؑ پر عجب ہراس کا عالم ہوگا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو دشمن کی فوج کا عظیم سمندر موجیں لیتا ہوا نظر آتا ہوگا اور اپنی ہستی اس میں حباب کی سی نظر آ رہی ہوگی مگر نہیں، ایسا نہیں تھا۔ اُن کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ اُن کے سینوں میں خوشی اور مسرت کی لہریں تھیں اور اُن کے چہروں پر فرحت و انبساط کی سُرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے ویسے آج خوش نظر آ رہے تھے جیسی پر مذاق باتیں کبھی نہ کرتے تھے ویسی آج کر رہے تھے۔

امام کربلا میں واجبات نہیں بلکہ مندوبات شرع کو بھی ادا کر رہے تھے، طرزِ عمل صاف اطمینان و سکونِ نفس کا ترجمان تھا چنانچہ نماز و تعقیبات سے فراغت کے بعد فوجِ دشمن میں تو جنگ کی آخری تیاریاں ہو رہی تھیں اور امام ایک خیمہ میں غسل و آدابِ طہارت ادا کرنے تشریف لے گئے۔ عبد الرحمٰن بن عبد ربہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی دونوں بزرگ اصحاب میں سے دروازہ پر بیٹھے۔ اس انتظار میں کہ حضرت باہر تشریف لائیں تو ہم خیمہ میں جائیں۔ حالت یہ تھی کہ دونوں آدمی دو بے تکلف دوستوں کی طرح ملے بیٹھے تھے کہ شانہ سے شانہ لڑ رہا تھا اور آپس میں لُطف آمیز جھگڑا ہو رہا تھا کہ حضرت کے باہر تشریف لانے کے بعد کون پہلے خیمہ میں داخل ہو۔ اسی میں بریر نے عبد الرحمٰن سے کچھ دل لگی کی۔ عبد الرحمٰن نے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے" بریر نے کہا خدا کی قسم میرے قوم و قبیلہ والے اس بات کو جانتے ہیں کہ میں نے جوانی اور بڑھاپے میں کبھی اس طرح کی مذاق کی باتوں کو پسند نہیں کیا مگر مجھے تو اس وقت اپنے مستقبل کی وجہ سے خوشی ہے۔ خدا کی قسم ہمارے اور حورانِ جنت کے درمیان بس اتنا فاصلہ ہے کہ یہ لوگ تلواریں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے

کہ کسی طرح یہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں۔"

بے شک یہ اپنی حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین کا نتیجہ ہے یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے۔

اتنی دیر میں مخالف فوج میدان جنگ میں آگئی اور اُس نے اپنے پرے جمائے اور لشکر کی ترتیب ہوی۔ میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی۔ میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی اور پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔ امام حسین بھی جہاد کے میدان میں آئے یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کو پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بیس تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو۔ اکثر مورخین کے بیان کے مطابق یہ تیس سوار اور چالیس پیادے سے زیادہ نہیں تھے اور دینوری اور طبری ایسے قدیم مورخین نے بھی اس کی تصریح کی ہے (تاریخ طبری ص۲۴۱ - الاخبار الطوال ص۲۵۳) مگر واقعہ کربلا کی جنگ اور مجاہدین کے ناموں کے تفصیلات اور دوسرے واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی۔ ممکن ہے کہ تاریخ میں جو تعداد درج ہے وہ اُن بہادروں کی ہو جو صبح عاشور باقاعدہ سپاہی کی حیثیت رکھتے تھے اور فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلۂ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان جہاد میں آگئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جا سکتے تھے۔ عہ "یہ سب کے سب پیدائشی بہادر تھے۔ انھوں نے بہادروں کی زندگی گزاری تھی اور بہادری کی موت مرنا چاہتے تھے۔ وہ سب کے سب بھوکے پیاسے متردد اور متفکر تھے لیکن ہر ایک اپنی جگہ کوہ ثبات تھا۔ اُن کے چہروں پر کسی پریشانی کا نشان نہ تھا۔ لہجوں میں مایوسی نہ تھی اور زبان پر حرف شکایت نہ تھا۔ اُن کے سوکھے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دکھائی دیتی۔ عزم اُن کی پیشانی سے نمایاں تھا

عہ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

اور سچائی اُن کی جبینوں سے عیاں تھی۔ اُن کی ہمت کہہ رہی تھی کہ دشمن کی فوج کا کیا ذکر اگر ضرورت ہو تو وہ تاریخ عالم کو درہم وبرہم کر دیں۔"

امام نے اپنے ہاتھ درگاہ خدا میں اٹھائے اور یہ دعا پڑھی——— موازنہ کیا جا سکتا ہے نبی خدا عیسیٰ کی آواز میں جو بائبل کی نقل کی مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی ایلی ایلی لما سبقتنی "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"، اور نبی زادہ کی دعا میں جو اس سیلاب مصیبت کے اندر اُس کے لبوں پر جاری تھی:-

"خداوندا تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبلۂ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پر مجھے ہر مہم میں جو درپیش ہو بھروسا ہے۔ کتنے صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست اُن میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن اُن میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ میں اُن کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا ہی نہیں جانتا۔ تو اُس تکلیف کو دور کرتا اور اُس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطالب کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین۔ میسرہ پر حبیب بن مظاہر اور علمدار عباس بن علی قرار دیے گئے (الاخبار الطوال ص ۲۵۳)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لشکروں کی نوعیت پر ایک مختصر لیکن ضرورت کے لحاظ سے کافی تبصرہ کر دیا جائے۔

عام طور سے حضرت امام حسین کے مقابل والی فوج کو "شامی فوج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اس اعتبار سے درست ہے کہ وہ سلطنت شام کی محکوم فوج تھی مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرزمین کربلا پر روز عاشورا اہل شام میں سے کسی ایک شخص کی بھی موجودگی ثابت نہیں ہے اور اس فوج میں کسی ایک شخص کے

متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ باعتبار اصل ونسل "شامی" تھا۔ جتنی فوج واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسین کے سامنے موجود تھی وہ تمام تر "کوفی" لوگوں کی تھی اور یہ ایک سیاست تھی جو یزید نہیں بلکہ اُس کے باپ امیر معاویہ کے دوررس دماغ کا نتیجہ تھی کہ حضرت امام حسین کے قتل کے لیے اہل کوفہ ہی سے کام نکالا جائے اور اسی لیے معاویہ نے سرجون اپنے غلام کو یہ وصیت سپرد کی تھی کہ ان کے بعد کوفہ کا گورنر عبید اللہ بن زیاد کو قرار دیا جائے اور یہ وصیت سرجون نے یزید سے اُس وقت بیان کی جب حضرت مسلم بن عقیل کے بارے میں نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نے رواداری سے کام لیا اور اس کی شکایت ہوا خواہان بنی امیہ نے کوفہ سے دمشق لکھی اور اس بنا پر یزید کو فکر ہوئی کہ وہ نعمان کو معزول کر کے کسی دوسرے "وفادار" اور "موزوں" شخص کو کوفہ کی گورنری پر مقرر کرے۔ یزید نے اپنی ناتجربہ کاری سے اس سیاست کو سمجھا ہو یا نہیں مگر امیر معاویہ نے یہ وصیت صرف اس لیے کی تھی کہ انھیں اپنی دوراندیشی سے یہ خوب اندازہ تھا کہ حضرت امام حسین کا معاملہ یزید کے لیے درپیش ہوگا اور اس موقع پر اگر کوفہ والوں کو حسین کے خلاف کوئی منظم کرسکتا ہے تو وہ صرف ابن زیاد۔ اس سیاست پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ یزید کو حسین کے مقابلہ کے لیے براہ راست دمشق سے کوئی فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ ابن زیاد نے صرف اہل کوفہ ہی کے ذریعہ سے اس مہم کو سرکردیا۔

اس سیاست کا مقصد یہ تھا کہ قتل حسین کی ذمہ داری براہ راست بنی امیہ پر عائد نہ ہو اس لیے کہ کوفہ حضرت علی کا رہ چکا تھا اور وہاں کے لوگ عام طور سے شیعہ سمجھے جاتے تھے خود عبید اللہ کا باپ زیاد ایک وقت میں شیعیان علی میں محسوب رہ چکا تھا۔ اس سے یزید نے خود بھی بعد میں یہ فائدہ اُٹھایا کہ اُس نے اپنی برأت قتل حسین سے ثابت کی اور صفائی پیش کرنا چاہی یہ کہکر کہ "خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر جو کچھ کیا وہ اُس نے کیا"، اور آج تک اُس سے ہوا خواہان بنی امیہ فائدہ اٹھارہے ہیں یہ کہکر کہ یزید نے قتل حسین کا حکم نہ دیا تھا اور یہ کہ "قاتلان حسین شیعہ ہی تھے"

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ یزید یا تو اس سیاست کو دیر میں سمجھا تھا اور یا حضرت امام حسین کی شہادت کی خبر سُن کر وہ اپنی مادی قوت پر اتنا نازاں ہو گیا تھا کہ کچھ عرصہ تک اُس نے یہ خیال کر لیا کہ اب اُسے اس احتیاطی سیاست کی ضرورت باقی نہیں ہے یعنی اُس نے خیال کر لیا کہ جب حسین قتل ہو ہی گئے تو اب دنیا کو معلوم بھی ہو جائے کہ ہم نے قتل کیا تو ہمارا اپنا یا کیا جا سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس نے اہلبیت حسین کو براہ راست کوفہ سے مدینہ بھیج دیے جانے کی ہدایت نہیں کی بلکہ دمشق میں طلب کیا اور بھرے ہوئے دربار میں مختلف طریقوں سے اہلبیت کے ساتھ عداوت اور اُن کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان ضروری سمجھا۔ یہ ایک دلدوز تاریخی باب ہے جس کا تذکرہ بعد کو آئیگا۔ مگر بعد میں اُس کو محسوس ہوا کہ "قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے" اور اس احساس مرگ سے بچنے کی "حرکت مذبوحی" تھی جو بعد میں اُس اظہار انفعال، یا اظہار برأت کی شکل میں نمایاں ہوئی جسے آج بعض بھولے بھالے مورخین یا سلطنت بنی امیہ کے خیر سگال یزید کی واقعی برات کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اگر کہیں یزید نے برابر اُس سیاست کو پیش نظر رکھا ہوتا جو اُس کے باپ کے "بے پناہ تدبر" نے سامنے رکھی تھی تو یقین رکھیے کہ واقعۂ کربلا میں حسینی مفاد بہت مشکل سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہ تو یزید کی ناتجربہ کاری تھی جس نے معاویہ کی سیاسی مصلحت کو پامال کر دیا اور حسین کو اُس آخری فتح کے حاصل کرنے کا موقع دے دیا جو بنی امیہ کے خلاف دائمی اور لازوال حیثیت رکھتی ہے۔

بہر حال یزید نے اپنے لیے صفائی پیش کرنے کا موقع باقی رکھا ہو یا نہیں مگر شیعیان کوفہ کے دامن پر اس سیاست سے یہ ایک بڑا دھبّا ہو گیا کہ انھوں نے خود ہی حضرت امام حسین کو بلایا اور خود ہی آپ کے قتل پر تیار ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوفہ بے وفائی میں ضرب المثل ہو گیا مگر یاد رکھیے کہ یہ صرف اہل کوفہ کی بدقسمتی اور سیاست بنی امیہ کی ایک شعبدہ کاری تھی۔ یہ تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کوفہ میں حضرت علی بن ابی طالب کی شہادت سے واقعۂ کربلا تک بیس برس کی

مدت میں شیعیانِ علی کے استیصال کی مسلسل کوشش کے بعد اس جماعت کی کوئی اکثریت اور قابل لحاظ طاقت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ نہ جنابِ مسلم کی بیعت کرنے والے ۱۸ ہزار آدمی سب ہی "شیعیانِ علی" کہے جا سکتے تھے "شیعہ" بہت محدود تعداد میں تھے اور خاص خاص لوگ تھے جنھوں نے حضرت امام حسین کو خطوط لکھے تھے اور جنھوں نے کوفہ کی رائے عام کو آپ کے موافق بنانے کی کوشش کی تھی اور جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے اگر ابن زیاد کی اچانک حکومت صورت حال میں یکایک انقلاب پیدا نہ کرتی — پھر بھی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُن خطوط لکھنے والوں میں سے جو جماعت شیعہ کے نام سے گئے ہیں ایک شخص کی بھی موجودگی واقعۂ کربلا میں امام حسین کے مقابلہ میں پائی نہیں جاتی بلکہ اُن میں سے حبیب بن مظاہر نے کربلا میں امام حسین کے قدموں پر جانبازی کے ساتھ دم توڑ کر ہمیشہ کے لیے سرخروئی حاصل کی اور اُن اشخاص میں سے جو خطوط کے لے جانے والے تھے سعید بن عبد اللہ حنفی نے بے نظیر طریقہ پر جاں نثاری جس کی تفصیل بعد کو آئے گی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن کدن ارحبی بھی شہید ہوئے اور قیس بن مسہر صیداوی نے اپنی زندگی کے آخری نفس تک جس سچائی اور استقلال کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کیا اُس کا تذکرہ صفحۂ تاریخ پر زریں حرفوں میں ہمیشہ ثبت رہے گا۔ بے شک ایک خط جو سب سے آخر میں کسی سازش کے ماتحت یا رائے عامہ سے مرعوب ہو کر کوفہ کے روسائے قبائل میں سے سات آدمیوں کے دستخط سے گیا تھا اُن کے متعلق پہلے سے یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ مخالفین اہلبیت میں سے ہیں اور اسی لیے شیعیانِ کوفہ کی اجتماعی کارروائیوں میں اُنھیں نہیں شریک کیا گیا تھا۔ یہ لوگ ایسے تھے جو واقعۂ کربلا میں شریک بھی ہوئے۔

ابن زیاد کی ہنگامی حکومت اور جنابِ مسلم و ہانی کی دردناک شہادت کے بعد ظاہر ہے کہ ہر اُس شخص کے لیے جس نے حضرت امام حسین کو خط لکھا ہو کوفہ کی زمین تنگ ہو گئی تھی اس لیے کچھ لوگ چھپ گئے۔ کچھ کوفہ سے مختلف اطراف میں نکل گئے اور جو بچ گئے اُنھیں ابن زیاد نے تلاش کر کر کے قید کر لیا چنانچہ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی

جو جناب مسلم کے خروج کے موقع پر کوفہ میں موجود نہ تھے اور اُسی دن اطلاع پاکر آئے لیکن ایسے وقت پہونچے کہ مسلم کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور عمرو بن حریث نے رایت امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے اُس کا جان و مال محفوظ رہیگا مختار اس رایت کے نیچے آ گئے مگر اُن کو امان نہ مل سکی اور وہ پا بزنجیر کر دیے گئے۔ اسی طرح عبد اللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔ اس سیاست کی نوعیت کا اندازہ ابن زیاد کی اُس تقریر میں جو یزید کی ہلاکت کے موقع پر اُس نے کی ہے اس فقرہ سے ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان بھی ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے (طبری ج ۷، ص ۱۸) نیز اُس موقع پر جبکہ ہلاکت یزید کے بعد ابن زیاد بصرہ سے فرار ہو کر دمشق جا رہا تھا تو راستے میں لیساف بن شریح یشکری سے اُس نے ایک گفتگو کے دوران میں کہا کہ میں ابھی اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش میں نے ان لوگوں کو جو قید خانہ میں بند تھے نکال کر گردن مارنے کا حکم دے دیا ہوتا (طبری ج ۷، ص ۲۰)

یہ بھی آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ناکہ بندی ہوئی تھی ایسی سخت کہ نہ کوئی باہر سے کوفہ کے حدود میں آ سکتا تھا نہ کوئی کوفہ کے حدود سے باہر نکل سکتا تھا اس طرح ایک تو حضرت امام حسین کے نقل و حرکت کی اطلاع ہی کوفہ کے عام لوگوں تک پہونچنا دشوار بلکہ غیر ممکن تھی۔ آپ کے قاصد قیس بن مسہر صیداوی اور عبد اللہ بن یقطر جو آپ کی روانگی کی اطلاع لے کر جا رہے تھے وہ تو خود ہی ابن زیاد کے سپاہیوں کے ہاتھ میں قید ہو گئے تھے اور قتل کر دیے گئے تھے پھر عوام تک اطلاع پہونچتی تو کیسے اور اگر کوئی کسی اتفاقی طریقہ سے اطلاع پاکر جانا بھی چاہتا تو وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ غیر معروف راستے سے امام حسین کے پاس پہونچنے کی کوشش کرے۔ اُس میں بھی گرفتار ہونے کا اندیشہ برابر تھا۔ یہاں تک کہ طرماح بن عدی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ غیر معروف راستے سے آکر امام حسین سے ملحق ہوے تو حُر نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ لوگ جو اہل کوفہ

میں سے ہیں آپ کے ساتھ مکہ سے نہیں آئے ہیں لہٰذا میں ان کو گرفتار کرتا ہوں یا کوفہ واپس جانے پر مجبور۔ لیکن حضرت کے اس فرمانے پر کہ اب جبکہ میرے پاس پہونچ گئے تو میرے ہی اصحاب و انصار میں داخل ہیں اور اب ان کی حفاظت مجھ پر فرض ہے لہٰذا ناممکن ہے کہ میں ان کو تمھارے سپرد کردوں۔ اُس کو ساکت ہونا پڑا (طبری ج ۶ ص ۲۳۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک حبیب بن مظاہر، مُسلم بن عوسجہ، بریر ہمدانی ابوثمامہ صیدادی وغیرہ تمام ممتاز انصار حسین جو اہل کوفہ میں سے تھے امام سے آکر ملحق نہیں ہوئے تھے حالانکہ یہ کربلا پہونچنے سے دو ہی ایک دن قبل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اُس موقع پر جب امام حسین کربلا پہونچ چکے تھے تو آپ سُن چکے ہیں کہ خود ابن زیاد نے کوفہ سے نکل کر نخیلہ میں اپنا مرکز قرار دے لیا تھا اور وہیں افواج کا معائنہ ہوتا تھا اور انھیں ترتیب دے کر کربلا روانہ کیا جاتا تھا۔

اس صورت میں بالکل ظاہر ہے کہ کوفہ کی جماعت شیعہ میں جو حسین کے ہمدرد ہو سکتے تھے اور جن کو نصرت کا خیال ہو سکتا تھا اُن میں سے ایک کثیر تعداد پابزنجیر کرلی گئی تھی۔ اس کے علاوہ حدود کی ناکہ بندی نے کوفہ کے رہے سہے اشخاص کے لیے جن میں جذبۂ نصرت حسین ہو سکتا تھا آپ تک پہونچنا غیر ممکن بنادیا تھا اور اگر وہ آنے کا قصد کرتے تو یقیناً نخیلہ میں کہ جو بالکل کوفہ کے نکڑ پر کربلا کے راستے میں تھا گرفتار کرلیے جاتے یا آگے بڑھ کر قادسیہ اور خفان اور قطقطانہ و لعلع کے منازل میں سے کسی میں دستگیر ہو جاتے۔

اس کے بعد کیا شیعیان کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ نہیں ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ افراد جو حسینی دعوت کے بانی و مبلغ اور اس تحریک کے داعی و مروّج تھے، جنھوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے اُن کے ورود کے موقع پر پہلے ہی جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسین بن علی تک پہونچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کردیں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسین بن علی کی نصرت

کے لیے نہ پہونچے یا نہ پہونچ سکے ان میں سے کسی متنفس کا حسین کے مقابلہ میں کربلا کے میدان میں موجود ہونا پایا نہیں جاتا۔

یہ دنیا کی ناانصافی اور عیب جوئی کی عادت ہے کہ اس نے امام حسین کے مقابل والی فوج کو تو دیکھا کہ وہ اہل کوفہ ہیں اس لیے کوفہ کو ہمیشہ کے لیے روسیاہی کا تمغہ دے دیا لیکن حسین کا ساتھ دینے والوں کو نہ دیکھا کہ ان میں کتنے اہل کوفہ ہیں اور وہ کتنے مشکلات کے ہفتخوانوں کو طے کرکے پہونچے ہیں اور کیسے سخت موقع پر انھوں نے حسین کا ساتھ دیا ہے۔ اگر دنیا اس پر نظر ڈالتی تو اسے ماننا پڑتا کہ اہل کوفہ نے جن سخت مشکل راستوں سے گزر کر اور سخت ماحول میں رہ کر ثبات قدم دکھلایا ہے اس کی نظیر صفحہ تاریخ پر نہیں مل سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ کوفہ کو خراج تحسین پیش کرتی نہ یہ کہ طوق ملامت میں گرفتار کرتی۔

اس معاملہ میں اہل کوفہ کی مثال بالکل "مسلمان جماعت" کی سی ہے۔ ایک مخالف اسلام شخص کو یہ موقع حاصل ہے کہ واقعۂ کربلا کو ملت اسلامیہ کے بدترین معائب میں شمار کرے اس لیے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اپنے نبی کی اولاد کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو جیسا مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی وفات کے صرف پچاس برس بعد اس کے نواسے کے ساتھ سلوک کیا۔ مگر ایک منصف مزاج انسان کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ واقعۂ کربلا کو ملت اسلامیہ کے بہترین کارناموں میں شمار کرے اس لیے کہ کسی مذہب کے ماننے والوں نے اس مذہب کی حفاظت کے لیے ایسی منظم اور بے مثال قربانی نہیں پیش کی جیسی حسین اور ان کے ساتھ والوں نے اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے پیش کی۔ جس طرح ایک شخص کا اسلام کے مقابلہ میں صرف تاریک پہلو کو پیش کرنا ایک بڑا ظلم سمجھا جائے گا اسی طرح کوفہ کے بارے میں صرف تصویر کے سیاہ رخ کو سامنے رکھنا ایک بدترین ناانصافی ہے بلکہ اس کا روشن پہلو بھی سامنے رکھنا تاریخ کی منصفانہ نگاہ کا فرض ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جسے کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا اس وقت جب ابوالعباس سفاح

کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عیاش میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا ہے اور ابن عیاش نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتے ہوئے کہا کہ کوفہ کی بہادری کا کیا کہنا کہ اُن میں جتنے بھی تھے وہ یا حسین اور اُن کے اہلبیت کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا اُن کا مال و اسباب لوٹنے والے یا اُن کی لاشوں کو پامال کرنے والے۔ یہ سُنکر ابن عیاش نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنے دینے پر اُتر آئے۔ تم نے امام حسین کے والد بزرگوار حضرت علی ابن ابیطالب کو قتل کیا (ابن ملجم بصرہ کا رہنے والا تھا) رہ گئے اہل کوفہ۔ اُن میں سے حضرت امام حسین کے ساتھ روز شہادت چالیس آدمی تھے اور مجموعاً آپ کے سپاہیوں کی تعداد ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام حسین پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو بھی قتل کیا۔ (کتاب البلدان ابن فقیہ مطبوعہ لیدن ص ۱۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف وجوانب کے قبائل جن کا مذہب صرف اطاعت شیوخ ہے اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتل حسین میں صرف حکم حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ڈیوٹی کا انجام دینا اور جائزۂ و انعام کی ہوس تھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسین سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضامند نہ تھے مگر اُن میں اتنی قوت ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ بہت سے ایسے بھی جوان اور نوعمر تھے جو حسین کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ تھے اور وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسین کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ وہاں کی خلقت کے دل و دماغ تھے وہ تھے جو دنیا کے تمام محرکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں

ے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور اُن کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور اُن کے لیے یہ عجیب معمہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد وزاہد اور پرہیز گار لوگ آج کس طرح میدان جنگ میں آگئے ہیں۔ ان شخصیتوں کا فوج مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ اُن کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ آپ کو واقعۂ کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کی زبان سے یہ سننے کا موقع ملتا ہے کہ فوج مخالف نے حسینی سپاہیوں کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقتہً یہ فرار صرف مادّی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل ہے۔

حقیقت میں یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کے لیے آخر آخر وقت تک فوج کی اکثریت سر انداختہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ وانعام وغیرہ کے ترغیبات اور عتاب حکومت کے تازیانے ہی تھے جو رُکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط ونظام ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا، نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے کا سوال۔ اُن کا کوئی اقدام جوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جب وقت تک امام اتمام حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں اُس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خود رائی یا خود سری سے کام لے۔ چنانچہ اُس وقت جب طرفین میں فوجی ترتیب ہو چکی اور صفیں بندھ گئیں، دشمن کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات کیے گئے مگر حسینی سپاہیوں میں سے ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جو بے قابو ہو کر ایسا طرز عمل اختیار کرتی کہ آغاز جنگ کی ذمہ داری امام حسین پر عائد ہو سکے۔

آپ سُن چکے ہیں کہ امام نے پشت خیام پر خندق کھدوادی تھی اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی۔ فوج کی ترتیب کے بعد اپنی اُس غیر معمولی اکثریت کے باوجود دشمن کو کمینگاہوں اور حملہ کے بہترین موقعوں کی فکر تھی اسی خیال کے ماتحت سہی

کہ اپنے لشکر کا کچھ نقصان ہوئے بغیر ہی ان مٹھی بھر لوگوں کا خاتمہ کر دیا جائے، اس لیے فوج کے لوگ پشت خیام پر بھی جاتے تھے کہ اُس طرف سے حملہ کا موقع ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک سوار سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق جو اُس طرف سے گزرا اور خیموں کے اوپر نظر ڈالی اور چاروں طرف آگ شعلہ ور نظر آئی تو اُس نے پکار کر امام کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم نے قیامت کے دن کے پہلے ہی اپنے لیے دنیا میں آگ کا سامان کر لیا" یہ بڑا سخت حملہ تھا۔ حضرت نے اصحاب سے فرمایا یہ کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے شمر بن ذی الجوشن ہے۔ اصحاب نے عرض کیا ہاں فرزند رسول یہ وہی ہے۔ حضرت نے فرمایا "جہنم کی آگ میں جلنے کا تو زیادہ مستحق ہے" مسلم بن عوسجہ نے کہا "میری جان آپ پر فدا اجازت ہوتی ہے کہ ایک تیر اس کو مار دوں کیونکہ یہ اس وقت بالکل زد پر ہے تیر خطا نہیں کر سکتا اور آدمی بڑا فاسق و فاجر ہے" حضرت نے فرمایا "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔"

ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ سپاہیوں میں سے ہر ہر فرد کا ایسے جوش کے موقعوں پر اتنا ذمہ داری کا احساس کرنا بہت دشوار ہے مگر یہ واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تیر جو مسلم بن عوسجہ یا کوئی اور اس وقت چلا دیتا وہی بنائے جنگ بن کر واقعۂ کربلا کی نوعیت کو بالکل تبدیل کر سکتا تھا۔ جیسا کہ جنگ جمل کے بارے میں بعض مورخین یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ جناب امیر کی فوج کے بعض غیر ذمہ دار لوگوں نے خود سے یورش کر کے اس جنگ کو ایسے غیر شعوری طور پر چھیڑ دیا کہ کوئی ایک فریق بھی اُس کا ذمہ دار باقی نہ رہا۔ حضرت امام حسین کی پوری کوشش یہی تھی کہ ایسے کسی پہلو کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہو کہ فوج مخالف اپنے تشدد میں حق بجانب ثابت ہو یا اُس کا تشدد وقت کی مجبوری کا نتیجہ سمجھا جا سکے۔ اس بارے میں حسین کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی اس میں آپ کے سپاہیوں کے بے مثال ضبط و نظام کو بڑا دخل حاصل ہے۔

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حسینؑ کا مقصد کربلا کی جنگ سے کیا تھا؟ یہ کہ اپنے دشمن کے نمائشی مذہب کی حقیقت کو ظاہر کر کے اُس کے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرا دیں کہ اُس کو اسلام سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے۔ اس کے لیے آپ نے مصالحت کی گفتگوئیں کیں۔ ملکِ عرب کو چھوڑنے اور دربدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اسبابِ اشتعال پیدا ہونے کے بعد بھی اپنے ساتھیوں کو اقدامِ جنگ سے روکا اور تمام لڑائی کی تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی۔ دوسرے آپ کے خلاف دشمنوں کے طرزِ عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی کے عمل کی اُس کی بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدودِ مملکت میں یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ پیغمبر نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم اُن کے وارثِ جائز ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ آپ اپنے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو تمام مجمع کے سامنے اس طرح واضح کر دیں کہ کسی ایک فرد کی بھی ناواقفیت کا شبہہ نہ رہ جائے۔ نیز آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اُس کے جرم کی اہمیت کو ہر ایک پر بالکل روشن کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ دشمن کے پاس اپنے گناہ کا کوئی عذر باقی نہ رہے اور دوسروں کو بھی اُن کی نسبت کسی "حسنِ ظن" یا "حمل بر صحت" کا راستہ نہ ملے۔ امام حسینؑ دیکھ چکے تھے کہ اُن کے پہلے اُن کے والد بزرگوار کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو "خطائے اجتہادی" کا پردہ ڈال کر قابلِ معافی سمجھ لیا گیا۔ حسینؑ کے خلاف تلوار اُٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح طبقہ یا ہوا خواہانِ بنی امیہ اُس سے فائدہ اُٹھانے سے چوک سکتے تھوڑے ہی اور اس سے حسینؑ کا مقصد پامال ہو جاتا۔ اس کے لیے حسینؑ نے وہ سب کچھ کیا جسے "اتمامِ حجت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے "اصرارِ گناہ" یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

فوجوں کی ترتیب ہو جانے کے بعد معلوم نہیں حملہ میں انتظار کس بات کا تھا؟ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی صف بندی کے بعد دونوں طرف کے لشکر کافی وقت گزرنے تک بالکل خاموش کھڑے رہے۔ معلوم ہوتا ہے دشمن اس کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینی فوج کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے مگر ایسا نہیں ہوا اس کے برخلاف امام نے یہ چاہا کہ اتمام حجت کر دیں۔ سب سے پہلے آپ نے ایک ناقہ طلب فرمایا۔ معلوم ہے کہ میدان جنگ کی سواری ہے گھوڑا۔ امام ناقہ پر بیٹھ کر گویا عملاً اظہار کر رہے تھے اس بات کا کہ ہم از خود لڑنا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ اس طرح آپ بلند بھی ہو گئے جس سے آپ کی تقریر مخالف مجمع میں دور تک سُنی جا سکتی اور آپ کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ قرآن منگوایا اور اُسے اپنے سامنے رکھا پھر صفوف دشمن کے سامنے آئے۔ بلند آواز سے جو فوج کے اکثر حصہ تک پہونچ سکتی تھی ارشاد فرمایا "صاحبو! میری بات سنو! جلدی سے کام نہ لو یہاں تک کہ میں جیسا کہ میرے ذمہ تمہارا حق ہے تم کو نصیحت کا فرض ادا کر دوں اور تمہارے سامنے اپنا عذر پیش کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کر لیا اور میری بات کو سچا سمجھا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی اور تمھیں معلوم ہوگا کہ تمھیں میری مخالفت کا کوئی رستا نہیں ہے اور اگر تم نے میرے عذر کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے جمع کر لو اپنے مجمع کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں کو اور کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے میرا خاتمہ کر دو اور مجھے ایک دم کی بھی مہلت نہ دو۔ میرا مددگار بس خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اچھے اعمال والوں کا بس مددگار ہے۔" آواز حضرت کی خیمہ میں پہونچی تو اہلحرم سے گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے جناب عباس و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا جب آواز گریہ کی موقوف ہو گئی تو حضرت نے حمد الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف اُس کی ذات اقدس کے لحاظ سے ذکر فرمائے پھر حضرت رسالتمآب پر درود بھیجا اور حضرت کے اوصاف و فضائل

کو تھوڑی دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت کے پہلے اور آپ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو۔ حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا " ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو۔ دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو۔ غور تو کرو کہ تمھارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں نہیں ہوں تمھارے نبی کا نواسا اور اُن کے وصی، اُن کے چچازاد بھائی اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہ سید الشہدا میرے ہی باپ کے چچا نہیں تھے اور کیا جعفر طیار میرے ہی چچا نہیں تھے۔ کیا یہ حدیث تمھارے گوش زد نہیں ہوی جو زبان زد خلائق ہے کہ حضرت رسولخدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانان اہل جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ میں جب سے سن تمیز کو پہونچا کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دینگے۔ پوچھ لو جابر بن عبد اللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے، وہ تمھیں بتلائینگے کہ اُنھوں نے رسالتمآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ شمر نے کلام قطع کیا اور بول اٹھا کہ میں خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو (قرآن میں منافقین کی نسبت ہے ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف۔ اُس کا مقصود تھا کہ میں مسلمان نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں)

اصحاب امام خاموش کھڑے ہوے امام کی تقریر سُن رہے تھے۔ اُنھیں شمر کی یہ بدتمیزی اور امام کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوی۔ حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا " بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستّر حرفوں پر کرتا ہے (یعنی

انتہائی مکار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے - ایک بات پر قائم نہیں رہتا) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں - خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے" امام نے پھر سلسلۂ تقریر جاری کیا فرمایا "اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسول کا نواسا ہوں - خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں، کوئی نبی کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے نبی کا نواسا ہوں - ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر کیوں آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا بدلا لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کیا ہے - یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہے؟ یا کسی زخم کا قصاص چاہتے ہو؟ ایک خاموشی سی چھائی رہی اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا - دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف اور ہزاروں نہیں دوسری طرف - بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حُسنِ عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو حسین اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے - تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے - ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس ۳۰ ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا - ع۵ "یزیدیوں کو موقع تھا کہ وہ حسین سے کہتے کہ تم نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے اور اس وجہ سے اسلام میں تمھارا وجود مثل ناسور کے ہے وہ اُن الزامات کو جو حسین کے خلاف تھے ایک ایک کر کے اس وقت پیش کرتے لیکن یزیدیوں میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ وہ حسین ایسے معصوم و بے خطا کو کسی الزام سے متہم کرتے اور اُن کے قول میں سچائی کہاں ہو سکتی تھی - اس وجہ سے حسین کے سوال کرنے پر وہ سب کے سب بُت بنے سنتے رہے اور کوئی الزام پیش نہ کر سکے" کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو دہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک

ع۵ سید امتیاز حسین صاحب ترمذی

یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو چیلنج دے رہا تھا اور کسی کو اُس کے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔ اس کے بعد حضرت خصوصی حیثیت سے مخاطب ہوئے اُن افسرانِ فوج کی طرف جنھوں نے کوفہ سے آپ کو آخر میں ایک دعوت نامہ بھیجا تھا۔ حُر سے گفتگو میں یہ صورت پیش آ چکی تھی کہ جب اجتماعی طور سے اہلِ کوفہ کی طرف نسبت دے کر کہا گیا کہ تم نے خطوط لکھے تو حُر نے کہہ دیا کہ میں تو خطوط لکھنے والوں میں نہیں تھا۔ اس لیے اس موقع پر حضرت نے نام بنام اُن لوگوں کو پکارا جنھوں نے خط بھیجا تھا اور یہ لوگ کوئی معمولی درجہ کے سپاہی نہ تھے کہ اُن کے پکارنے کا کوئی حاصل نہ ہو بلکہ اُن میں سے ہر ایک کم از کم ہزار پانچ سو آدمیوں کا سردار تھا۔ آپ نے فرمایا اے شبث بن ربعی۔ اے حجار بن ابجر۔ اے قیس بن اشعث۔ اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں، لشکر آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ آئیے اور جلد آئیے!" اب معاملہ ان اشخاص کے لیے نازک تھا۔ چار آدمیوں کا نام لے کر یہ انکشاف کیا جا رہا تھا کہ اُنھوں نے خط لکھا۔ گویا اس بڑے مجمع کے سامنے اور یزیدی فوج کے افسر کے سامنے ان لوگوں کی سازش اور منافقت اور اپنی حکومت سے ایک طرح کی بغاوت کا ثبوت مل رہا تھا کیونکہ وہ کوفہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے۔ اُنھوں نے تو وہ خط جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے ہوا کے رُخ کو دیکھ کر لکھا تھا اس خیال سے کہ حسین کے نام اتنے کثرت سے خطوط جا رہے ہیں اور بلایا جا رہا ہے۔ اگر کہیں حسین آ گئے اور فضا اُن کے موافق رہی تو ہمارے لیے بھی جگہ باقی رہنا چاہیے اس لیے اُنھوں نے یہ خط بھیجا تھا مگر اس وقت اتنے گواہوں کے سامنے اُن کی سازش منکشف ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور سلطنت بنی امیہ کی جانب سے راندۂ بارگاہ قرار پا جائیں اس لیے بربنائے ضرورت اُن کو یہاں پر بولنا ناگزیر تھا۔ مگر بولنا کیسا؟ بے غیرتی کے ساتھ۔ وہ بولنا جس میں خود چہرہ کی ہوائیاں، آواز کی تھرّاہٹ